بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

برقِ طور

مضمون	صفحہ
فہرست	ا
پیش آہنگ	ض
حضرت موسیٰؑ — داستانِ بنی اسرائیل — صفحہ ۲ تا صفحہ ۲۳۸	
فسادِ آدمیت کے تین گوشے	۲
استبدادِ حکومت، برہمنیت اور سرمایہ داری	
یہ تین شکنجے اور قومِ بنی اسرائیل	
بنی اسرائیل اور یہودی	۳
حضرت موسیٰؑ کا زمانہ اور اس زمانہ کا فرعون	۴
فرعون کا خطرہ	۵
بنی اسرائیل کی مظلومیت	
قتلِ ابناء کا حکم	۶
حضرت موسیٰؑ کی پیدائش	۷
موجوں کے تلاطم سے محلاتِ شاہی میں	۹
اور وہاں بچہ پھر اپنی ماں کی گود میں	۱۰
محلات میں پرورش	۱۱
ایک نیا واقعہ۔ قبطی کا قتل	″
اسرائیلی کی حمایت کیوں تھی؟	۱۲
دوسرے دن ایک اور واقعہ	۱۳

مضمون	صفحہ
قتلِ حضرت موسیٰؑ کی سازش. مصر سے ہجرت	۱۴
مدین کی طرف	۱۵
راستہ میں پیاؤ کا واقعہ	"
فطرت کی فیاضیاں اور انسانی تصرفات	۱۷
(کیا ان چیزوں پر انفرادی قبضہ جائز ہے ؟)	..
(ایک ضمنی گوشہ)	..
تربیتِ صحرائی و شبانی. کلیمی کے ابتدائی مراحل	۱۹
تجلی گاہِ طور	۲۰
سب سے پہلی وحی. اللہ کے سوا کسی کی	۲۱
محکومیت جائز نہیں۔	
قیامِ حکومتِ خداوندی کی بنیاد	۲۲
(قوموں کی شکست و کامرانی کا بنیادی راز)	
عصائے کلیمی اور یدِ بیضا	۲۳
عصائے کلیمی اور یدِ بیضا کا دوسرا مفہوم	۲۴
فرعون کی طرف ماموریت	۲۶
اس مہم عظیم کے لئے استعانت کی دعائیں	..
زبان کی گرہ کشائی	..
تسبیح و ذکر کا صحیح مفہوم (ایک ضمنی گوشہ)	۲۷
ایک نبی کو خاص اندازوں کے مطابق تیار کیا جاتا ہے	۲۸
عبادت کا مفہوم. قیامِ حکومتِ الٰہیہ.	۲۹
دعوتِ انقلاب کے دو مقام. جمال و جلال	۳۰
مزید ہدایات	"

مضمون	صفحہ
مزید بکھرے ہوئے موتی	۳۱
طور سے واپسی	۳۷
دربارِ فرعون میں	"
بنیادی مطالبہ. بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دو	۳۸
فرعون کا استفسار. تمہارا رب کون ہے جس کی	"
طرف تم مجھے دعوت دیتے ہو.	"
حضرت موسیٰؑ کا جواب۔	۳۹
حقیقت کی ایک دنیا چار الفاظ میں	
فرعون نے راہ کترا کر ایک اور سوال کیا	"
وہ سوال جو دنیائے مذہب میں تحزب و	۴۰
اختلاف کی بنیاد ہے، یعنی اسلاف کے بارے	"
میں کیا کہتے ہو؟	"
ایک اور بصیرت افروز جواب. ان کا معاملہ خدا کے	"
ساتھ ہے!	"
اس جواب میں آج ہمارے لئے سامانِ	۴۱
صد بصیرت ہے۔	"
فرعون کا دعویٰ ربوبیت اور اس کا بطلان	۴۲
فرعون کی دھمکی. اگر باز نہ آئے تو جیل خانے بھجوا دوں گا.	۴۴
سیاستِ فرعونی اور حکمتِ کلیمی کا فرق	"
تاریخ اسی سلسلۂ صید و صیاد کی داستانِ	"
خونچکاں ہے.	
مستبد قوم اپنے جذبۂ حکومت کی تسکین	۴۵

مضمون	صفحہ
کے لئے کمزور قوم کو ہمیشہ محکوم رکھنا چاہتی	..
ہے کہیں جاننے بھی دینا نہیں چاہتی۔	..
اس غرض کے لئے مختلف حیلے اور حربے	..
استعمال کئے جاتے ہیں۔	..
دسیسہ کاریاں اور گروہ سازیاں	//
ہمیشہ اور ہر جگہ	..
مطالبات کی مخالفت	۴۶
لیکن مشیت کو منظور تھا کہ کمزوروں پر احسان کیا جائے	//
احسانِ خداوندی کا صحیح مفہوم، سطوت و حکومت	۴۷
دعوتِ موسوی کے جواب میں فرعون کی طرف سے	//
نشانات طلبی	//
لیکن اس کے بعد بھی انکار و سرکشی	۴۸
اور اسلاف کی اندھی تقلید۔	۴۹
صداقت کی تکذیب	۵۰
ایک عجیب اعتراض، یعنی کیا اپنے جیسے انسانوں پر	۵۱
ایمان لے آئیں؟	//
اور اس سے بھی عجیب تر۔ کیا اپنی محکوم قوم	..
کے افراد کو ایسا بلند سمجھ لیں اور	..
ان کی بات مان لیں؟	..
سچ ہے محکوم کی بصیرت پر کون بھروسہ	۵۱
کر سکتا ہے؟	..
نہ اُس وقت نہ آج	۵۲

مضمون	صفحہ
یہ ایک آئینہ ہے جس میں ہم آج اپنے	..
خط و خال دیکھ رہے ہیں۔	..
فرعون نے اب حضرت موسیٰؑ پر اپنے خاندان کے احسان	۵۳
جتانے شروع کئے۔	..
اس کا جواب؟ حقیقت و بصیرت کا ایک	۵۴
درخشندہ جواہر پارہ!	..
یہی احسان ہے نا کہ پوری کی پوری قوم کو غلامی	..
کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے؟	..
قوم فرعون دل سے حضرت موسیٰؑ کی صداقت کی قائل	۵۶
ہو چکی تھی لیکن حکومت و قوت کا نشہ اعترافِ	..
حقیقت سے مانع تھا۔	..
اس نشہ میں بدمست، دعوتِ موسوی سے استہزا	..
کرنے لگے۔	..
فرعون کے اعلانات اور منادی کہ کوئی حضرت موسیٰؑ	۵۸
کی بات نہ مانے۔	..
لیکن دبدبۂ کلیمی کا رعشہ انگیز اثر	۶۰
فرعون کی نئی تدبیر ۔۔ ساحرین سے مقابلہ	//
مقابلہ کا میدان، جشن کا روز، لوگوں کا ہجوم	۶۱
مقابلہ	۶۳
ساحرین نے ابتدا کی اور باطل کی	..
نظر فریب "رسیوں" کا	..
جال بچھایا۔	..

مضمون	صفحہ
اب عصائے موسوی آیا۔ اور وہ دیکھو وہ اس سارے	..
فریب کو نگل گیا۔	..
ساحرین کی آنکھوں نے حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا	۶۴
دیکھا اور سجدہ میں جُھک گئے!	..
وہ سجدہ جس سے زمین و آسمان وجد میں آجائیں	..
یہ دیکھ فرعون کی شعلہ باری۔	۶۵
اس کے مقابلہ میں ساحرین کا کوہ تمثال ایمان	۶۷
اور اس قندیلِ ایمانی کی نور افشانیاں!	۶۸
اور ہمارا ایمان!	۶۹
دوسرا مرحلہ خود بنی اسرائیل کی تنظیم و تربیت اور	..
اصلاح و تہذیب تھا۔	..
غلاموں کی ذہنیت	۷۰
بنی اسرائیل ایک مدت کی غلامی سے	..
ہمتیں ہار چکے تھے۔	..
ان میں عزم و استقلال باقی نہیں رہا تھا	
البتہ نوجوانوں کے طبقہ نے اس دعوت پر	۷۱
لبیک کہا۔	..
انقلابی تحریک بتدریج آگے بڑھا کرتی ہے	۷۲
تدریج سے مفہوم آگے بڑھنا ہے رُک جانا نہیں۔	..
اس انقلاب کی ابتدا، اقامتِ صلوٰۃ سے ہوتی ہے	۷۳
لیکن مستبد حکومت اس قسم کے انقلاب کو کب	..
روا رکھ سکتی ہے۔	..

مضمون	صفحہ
اربابِ حکومتِ فرعونی کے خدشات اور مشورے	۷۴
دربارِ فرعون کا مردِ مومن اور اس کی جرأت آفریں تقریر	۷۶
تکذیب کی وجہ سے قومِ فرعون پر ہلکے ہلکے عذاب	..
لیکن ان کی عجیب حالت	..
اور یہی حالت آج بھی ہے	..
لیکن انہوں نے اللہ کے قانونِ مہلت سے فائدہ نہ	۷۸
اٹھایا اور بربادی کے جہنم کی طرف بڑھتے چلے گئے۔	..
اتمامِ حجت کے بعد مصر سے ہجرت	..
ہجرت کیا ہے؟ ظلمت سے نور کی طرف آجانا۔	۷۹
ظلمت اور نور کا قرآنی مفہوم! غلامی سے آزادی	۸۰
کی طرف	..
درود کا مفہوم۔ ایک اہم ضمنی گوشہ	۸۱
لیکن فرعون نے بنی اسرائیل کا پیچھا کرنے کی ٹھان لی۔	۸۲
اسے کیا معلوم تھا کہ یہ اپنے پاؤں اپنی قبر کی	..
طرف جانا ہے۔	..
بنی اسرائیل اور فرعون کے لشکر سمندر کے درمیان گھر گئے	۸۳
اس سے وہ ہراساں ہوئے۔	..
لیکن حضرت موسیٰؑ کے عزم و استقلال میں	..
ذرا فرق نہ آیا۔	..
فرعون اور اس کے لشکر کی غرقابی	۸۴
ڈوبتے وقت فرعون کا اظہارِ ایمان	۸۵
لیکن یہ ایمان کیا تھا؟ ضعفِ خودی کا مظاہرہ!	..

مضمون	صفحہ
لہٰذا اس کی قیمت کچھ نہ تھی۔ ایمان ساحرین	۸۶
کا تھا۔	..
فرعون کی لاش۔ تاریخ واثریات کا ایک اہم انکشاف	۸۷
ایک شبہ اور اس کا ازالہ، یعنی بنی اسرائیل کے لئے	۸۸
سمندر نے راستہ کیسے دیدیا؟	..
باب دوم	
داستانِ بنی اسرائیل کا نیا ورق۔ لا کے مرحلہ	۹۲
کے بعد اِلّا۔	"
یہ مرحلہ بڑا جانگداز تھا، اس لئے کہ قوم میں خوئے غلامی	..
پختہ ہوچکی تھی۔	..
غلامی کی لعنت اور نحوست کے نتائج	..
ہر مقام پر بگڑ بیٹھتے تھے کہ ہمیں کس مصیبت	۹۳
میں لے آئے؟	-
تورات کا بیان	۹۴
"ہم غلام ہی اچھے تھے۔"	..
اس قوم پر انعاماتِ خداوندی کی بارش	۹۶
خوئے غلامی کی پختگی	۹۷
ایک قوم کو بت پوجتے دیکھا تو مچل کر بیٹھ گئے	..
کہ ہمیں بھی ایسا ہی خدا بنوادو!	..
گوسالۂ سامری۔ عبرت وموعظت کی ایک	۹۸
حسرت بھری داستان	..

مضمون	صفحہ
تفرقہ۔ گوسالہ پرستی ـــ بڑا شرک	۱۰۲
اس کے متعلق تورات کا بیان	۱۰۳
قرآن اور تورات کے بیانات میں فرق	..
بنی اسرائیل کی ایک اور فرمائش۔ شہری دسترخوان کے	۱۰۴
چٹپٹے کھانے چاہئیں۔	..
بدوی اور شہری تمدن میں فرق	..
ایک اور مطالبہ۔ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے	۱۰۵
طور پر بے ہوشی	..
بنی اسرائیل کا ایمان اور قوم فرعون کے مومنین کا ایمان	۱۰۶
محکوم اور حاکم قوم کے افراد کی قوتِ ایمانیہ کا فرق	-
ایک اور فرق۔ محکوم قوم عمل کے بجائے باتیں بنانے اور	۱۰۷
بہانے تراشنے میں مشاق ہوتی ہے۔	..
ذبحِ بقر کا واقعہ اور اس سے عبرت آموز سبق	۱۰۸
جرأت اور حوصلہ کے بجائے خوف وہراس	۱۱۰
فاذہب انت وربک۔ ہمتوں کی پستی	۱۱۱
سو وہ ارضِ مقدس جو ان کے نام لکھی جاچکی تھی چالیس	۱۱۲
سال تک ان پر حرام ہوگئی (کہ یہ ابھی اس کے	..
اہل نہ تھے)۔	..
یہ تھی وہ قوم جس نے حضرت موسیٰ کو اس طرح ستایا۔	..
لیکن تورات نے اس کے متعلق کیا افسانہ طرازی کی؟	۱۱۳
اور افسوس کہ خود ہماری کتبِ روایات بھی اس	۱۱۵
سے محفوظ نہ رہ سکیں۔	

مضمون	صفحہ
بخاری شریف کی ایک روایت	--
قوم کے بڑے بوڑھوں سے مایوسی۔ نئی نسل کی	۱۱۶
تربیت کی فکر۔	
چالیس برس تک دشت پیمائی و صحرا نوردی	۱۱۷
سلسلۂ رشد و ہدایت۔ بارگاہِ ایزدی سے نوازشاتِ	..
پیہم کی گہرباری۔	..
خدا کے احکام ملتے چلے گئے	۱۱۸
تربیت گاہِ سینا	..
انہی میدانوں میں حضرت شعیبؑ بھی تشریف لے آئے	..
اور نوجوانانِ قوم کی تربیت میں ہاتھ بٹانے لگے	۱۱۹
یہ نوجوان تنظیم و تربیت کے بعد سیلاب کی طرح اُمڈے	۱۲۰
اور فلسطین کی زمینوں پر چھا گئے۔	..
یوں اللہ کے وعدے پورے ہوئے	۱۲۱
دورِ عروج و سیادت	..
مقامِ برتری	۱۲۲

باب سوم

مضمون	صفحہ
...... طاؤس و رباب آخر	۱۲۳
حضرت موسیٰؑ کی وفات۔ (بخاری شریف کی ایک روایت)	..
خلافتِ موسویؑ۔ حضرت یوشعؑ بن نون	۱۲۴
جناب طالوت کا واقعہ	..
قیادت و سیادت کے لئے کن خصوصیات	..
کی ضرورت ہوتی ہے؟	..
جوہرِ ذاتی نہ کہ نسب و دولت	..
قوم کے ضبطِ نفس کا امتحان۔ ذراسی بات، لیکن وہ	۱۲۷
اس پر بھی پورے نہ اُتر سکے۔	..
معیارِ فتح وظفر، قلّت و کثرت نہیں ایمان	۱۲۸
کی قوت۔	..
جالوت کے ساتھ مقابلہ۔۔ میدانِ جہاد کی دعائیں	۱۲۸
فتح و کامرانی	۱۲۹
"بادشاہ" بنانے کے متعلق تورات کی تصریحات	۱۳۰
عروج کے بعد انحطاط۔ بنی اسرائیل کی ملّی خرابیاں	۱۳۳
دو بہت بڑی بربادیاں	..
(i) بخت نصر کی یورش اور یروشلم کی بربادی	۱۳۴
اس تباہی کے بعد دوبارہ زندگی	۱۳۶
حزقیل نبی کا خواب جس کی تائید	..
قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے۔	..
(ii) رومیوں کے ہاتھوں سنۂ میں	۱۳۸
دوسری بربادی۔	..
جس کے بعد انھیں پھر زندگی نصیب	--
نہیں ہوئی۔	..
یہ بربادی اور تباہی ان کے جرائم کا نتیجہ تھی۔	۱۳۹
جرائم کی فہرست	..
قتلِ انبیاء	..

مضمون	صفحہ
عہد شکنی	۱۴۰
پہلے اپنے لوگوں کے لئے مصیبت کا سامان	..
پیدا کرنا اور پھر ان سے اظہارِ ہمدردی	..
وجہ ثواب سمجھنا۔	..
تُومنون ببعض الکتٰب و تکفرون ببعض	۱۴۱
کا مفہوم۔ مسلمانوں کے لئے عبرت و	..
موعظت کا ایک واضح باب	..
(ضمنی گوشہ)	
عیوب اتنے عام ہو چکے تھے کہ ان پر سرزنش	۱۴۲
کرنے والا کوئی نہ تھا۔	..
سود خود اور حرام خور	..
حتیٰ کہ دین فروش	۱۴۳
ضبطِ نفس کا فقدان۔ اطاعت شعاری کا	..
جذبہ فنا ہو چکا تھا۔	..
قوانینِ خداوندی کو فراموش کر بیٹھے تھے۔	۱۴۴
انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی پابندی	..
بڑی سختی سے کرتے تھے۔	..
یوں انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو	..
خدا بنا رکھا تھا۔	..
ان کے علماء و مشائخ (احبار و رہبان) کی حالت	۱۴۵
بھی تاسف انگیز ہو چکی تھی۔	..
جھوٹی نمائش اور منافقت کی تعریف چاہتے تھے۔	..

مضمون	صفحہ
باہمی تشتت و افتراق اور تحزب و تشیّع نے ان کی	..
وحدتِ ملی کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔	..
یہ اختلافات باہمی ضد کی بنا پر ہوتے تھے	۱۴۶
ایک دوسرے کی تنقیص و تکذیب	۱۴۷
نجات بلا عمل کا خود فریب عقیدہ	۱۴۸
نحن ابناء اللہ	..
محض یہودی نام رکھ لینے سے جنت کے واحد	۱۴۹
مالک۔ اس نجات کے لئے عجیب و غریب	..
عقائد۔	..
اندھی تقلید	۱۵۰
وہ اپنے باطل عقائد پر اس طرح آنکھیں	۱۵۱
بند کر کے جمے بیٹھے تھے کہ کسی دوسری	..
بات کو سننا تک گوارا نہیں کرتے تھے۔	..
لیکن اس ادعا کے باوجود موت کے نام سے	۱۵۲
ان کی رُوح فنا ہوتی تھی۔	..
ان جرائم کی پاداش میں (بلکہ ان کے فطری نتائج	۱۵۴
کے طور پر) ان پر غلامی اور محکومی کا رسواکن	..
عذاب مسلط ہو گیا۔	..
نہ صرف بدن کی غلامی بلکہ دل و دماغ کی غلامی۔	۱۵۵
نظریاتِ زندگی میں بھی دوسروں کے نقال۔	..
بلکہ بندروں کی سی کیفیت۔	۱۵۶
"بندر" بن جانے کا مفہوم۔	..

مضمون	صفحہ
یہود پر ذلّت کی مار	۱۵۷
ذلّت کے معنی ـ محکومی اور غلامی	۱۵۸
مسکنت کے معنی ـ بے عملی کا تعطل	۱۵۹
حَبْلِ اللهِ اور حَبْلِ النَّاسِ کا مفہوم.	..
ایک اہم ضمنی گوشہ	..
بنی اسرائیل کے لئے بازآفرینی کا آخری موقع	۱۶۰
یعنی اتباعِ نبی اکرمؐ. لیکن انہوں نے	..
اسے بھی ضایع کر دیا.	..
آخری تباہی ـ مسلمانوں کے عہد میں	۱۶۱
یہ ہے داستانِ بنی اسرائیل جو ہمارے لئے	۱۶۲
باعثِ عبرت و موعظت ہے.	..
باز بخویشتن نگر!	..
کیا یہودیوں کی تباہی ابدی ہے؟	۱۶۴
یہ خدا کا فیصلہ نہیں. ہماری خوش فہمی تھی.	..
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی	۱۶۵
طبیعی قوانین ـ "شیر سنگھ یا رام داس" میں	..
تفریق نہیں کرتے.	..
خدا کی چہیتی اولاد؟	۱۶۶
بنی اسرائیل کی اجتماعی خرابیاں	۱۶۷
کون سی خرابی اب ہم میں پیدا نہیں ہو چکی؟	..
مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد	۱۶۹
خدا کا غضب سے مفہوم	۱۷۰

مضمون	صفحہ
"اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ" اور "ابد" کا مفہوم	۱۷۲
حکومت و سلطنت حاصل کرنے کی صلاحیتیں	۱۷۳
صلیبی جنگ کا واقعہ	..
نپولین کا مصر پر حملہ	۱۷۴
بخارا پر روسیوں کا محاصرہ	..
توپیں جیت گئیں. خالی دعائیں کچھ نہ	..
بگاڑ سکیں.	..
ہماری حالت	..
۱۹۶۷ء میں یہودیوں کے ہاتھوں عربوں	۱۷۵
کی شکستِ فاش.	..
قوموں کی تقدیروں کے فیصلے ان کے	..
اپنے اعمال و کردار کے مطابق	..
ہوتے ہیں.	..
باب چہارم (تورات)	۱۷۶
وحدتِ ادیان کا صحیح مفہوم	..
سلسلہ رشد و ہدایت کی مختلف کڑیاں ایک	
ہی مشعل کی کرنیں تھیں. لیکن کتبِ سابقہ اپنی	۱۷۷
اصلی شکل میں باقی نہ رہیں. اس لئے اب وہ	
تمام تعلیم صرف قرآن کریم کے اندر ہے.	

مضمون	صفحہ
قرآن، کتبِ سابقہ کا ذکر رقیبانہ چشمک سے نہیں کرتا	۱۷۷
بلکہ یگانگت کے رنگ میں کرتا ہے۔	..
تنزیلِ تورات	..
تورات حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ	۱۷۸
دونوں کو ملی تھی۔	..
یہ باعثِ ہدایت و رحمت تھی	۱۷۹
اس میں نبیٔ اکرمؐ اور صحابہؓ کی مقدس جماعت کا ذکر تھا	..
یہ ایمان کہ تورات منزل من اللہ تھی مسلمانوں	..
کے لئے ضروری ہے۔	..
لیکن اصل تورات میں تحریف و الحاق کیا گیا تھا	۱۸۰
قرآنِ کریم، تورات کی اصلی تعلیم کو لئے ہوئے ہے۔	۱۸۱
باب پنجم (بعض ضمنی گوشے)	۱۸۲
(۱) کلیم اللّٰہی	..
(۲) شرحِ صدر	۱۸۴
حوصلوں کی بلندی، نگاہ کی کشادگی، ظرف	۱۸۵
کی وسعت۔ شرحِ صدر کس طرح ہوتا ہے؟	..
احکامِ الٰہیہ کی اتباع اور ہمت و استقلال	۱۸۶
کے ساتھ اتباع سے۔	
نبیٔ اکرمؐ کا شرحِ صدر	۱۸۷
اسلام کے لئے مومنین کا شرحِ صدر	۱۸۸

مضمون	صفحہ
(۳) ضلالت کے معنی۔ جہاں حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا کہ	۱۸۸
اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ۔	..
اس کے معنی غلطی کے ہیں	..
اور راستہ کی تلاش میں اضطراب کے بھی	۱۸۹
(۴) "قتلِ نفس" کا واقعہ	۱۹۰
یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جو تاریخی انکشافات	..
کی روشنی میں ہی واضح ہو سکے گا، تاحال	
اس کا یقینی مفہوم متعین نہیں ہو سکا۔	..
(۵) قارون	۱۹۱
یہ فسادِ سرمایہ داری کا مظہر تھا۔	..
دعوتِ اصلاح کے جواب میں قارون کا جواب	۱۹۲
سطح بین لوگ ایسی زندگی کو قابلِ رشک	..
سمجھ لیتے ہیں۔	..
لیکن حقیقت بین نگاہیں جانتی ہیں کہ	۱۹۳
اس کی اصلیت کیا ہے؟	..
قارون کا انجام — ہلاکت	..
قارون اور تورات کا بیان	۱۹۴
مؤرخ جوزیفس کی شہادت	۱۹۴
قارون ہر چند قومِ موسیٰؑ میں سے تھا۔	..
لیکن اس کے مسلکِ فساد کی وجہ سے اسے	..
بھی فرعون اور ہامان کے زمرہ میں شمار	..
کیا گیا ہے	..

مضمون	صفحہ
(۶) ہامان	۱۹۵
بادشاہت کے ساتھ برہمنیت کا غلبہ واقتدار	..
مصر میں اس کا تسلط اور شدید تھا۔	۱۹۶
آمن دیوتا کے مندر کا پجاری گویا ایک سلطنت	..
کا مالک تھا۔	..
یہی قرآن کریم کا ہامان ہے۔	..
یہودی لٹریچر میں نبی کے معنی	۱۹۷
(۷) حقیقتِ سحر	۱۹۹
لفظِ سحر کے معنی۔ جس کا سبب لطیف اور دقیق ہو	۲۰۰
سحر کی ابتدائی تاریخ	..
علم السحر کے معتقدین کا عقیدہ۔ عالمِ مثال	..
اس کی سائنٹیفک توجیہہ	۲۰۱
محققینِ مغرب کی تصریحات	۲۰۲
فنِ سحر کی بنیاد۔ قوتِ ارادی	۲۰۳
اور قرآنِ کریم کا بیان	۲۰۴
مسلمان اور سحر کاری	۲۰۴
ورد، وظیفے، گنڈے، تعویذ، عملیات	۲۰۵
سب قوتِ ارادی کے کرشمے ہیں۔	..
غیر مسلموں کی ساحرانہ سازش	۲۰۶
قرآن کی عظمت اس سے بہت بلند ہے	۲۰۷
قرآن کا غلط مصرف	۲۰۸
اس قسم کی باتوں سے معیارِ فضیلت تقویٰ نہیں رہا۔	۲۰۹

مضمون	صفحہ
مسلکِ خانقاہیت نے مسلمانوں کے قوائے عملیہ	۲۱۰
کو مضمحل کر دیا ہے۔	..
اصل مسلکِ زندگی کیا ہے؟	۲۱۱
سحر کے معنی جھوٹ	۲۱۲
نبی اکرمؐ کے متعلق کفار کی تہمت کہ حضورؐ پر	۲۱۵
(معاذ اللہ) کسی نے جادو کر دیا ہے!	..
لیکن یہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی موجود ہے۔	۲۱۶
(بخاری شریف کی ایک روایت)	..
(۸) واقعہ "خضر"	۲۱۷
خضر کا نام قرآنِ کریم میں نہیں ہے۔	..
حضرت موسیٰؑ کا سفر	..
خدا کے ایک بندے سے ملاقات	۲۱۸
ان کی معیت میں سفر	۲۱۹
تین واقعات اور حضرت موسیٰؑ کے استفسارات	۲۲۰
ان باتوں کی حقیقت	۲۲۱
اس واقعہ سے پیری مریدی کے جواز (بلکہ	۲۲۵
وجوب) کی سند حاصل کی جاتی ہے۔	..
نیز یہ کہ "مرشد" کی نگاہ بواطن پر ہوتی ہے	..
اس کی کسی حرکت پر حرف گیری نہیں	..
کرنی چاہیئے۔	۲۲۶
حضورؐ نے قرآن ہی کی تعلیم دی اور کھلی کھلی تعلیم دی	۲۲۷
جس میں کوئی راز اور پردہ داری نہ تھی۔	..

مضمون	صفحہ
لیکن مسلمانوں میں یہ عقیدہ موجود ہے کہ اصل دین	۲۲۸
درحقیقت "رموز و اسرار" ہی کا نام ہے	..
تصوف کی عمارت اسی مفروضہ پر قائم ہے۔	..
بخاری شریف کی ایک روایت	..
اسلام کا مقصد ایک ایسی جماعت تیار کرنا ہے	۲۲۹
جو دنیا میں قرآنی نظامِ حکومت قائم کر سکے۔	..
لیکن مسلمانوں نے کیا کیا؟	۲۳۰
تسخیرِ فطرت اور تصوف۔ حکمتِ یونان کا	۲۳۱
تعطل آمیز اثر۔	..
علم النفس اور قرآن	۲۳۲
علمِ لدنی کا قرآنی مفہوم	۲۳۴
سطوتِ داؤدی و شوکتِ سلیمانی ۱۰۰۰ ق۔م	۲۳۹
طالوت کے جانشین، حضرت داؤدؑ	۲۴۰
آپ کو زبور عطا ہوئی تھی۔	..
وراثتِ ارضی اور اعمالِ صالحہ (ایک ضمنی گوشہ)	۲۴۱
آپ کو علم اور حکمت اور فیصلوں کی قوت	-
عطا فرمائی گئی تھی۔	-
اس تمام قوت و جبروت کے ساتھ، خدا کے فرماں بردار	۲۴۲
تسبیح سے مفہوم۔ پہاڑوں اور طیور کی	۲۴۲
تسخیر سے مراد	..
ایک ضمنی گوشہ	..
آپ فنِ اسلحہ سازی سے واقف تھے	..
حضرت داؤدؑ کے ایک فیصلہ کا ذکر	۲۴۳
آپ کے فیصلہ سے حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ	..
انسب قرار پایا۔	..
مقدمہ کی تفصیل	..
اس واقعہ پر افسانہ طرازیوں کی بنیاد۔	۲۴۵
محرف تورات کی خرافات	-
لیکن ہماری کتبِ تفسیر بھی اس سے ملوث ہیں	۲۴۸
اور غضب یہ کہ ان لغویات کی بنیاد	۲۴۹
احادیث پر رکھی جاتی ہے۔	
یہ روایات کس طرح جزوِ دین بن گئیں	..
حضرت داؤدؑ کا ضمنی تذکرہ	۲۵۰
تورات کا ایک اور لغو قصہ	
حضرت سلیمانؑ ۹۵۰ ق۔م	۲۵۳
حضرت داؤدؑ کے فرزند اور جانشین	
علم و قوت کے مالک	۲۵۴

مضمون	صفحہ
عظیم الشان سلطنت۔ سنگین قلعے۔ جہازات	..
شیاطین وجنات مسخر تھے۔	۲۵۵
ان سے کیا مراد ہے؟	۲۵۵
جیوش وعساکر	۲۵۷
منطق الطیر۔ گھوڑوں کے رسالے	..
وادیٔ نمل	۲۵۸
قومِ سبا	..
ان کی مرفّہ الحالی اور بربادی کا مختصر تذکرہ	۲۵۹
بربادی کے اسباب۔ نشۂ قوت کی بدمستیاں	..
ہوسِ استعماریت	۲۶۰
ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ کا واقعہ	۲۶۱
ہُدہُد کون تھا؟	۲۶۲
ہُدہُد کی اطلاع	..
حضرت سلیمانؑ کی طرف سے پیغام	۲۶۳
اس پیغام کا جواب	..
ملکہ کا تخت اور "عفریت"	۲۶۵
بلورین صحن کا واقعہ	۲۶۷
ملکہ کا ایمان۔ یہ ہے واقعہ کا ماحصل	..
حضرت سلیمانؑ کا جانشین۔ ایک بے جان دھڑ!	..
ایک عمیق نکتہ۔ کھوکھلی لکڑی کی اطاعت!!	۲۶۸
حضرت سلیمانؑ اور موجودہ تورات کی افسانہ طرازیاں	۲۶۹
سحر وکہانت کی خرافات اور ان کا حضرت سلیمانؑ کی	

مضمون	صفحہ
طرف انتساب!	..
ہاروت وماروت	۲۷۰
مملکتِ سلیمان کے خلاف سازشیں	۲۷۱
جادو کا سرچشمہ بابل	۲۷۲
یہودیوں میں دوبارہ بھی وہیں سے پھیلی	۲۷۳
لیکن اُسے منسوب کردیا گیا حضرت سلیمانؑ	..
کی طرف	..
ایک اور افسانہ — اسمِ اعظم کی کرامات	..
قرآنِ کریم نے ان تمام اتہامات کی تردید فرمادی	۲۷۴
لیکن خود ہمارے ہاں کا لٹریچر؟	۲۷۵
بخاری شریف کی روایت	..
گھوڑوں والے واقعہ کے متعلق مزید تصریحات	۲۷۶
حضرت ایوب علیہ السلام	۲۷۹
نسبی سلسلہ اور زمانہ	۲۸۰
قرآن میں آپ کا ایک واقعہ	۲۸۱
سانپ کے کاٹنے سے آپ بیمار ہوگئے	..
علاج کے لئے آپ کو معدنی چشموں کا سراغ دیا گیا	۲۸۲
ایک مشکل مقام اور اس کا قرآنی مفہوم	۲۸۳
پھر وہی افسانے۔	..

مضمون	صفحہ
عزمِ یونسؑ	۲۸۵
حضرت یونسؑ سنہ ق.م	۲۸۶
صاحبِ صحیفۂ یوناہ	..
آپ کی قوم نے تنذیر سے عبرت پکڑ لی.	..
تورات کا بیان	۲۸۶
قرآنِ کریم کا بیان	۲۸۷
اہلِ نینوا کی سرکشی	۲۹۰
تنذیر کے بعد عبرت	..
لیکن دوبارہ سرکشی اور بربادی	..
پنکھڑیاں	۲۹۱
حضرت ادریسؑ	..
حضرت الیاسؑ	۲۹۲
حضرت ذوالکفلؑ	..
چند اقوام جن کی طرف مبعوث شدہ انبیائے کرامؑ کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے.	..
قومِ تُبّع	۲۹۳
اصحاب الاُخدود	۲۹۴

مضمون	صفحہ
اصحاب الرّس	۲۹۵
اصحاب الحجر	۲۹۶
(ایک اہم ضمنی گوشہ)	۲۹۷
مستشرقین کی طرف سے قرآن کے خلاف	..
ایک عجیب اعتراض.	..
یعنی قرآن کے بعض قصص و واقعات تاریخی	..
اعتبار سے قابلِ اعتماد نہیں.	..
قرآن کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھے جانے میں ذرا بھی	۲۹۷
تامّل نہیں لیکن اسے قیاسات کی میزانوں میں	..
تو نہ تولیے؟	
ان کے پاس میزان ہے تاریخ.	۲۹۸
لیکن موجودہ تاریخ، یقینیات کا درجہ کس طرح	..
حاصل کر سکتی ہے؟	..
اثری انکشافات اور تاریخی نتائج	..
خود مغربی مؤرخین کے نزدیک تاریخ کی حیثیت	۲۹۹
قرآن پر کس طرح ایمان رکھنا چاہیئے؟	۳۰۰
تاریخ کے متعلق یہ زاویۂ نگاہ غیر سائنٹیفک نہیں.	۳۰۱
ذُوالقرنین (۶۰۰ ـ ۵۰۰ ق.م)	۳۰۳
ذوالقرنین سے کون مراد ہے؟	۳۰۴

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
زمانۂ حال کی اثری تحقیقات کا رُخ	..	شمالی مہم، کاکیشیا کی طرف	..
غالباً اس سے مراد خورس (سائرس)	۳۰۵	یہاں کے لوگوں نے دیوار بنانے کی درخواست کی	۳۱۲
یعنی کیخسرو ہے!	..	دیوار تعمیر کردی گئی۔	۳۱۳
بخت نصر کے ہاتھوں یہودیوں کی تباہی اور اسارت	..	بصائر و حکم۔ تمکّن فی الارض۔ شان و شوکت	۳۱۴
اس ہجومِ نااُمیدی میں اُمید کی کرن	..	خدا کا انعام ہے۔ لیکن یہ قوت کمزوروں	۳۱۵
دانیال نبی کا خواب	..	کی حفاظت میں صرف ہوگی۔ اس سے	..
اور خواب کی تعبیر	۳۰۶	دماغ میں تکبّر کے بجائے خداترسی کے	..
فارس کا شاہنشاہ سائرس	۳۰۷	جوہر پیدا ہوں گے۔	..
بابل پر حملہ اور یہودیوں کی وارستگی	..	سائرس مذہب زرتشت کا پیرو تھا۔	۳۱۶
ہیکل کی دوبارہ تعمیر	..	یاجوج و ماجوج کون تھے؟	..
اس کے بعد دامن کاکیشیا میں بسنے والی قوم کی درخواست	۳۰۸	وسطی ایشیا (سطحِ مرتفع پامیر) کے	۳۱۷
پر سدِ ذوالقرنین کی تعمیر	..	وحشی قبائل	..
ذوالقرنین اور قرآنِ کریم	۳۰۹	سدِ ذوالقرنین شہر دربند کے قریب	۳۱۹
پہلی مہم جانبِ مغرب (لیڈیا کی طرف)	..	واقع تھی۔	..
پھر شرقی مہم (جانبِ بلخ)	۳۱۱	ان کی آخری یورش تباہئ بغداد کے وقت۔	۳۱۹

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب: برق طور

مصنف: غلام احمد پرویزؒ

طابع: خالد منصور نسیم

ناشر: طلوع اسلام ٹرسٹ

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

B - 25 گلبرگ 2 - لاہور

3/2 فیصل نگر۔ لاہور

قیمت:

ایڈیشن: چہارم 1993ء (بلا ترمیم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش آہنگ

پرویزؔ صاحب کی مایۂ ناز تصنیف، معارف القرآن کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۴۱ء سے شروع ہوا اور ۱۹۴۵ء تک اس کی تین جلدیں شائع ہوئیں۔ جب ان جلدوں کے نئے ایڈیشنوں کی طباعت کا سوال سامنے آیا تو یہ محسوس کیا گیا کہ ان میں سے ہر جلد فی ذاتہٖ خود مکتفی ہے اس لئے انہیں موضوع کے اعتبار سے، الگ الگ چھاپنا چاہیئے۔ چنانچہ انہیں ان پانچ جلدوں میں شائع کیا گیا— من و یزداں، ابلیس و آدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور۔ ان کتابوں کے وہ ایڈیشن بھی ایک عرصہ ہوا ختم ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ اس دوران میں پرویزؔ صاحب کی جدید تصنیفات شائع ہو رہی تھیں اس لئے ان کے جدید ایڈیشنوں کی طباعت کی باری جلدی نہ آ سکی اگرچہ اس کے لئے شائقین مسلسل اصرار کرتے رہے۔ ان کے اس اصرار اور وقت کے تقاضا کے پیشِ نظر ان کی طباعت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ اس سے پہلے ابلیس و آدم اور جوئے نور شائع ہو چکی ہیں۔ برقِ طور اب پیشِ خدمت ہے۔ شعلۂ مستور اور من و یزداں کی بھی کتابت ہو چکی ہے۔ اگر کاغذ کے حصول میں کچھ آسانیاں پیدا ہو گئیں تو اُمید ہے وہ بھی جلدی چھپ جائیں گی۔ ان کے ساتھ اگر معراجِ انسانیت، جہانِ فردا اور کتاب التقدیر کو بھی شامل کر لیا جائے (جو طبع شدہ موجود ہیں) تو اس سے معارف القرآن کا سلسلہ مکمل ہو جاتا ہے۔

زیرِ نظر ایڈیشن، مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے جس میں انہوں نے ضروری ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کیا ہے۔ اس سے ان کتاب کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس میں اکثر مقامات ایسے آئیں گے جن میں آپ کو قرآنِ کریم کے مروجہ تراجم و تفاسیر سے اختلاف نظر آئے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ پرویزؔ صاحب نے ان آیات کا یہ مفہوم کس طرح سے متعین کیا ہے ان کی لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی طرف رجوع کرنا مفید رہے گا۔ یاد رکھیے! پرویزؔ صاحب قرآنی آیات کا جو مفہوم پیش کرتے ہیں، وہ لغت اور خود قرآنِ کریم کی سند کے بغیر نہیں ہوتا۔ حسبِ معمول آیات کے حوالہ میں، اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر مثلاً (۳/۴۱) سے مراد ہے سورۂ آلِ عمران کی اکتالیسویں آیت۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ اپنی اس سعادت پر نازاں ہے کہ اسے ان بیش بہا تصانیف کی اشاعت کا فخر حاصل ہے۔ ویسے پرویزؔ صاحب کی تصانیف کے جملہ حقوق انہی کے نام محفوظ ہیں۔ والسلام

مارچ ۱۹۷۳ء　　طلوعِ اسلام ٹرسٹ۔ ۲۵/ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

اس قوم نے اس سرزمین پر صدیوں تک حکومت کی اور نہایت شان و شوکت اور دبدبہ و طنطنہ سے حکومت کی۔ انہی میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) جیسے برگزیدہ نبی اور صاحبِ سطوت و شوکت حکمران پیدا ہوئے۔ اس زرین داستان کی یہ کڑیاں اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جس قوم کے بچپن (آغاز) اور جوانی (عروج) کی تصویریں ہم نے دیکھ لی ہیں بہتر ہے کہ اس کے بڑھاپے (زوال) اور موت کے نقشے بھی ساتھ ہی سامنے آجائیں، تاکہ یہ حقیقت نمایاں طور پر واضح ہو جائے کہ قوانینِ الٰہیہ کا اتباع کیا نتائج مرتب کرتا ہے اور ان سے انحراف کے عواقب کیا ہوتے ہیں؟

باب سوم

..... طاؤس و رباب آخر

تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے **موآب** کی سرزمین میں (۱۲۰ سال کی عمر میں) وفات[1] پائی۔ (دیکھئے استثناء ۵/۳۴)

---

[1] حضرت ہارونؑ کی وفات اس سے پیشتر ہو چکی تھی (دیکھئے گنتی ۲۰/۲۸)۔ کہا یہ جاتا ہے کہ فلسطین کی فتح حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔ چونکہ قرآنِ کریم نے اس سے بحث نہیں کی اس لئے ہم نے بھی اس حصہ کی تشریح ضروری نہیں سمجھی۔ آپ کے سامنے بھی ہو یا بعد میں کھیتی ہر حال میں آپ ہی کی تھی۔

[2] قرآنِ کریم نے حضرت موسیٰؑ کی وفات کے متعلق کچھ ذکر نہیں کیا۔ لیکن اسرائیلیات کے اثر کے ماتحت، ہماری کتبِ روایات اس باب میں بھی عجیب و غریب چیزیں پیش کر رہی ہیں۔ چنانچہ بخاری شریف کی حسبِ ذیل روایت اس پر شاہد ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ملک الموت کو حضرت موسیٰؑ کے پاس بھیجا گیا۔ ملک الموت نے جا کر کہا کہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرو۔ موسیٰؑ نے ملک الموت کی آنکھ پر گھونسہ مارا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ فرشتۂ موت خدا تعالیٰ کے پاس واپس گیا اور عرض کیا، الٰہی تُو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا جو مرنا نہیں چاہتا۔ خدا نے ملک الموت کو (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

خلافتِ موسوی

آپ کے بعد حضرت یوشع بن نون آپ کے جانشین ہوئے دیکھئے یشوع ۲۴/۳۰)۔ قرآنِ کریم میں حضرت الیسعؑ کا نام زمرۂ انبیائے کرامؑ میں آیا ہے (دیکھئے ۶/۸۶؛ ۳۸/۴۸)۔ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس سے حضرت یوشع بن نون مراد ہیں یا تورات کے یسعیاہ۔ بہرحال، ان کے عہد میں فلسطین کا بہت سا اور علاقہ بھی فتح ہوا۔ ہمیں چونکہ بنی اسرائیل کی تاریخی جزئیات کا استقصاً مقصود نہیں، بلکہ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اس قوم کے رفیع الشان عروج کے بعد، عبرت انگیز زوال کن عیوب و نقائص کی بنا پر ہوا۔ اس لئے ہم ان تفاصیل سے درگزر کرتے ہیں۔ حضرت یوشعؑ کے بعد ایک عرصہ تک بنی اسرائیل کا نظام کچھ جمہوری سا رہا۔ اس عہد کو "قاضیوں کا عہد" کہا جاتا ہے۔ تا آنکہ ۱۰۰۰ء ق م کے قریب ان کے کمانڈر حضرت طالوت (ساؤل) مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر BREASTED جس کی "تاریخِ مصر" کا ذکر پہلے آ چکا ہے، نے لکھا ہے کہ فراعنۂ مصر کے بیسویں اور اکیسویں خاندان کے زمانہ میں، بنی اسرائیل نے (حضرت) طالوت اور داؤدؑ کی زیرِ سرکردگی، فلسطینیوں پر پورا غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ دوسری طرف اس زمانہ میں فراعنۂ مصر کی سلطنت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ (صفحہ ۵۲۶) قرآنِ کریم میں حضرت طالوتؑ کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

جنابِ طالوت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ...... وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲/۲۴۶)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے اس واقعہ پر غور نہیں کیا جو موسےٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو پیش آیا تھا

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) دوبارہ آنکھ عطا فرما دی اور ارشاد فرمایا کہ واپس جا کر اس سے کہو کہ اگر تو زندگی چاہتا ہے تو اپنا ہاتھ بیل کی پشت پر رکھ۔ جس قدر بال تیرے ہاتھ کے نیچے آ جائیں اتنے ہی سال کی تیری عمر ہو گی (ملک الموت نے جا کر خدا کا حکم موسیٰ تک پہنچا دیا) موسےٰ نے کہا اس کے بعد کیا ہو گا۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا، موت۔ حضرت موسیٰ نے کہا پھر ابھی سہی ...... (بخاری جلد دوم) ...... صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ ایک اسرائیلی روایت ہے جو کتبِ حدیث میں جگہ پا گئی ہے۔ لیکن چونکہ اسے امام بخاریؒ نے نقل کر دیا ہے اس لئے اب کسی کو ہمت نہیں پڑتی کہ اسے وضعی قرار دیدے۔ اس لئے کہ معیارِ صحت و سقم سلسلۂ اسناد قرار پا چکا ہے نہ کہ متن (یعنی مضمون)۔

بنی اسرائیل کے سرداروں نے اپنے عہد کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے۔ ہمارے لئے ایک کمانڈر مقرر کردو۔ نبی نے کہا (مجھے اُمید نہیں کہ تم ایسا کرسکو) اگر تمہیں لڑائی کا حکم دیا گیا، تو کچھ بعید نہیں کہ تم لڑنے سے انکار کردو۔ سرداروں نے کہا ایسا کیونکر ہوسکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے جاچکے ہیں اور اپنی اولاد سے علیحدہ ہوچکے ہیں؟ لیکن پھر دیکھو، جب ایسا ہوا کہ انہیں جنگ کا حکم دیا گیا (اور اس کا تمام سروسامان کردیا گیا) تو (ان کی ساری گرم جوشیاں ٹھنڈی پڑ گئیں اور) ایک قلیل تعداد کے سوا سب نے پیٹھ دکھلا دی اور اللہ نافرمانوں (کے دلوں کے کھوٹ) سے ناواقف نہیں (وہ جانتا ہے کہ کون عزم و عمل کے دعووں میں سچے ہیں اور کن کے دل ایمان و حق پرستی سے خالی ہیں)۔

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو ان پر کمانڈر مقرر کیا ہے۔ لیکن یہ اس پر اس بنا پر معترض ہوئے کہ یہ کسی امیر گھرانے کا فرد نہیں۔ اسے کمانڈر کس طرح بنا دیا گیا ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ قیادت و سیادت کے لئے دولت وجہِ انتخاب نہیں، اس کا معیار کچھ اور ہے۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا....

.... وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۲/۲۴۷)

اور پھر ایسا ہوا کہ ان کے نبی نے کہا، اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بہ حیثیت کمانڈر مقرر کردیا ہے۔ (سو اس کی اطاعت کرو اور اس کے ماتحت جنگ کے لئے تیار ہوجاؤ۔ جب سرداروں نے یہ بات سُنی، تو بجائے اس کے کہ اپنی فرماں برداری سے استعدادِ کار کا ثبوت دیتے، لگے طالوت کے انتخاب پر طرح طرح کے اعتراض کرنے) انہوں نے کہا، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اُسے ہم پر اقتدار مل جائے، حالانکہ اس سے کہیں زیادہ صاحبِ اقتدار ہونے کے ہم خود حق دار ہیں۔ اس کے پاس مال و دولت کچھ نہیں۔ نبی نے یہ سُن کر کہا (قیادت کی اہلیت کا جو معیار تم نے سمجھ رکھا ہے، یہ تمہارے جہل و خود پرستی کا گھڑا ہوا معیار ہے۔ اللہ کا ٹھہرایا ہوا معیار نہیں) اللہ نے تو طالوت ہی کو (حکمرانی کی قابلیتوں کے لحاظ سے، تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت، دونوں میں اُسے وسعت دی ہے (یعنی

دماغی اور جسمانی دونوں طرح کی فضیلت رکھتا ہے اور یہی دو فضیلتیں قائد اور صاحبِ اقتدار کے لئے اصلی فضیلتیں ہیں نہ کہ مال و جاہ اور نسل و خاندان کے امتیازات) اور (قیادت تمہارے دیدینے سے کسی کو مل نہیں سکتی۔ یہ تو اسی کو ملتی ہے جسے اللہ نے اس کی صلاحیت دیدی ہے) ان صلاحیتوں کے ساتھ جو بھی اسے حاصل کرنا چاہے اسے یہ دیدی جاتی ہے۔ اللہ بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

غور فرمایئے! کسی قوم کی قیادت و سیادت کے لئے قرآنِ کریم نے کیسی محکم خصوصیات کا ذکر فرمایا ہے جسم اور دماغ دونوں کے اعتبار سے اصلح۔ افراد ہوں یا اقوام، حکمرانی کے لئے یہ خصوصیتیں لاینفک ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:۔

اہلِ حق را زندگی از قوّت است　　　قوّتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوّت ہمہ مکر و فسوں　　　قوّتِ بے رائے جہل است و جنوں

شرطِ انتخاب

جناب طالوت کے انتخاب سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے (خواہ وہ آج سے تین ہزار سال پیشتر نازل ہوا تھا یا آج ہم میں موجود ہے) قیادت و حکمرانی کے لئے جوہرِ ذاتی ہی وجۂ تخصیص ہے، نہ کہ نسلی امتیاز۔ جب قیادت وراثت میں تبدیل ہوجاتی ہے (یعنی بیٹے کو محض بیٹا ہونے کی بنا پر وارثِ تختِ حکومت قرار دے دیا جاتا ہے) تو ملوکیت کی لعنت، نوعِ انسانی کے حسین چہرہ کو مسخ کرکے رکھ دیتی ہے۔ اسلام اسی لعنت کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔

قصۂ جناب طالوت کی باقی کڑیاں قرآنِ کریم میں یوں وارد ہوئی ہیں۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ع (۲/۲۴۸)

اور پھر ان کے نبی نے کہا (تم طالوت کے استحقاقِ قیادت پر اعتراض کرتے تھے، تو دیکھو) اس کی (اہلیت) حکومت کی نشانی یہ ہے کہ (مقدس) تابوت (جو تم کھو چکے ہو اور دشمن کے ہاتھ پڑ چکا ہے)، تمہارے پاس (واپس) آجائے گا اور (حکمتِ الٰہی سے ایسا ہوگا کہ) فرشتے

اسے اٹھالائیں گے، اُس تابوت میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے (فتح وکامرانی کی) دل جمعی ہے اور جو کچھ موسیٰ اور ہارون کے گھرانے (اپنی متقدس) یادگاریں چھوڑ گئے ہیں ان کا بقیہ ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو، تو یقیناً اس واقعہ میں تمہارے لئے بڑی ہی نشانی ہے[1]۔

چنانچہ جناب طالوت اپنے لشکر کو لے کر فلسطینیوں کی طرف بڑھے اور قوم کے ضبط وانضباط (discipline) کا امتحان لینے کے لئے حکم دیا کہ راستہ میں ایک ندی پڑتی ہے اس سے کوئی شخص پانی نہ پیئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قوم میں اب ضبطِ نفس اور اطاعت کے جوہر مفقود ہو رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی شجاعت و بسالت میں بھی افسردگی آرہی تھی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ .... وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (۲/۲۴۹)

پھر جب ایسا ہوا کہ طالوت نے لشکر کے ساتھ کوچ کیا، تو اس نے کہا، دیکھو (راہ میں ایک ندی پڑے گی) اس سے مقصودِ خداوندی یہ ہے کہ تمہارے ضبط و اطاعت کی صلاحیتوں کی نمود کا موقع بہم پہنچ جائے۔ پس یاد رکھو، جس کسی نے اس ندی کا پانی پیا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ وہ میری جماعت سے خارج ہو جائے گا۔ میرا ساتھی وہی ہوگا جو اس کے پانی کا مزہ تک نہ چکھے۔ ہاں اگر کوئی آدمی (بہت ہی مجبور ہو اور) اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے اور پی لے، تو اس کا مضائقہ نہیں۔

لیکن (جب لشکر ندی پر پہنچا، تو) ایک قلیل تعداد کے سوا سب نے پانی پی لیا (اور

---

[1] آیتِ قرآنی کا یہ ترجمہ الفاظ کے حقیقی معانی کے مطابق ہے۔ اگر "تابوتِ سکینہ" کا مجازی مفہوم لیا جائے، تو اس سے مراد ہوگی "قلبِ مطمئن"۔ اسی مفہوم کی رُو سے، بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ حضرت طالوت کے ہاتھوں جو فتح نصیب ہوگی اس کا سب سے اہم فائدہ ہوگا کہ تم جو اس وقت اس قدر خائف اور ہراساں رہتے ہو، اس کی جگہ تمہیں سکون اور اطمینان میسر آجائے گا اور تم ان تعلیمات کے وارث بن جاؤ گے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے متبعین نے چھوڑی ہیں۔

صبر و اطاعت کی آزمائش میں پورے نہ اُترے۔

پھر جب طالوت اور اُس کے ساتھ وہ لوگ جو (حکمِ الٰہی پر سچا) ایمان رکھتے تھے، ندی کے پار اُترے، تو ان لوگوں نے (جنہوں نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی) کہا، ہم میں یہ طاقت نہیں کہ آج جالوت سے (جو فلسطینیوں کے لشکر کا ایک دیو ہیکل سردار تھا) اور اس کی فوج سے مقابلہ کر سکیں، لیکن وہ لوگ جو سمجھتے تھے کہ انہیں (ایک دن) اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، پکار اُٹھے (تم دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت سے ہراساں کیوں ہوئے جاتے ہو؟) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر قانونِ خداوندی کے مطابق غالب آگئیں اور اللہ استقامت رکھنے والوں کا ساتھی ہے۔

معیارِ فتح وظفر

اس آیتِ جلیلہ میں قرآنِ کریم نے فتح وظفر کا ایک اور عظیم الشان راز بیان فرمایا ہے، یعنی دنیا میں کثرت وقلت، معیارِ فتح وشکست نہیں، بلکہ افراد کا ذاتی جوہر (نمودِ خودی) معیارِ حقیقی ہے۔ تھوڑی سی جماعت، جو ایمانِ محکم اور عملِ پیہم کی قوتوں سے مسلح ہو، بہت بڑی بھیڑ (CROWD) پر نہایت آسانی سے غالب آسکتی ہے۔ تاریخِ عالم کے صفحات پر ایک چھچلتی سی نگاہ ڈالئے، ہر موقع میں آپ کو اس حقیقتِ باہرہ کے خط وخال اُبھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ نگاہوں کے سامنے واضح مقصد، دل میں اس مقصد کی صداقت کا یقین اور اس کے حصول کی تڑپ، پاؤں میں استقامت، بازوؤں میں قوت، بڑھتی ہوئی ہمتیں اور اُٹھتے ہوئے قدم۔

جہادِ زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

حسین دُعائیں

جالوت کی فوجوں کے ساتھ جناب طالوت کا مقابلہ ہوا۔ میدانِ مبارزت میں آئے تو بدرگاہِ رب العزت دعائیں مانگی گئیں کہ

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ؕ (۲/۲۵۰)

اے پروردگار! (تو دیکھ رہا ہے کہ ہم تھوڑے ہیں اور مقابلہ ان سے ہے جو تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ پس ہم (تشنگانِ عزیمت) پر استقامت (کے جام) انڈیل دے (کہ عزم وثبات سے سیراب ہو جائیں) اور ہمارے قدم میدانِ جنگ میں جمادے (کہ کسی حال میں بھی پیچھے نہ ہٹیں)

اور پھر اپنے فضل و کرم سے) ایسا کرے کہ منکرینِ حق کے گروہ پر فتحمند ہو جائیں!
ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ کونسی قوت تھی جو جناب طالوت کو شکست دے سکتی تھی۔

فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (۲/۲۵۱)

چنانچہ انہوں نے قانونِ خداوندی کے مطابق اپنے دشمنوں کو ہزیمت دی اور داؤد[1] کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا۔ پھر اللہ نے بادشاہی اور حکمت سے سرفراز کیا اور (حکمرانی اور دانشوری کی باتوں میں سے) جو کچھ سکھلانا تھا، سکھلا دیا اور (اس طرح ایک گروہِ قلیل کے صبر و ثبات نے بنی اسرائیل کو ان کی گرتی ہوئی حالت سے نکال کر عظمت و اقبال کے عروج پر پہنچا دیا) اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کو راستے سے ہٹاتا رہتا تو دنیا میں فساد برپا ہو جاتا۔ (اور امن و عدالت کا نام و نشان باقی نہ رہتا) لیکن اللہ دنیا کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

ذرا اس آیت کے آخری حصہ پر غور فرمائیے۔ قوانینِ الٰہیہ کے تحت شمشیر زنی کی علتِ غائی بے نیام ہو کر سامنے آجائے گی۔ یعنی جماعتِ مومنین (حزب اللہ) صرف اس مقصدِ عظیم کے لئے شمشیر بکف میدانِ جہاد میں آتی ہے کہ دنیا سے فساد مٹ جائے اور کمزوروں پر کوئی ظلم نہ کر سکے (تفصیل ان حقائق کی اپنے مقام پر آئے گی۔

قرآنِ کریم نے جس مقام پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہاں دکھانا صرف یہ مقصود تھا کہ بنی اسرائیل میں اب اجتماعی عیوب پیدا ہونے شروع ہو چکے تھے۔ اس لئے اس نے اس واقعہ کے دوسرے گوشوں

---

[1] حضرت داؤد اس وقت ابھی اپنی عمر کے ابتدائی مراحل میں تھے اور جناب طالوت کے زیرِ کمان، جالوت کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکلے تھے۔

کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ تورات کی کتاب سموئیل اوّل میں جو تفاصیل مذکور ہیں وہ غور طلب ہیں۔ لکھا ہے۔

اور جب فلسطینیوں نے سُنا کہ بنی اسرائیل مصفاۃ میں فراہم ہوئے ہیں تو ان کے قطب بنی اسرائیل کے مقابل چڑھ آئے۔ سو بنی اسرائیل یہ سُن کے فلسطینیوں سے ڈرے اور بنی اسرائیل نے سموئیل کو کہا کہ چپکا مت ہو پر خداوند ہمارے خدا کو پکارا کرنا تاکہ وہ ہم کو فلسطینیوں کے ہاتھ سے بچائے۔ سموئیل نے بھیڑ کا بچہ لے کے اور اسے کل سوختنی قربانی کرکے خداوند کو گذرانا اور سموئیل بنی اسرائیل کے لئے خداوند کے حضور چلایا اور خداوند نے اس کی سنی اور جس وقت سموئیل اس سوختنی قربانی کو گذرانتا تھا تو فلسطینی جنگ کے لئے اسرائیل کے مقابل نزدیک آئے۔ تب خداوند فلسطینیوں کے اوپر اسی دن بڑی کڑک سے گرجا اور انہیں پریشان کیا اور انہوں نے بنی اسرائیل سے شکست کھائی اور اسرائیل کے لوگوں نے مصفاۃ سے نکل کر فلسطینیوں کو رگیدا اور بیت کر کے نیچے تک انہیں مارتے چلے گئے۔ تب سموئیل نے ایک پتھر لے کے اسے مصفاۃ اور شین کے بیچوں بیچ نصب کیا اور اس کا نام ابن عزر رکھا اور بولا کہ یہاں تک خداوند نے ہماری مدد کی سو فلسطینی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی زمین میں پھر نہ آئے اور خداوند کا ہاتھ سموئیل کے سب دنوں میں فلسطینیوں کے مخالف تھا۔ وہ بستیاں جو فلسطینیوں نے اسرائیل سے لے لی تھیں، عقرون سے لے کے جات تک اسرائیل کے قبضہ میں پھر آئیں اور اسرائیل نے ان کی نواحی بھی فلسطینیوں کے ہاتھ سے چھڑائی اور اسرائیل اور اموریوں میں صلح ہوئی۔ (سموئیل ۱، ۱۵-۷/۷) ..... سموئیل ۱ ۲۲-۱

اور ایسا ہوا کہ جب سموئیل بوڑھا ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو مقرر کیا کہ اسرائیل کی عدالت کریں اور اسکے پلوٹھے کا نام یوئیل تھا اور اس کے دوسرے بیٹے کا نام ابیاہ۔ وہ دونوں بیر سبع میں قاضی تھے۔ پر اسکے بیٹے اس کی راہ پر نہ چلے بلکہ نفع کی پیروی کرتے اور رشوت لیتے اور عدالت میں طرفداری کرتے تھے۔ تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کے رامہ میں سموئیل پاس آئے اور اسے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کیا کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے۔

لیکن وہ کلام جو انہوں نے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ کر جو حاکم ہو، سموئیل کی نظروں میں بُرا

معلوم ہوا۔ سموئیل نے خداوند سے دُعا مانگی اور خداوند نے سموئیل کو فرمایا کہ لوگوں کی آواز پر اور ان ساری باتوں پر جو وہ تجھے کہیں کان نہ دھر، کہ انہوں نے تجھ کو حقیر نہیں کیا بلکہ مجھ کو حقیر کیا ہے کہ میں ان پر سلطنت نہ کروں۔ مطابق ان سب کاموں کے جو انہوں نے اس دن سے کہ میں انہیں مصر سے نکال لایا اس روز تک مجھ سے کیا کہ مجھے ترک کیا اور دوسرے معبودوں کی بندگی کی ویسا ہی وہ تجھ سے کرتے ہیں۔ سو تو اُن کی بات سُن تو بھی ان پر گواہی دے کے انہیں خوب جتا دے اور انہیں بتلا کہ جو بادشاہ اُن پر سلطنت کرے گا اس کے عمل کس طور کے ہوں گے اور سموئیل نے ان لوگوں کو جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے خداوند کی ساری باتیں کہیں۔ اور اس نے کہا کہ اس بادشاہ کے جو تم پر سلطنت کرے گا اس طرح کے عمل ہوں گے کہ وہ تمہارے بیٹوں کو لے کے اپنے لئے اور اپنی گاڑیوں کے لئے اور اپنے ساتھ سوار ہونے کے لئے نوکر رکھے گا اور ان میں سے بعضے اس کی گاڑی کے آگے دوڑیں گے اور اپنے لئے ہزار ہزار کے رسالدار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا اور ان سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لئے جنگ کے ہتھیار اور اپنی گاڑیوں کے ساز بنوائے گا اور تمہاری بیٹیوں کو لے گا تاکہ وہ حلوائن، باورچن اور نان بائن ہوں اور تمہارے کھیتوں اور تمہارے تاکستانوں اور تمہارے زیتون کے باغوں کو جو اچھے سے اچھے ہوں گے، لے گا اور اپنے خدمت گزاروں کو بخش دے گا اور تمہارے کھیتوں اور انگوری باغوں کا دسواں حصہ لے کے اپنے خوجوں اور اپنے خادموں کو دے گا اور تمہارے چاکروں اور تمہاری لونڈیوں اور تمہارے اچھے اچھے شکیل جوانوں کو اور تمہارے گدھوں کو لے گا اور اپنے کام پر لگائیگا اور تمہاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔ سو تم اس کے غلام ہو گے اور تم اس دن اس بادشاہ کے سبب جسے تم نے اپنے لئے چنا ہے فریاد کرو گے، پر اُس دن خداوند تمہاری نہ سُنے گا۔

تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات سننے سے انکار کیا اور کہا نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو تاکہ ہم بھی اور سب گروہوں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہمارے لئے لڑائی کرے اور سموئیل نے لوگوں کی ساری باتیں سُنیں اور انہیں خداوند کے کانوں تک پہنچایا اور خداوند نے سموئیل کو فرمایا تو ان کی بات سُن اور ان کے لئے ایک بادشاہ مقرر کر تب سموئیل نے اسرائیل کے لوگوں کو کہا کہ ہر ایک اپنی

اپنی بستی کو جائے۔ (سموئیل اوّل ۷ ــ ۱۵/۷ ؛ ۱ ــ ۸/۲۲)

اس کے بعد لکھا ہے۔

اور جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا ہاں ہمیں ایک بادشاہ چاہیئے جو ہم پر سلطنت کرے حالانکہ خداوند خدا تمہارا بادشاہ تھا۔ اب دیکھو یہ تمہارا بادشاہ ہے جسے تم نے چُن لیا اور جس کے تم مشتاق تھے اور دیکھو خداوند نے تمہارے اوپر بادشاہ مقرر کیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے رہوگے اور اس کی بندگی کروگے اور اس کا حکم مانوگے اور خداوند کے فرمانوں سے سرکشی نہ کروگے تو تم اور بادشاہ جو تم پر بادشاہی کرتا ہے خداوند اپنے خدا کے پیرو ہوگے تو خیر پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانوگے اور خداوند کے فرمانوں سے سرکشی کروگے تو خداوند کا ہاتھ تمہارے مخالف ہوگا جس طرح کہ تمہارے باپ دادوں کا مخالف تھا۔

سو اب تم کھڑے رہو اور دیکھو وہ بڑا ماجرا جو خداوند تمہاری آنکھوں کے سامنے کرے گا۔ کیا آج گیہوں کاٹنے کا دن نہیں؟ میں خداوند سے منت کروں گا کہ بادل گرجے اور پانی برسائے، تاکہ تم جانو اور دیکھو کہ تم نے خداوند کے حضور ایک بادشاہ کے مانگنے سے بڑی شرارت کی چنانچہ سموئیل نے خداوند سے منت کی اور خداوند کی طرف سے اسی دن بادل گرج کر آیا اور پانی برسا تب خداوند سے اور سموئیل سے نپٹ ڈر گئے۔ تب سب لوگوں نے سموئیل سے کہا کہ اپنے خادموں کے لئے خداوند اپنے خدا کی منت کر ہم مر نہ جائیں کہ ہم نے اپنے سارے گناہوں پر یہ شرارت زیادہ کی کہ اپنے لئے ایک بادشاہ مانگا۔

تب سموئیل نے لوگوں کو کہا، خوف نہ کرو کہ یہ سب شرارت تو تم نے کی مگر خداوند کی پیروی سے کنارہ کشی مت کرو بلکہ اپنے سارے دلوں سے خداوند کی بندگی کرو اور تم کنارہ کشی نہ کرنا کہ باطل کی پیروی کرو جو مفید نہ ہوگی اور رہائی نہ دے گی کہ وہ سب باطل ہیں۔ کیونکہ خداوند اپنے بڑے نام کے لئے اپنے لوگوں کو ترک نہ کریگا کہ خداوند کی مرضی ہوئی کہ تم اس کی قوم ٹھہرو اور میں جو ہوں تو ہرگز نہ ہو کہ تمہارے لئے دعا مانگنے سے باز آ کے خداوند کا گنہگار رہوں۔ بلکہ میں وہ راہ جو اچھی اور سیدھی ہے تمہیں بتلاؤں گا۔ (سموئیل اوّل ۱۲ ــ ۱۲/۲۳)

جناب طالوت کے بعد حضرت داؤدؑ اور ان کے بعد حضرت سلیمانؑ بادشاہ ہوئے. یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوجِ کمال کا تھا. حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ان کی شوکت و ثروت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی. بیت المقدس کے ہیکل (مسجد) کی تعمیر اسی عہد میں ہوئی (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) لیکن اس کے بعد ان میں انحطاط کے آثار شروع ہو گئے. مصر کی زندگی میں ان میں وہ خرابیاں اور کمزوریاں تھیں جو محکومی کی زندگی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں. لیکن بایں ہمہ، بازآفرینی کی صلاحیت موجود تھی. اب وہ برائیاں پیدا ہوئیں جو قوت و دولت کے غلط استعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں، سرکشی، عدوان، معصیت کوشی، فتنہ و فساد، قتلِ انبیاءؑ، قوانینِ الٰہیہ کی جگہ انسانی قوانین کی ترویج، تحریفِ کتاب، علماء و مشائخ (احبار و رہبان) کا "روحانی تسلط" (برہمنیت) جو قوموں کے شجرِ حیات پر امر بیل کی طرح چھا جاتا ہے اور زندگی کے تمام جوہر چوس لیتا ہے، تشتّت و افتراق، تحزّب و تشیّع، باہمی رقابتیں، خانہ جنگی، نظری مسائل پر بحث و تمحیص، چند عقائد و رسوم کو ذریعۂ نجات سمجھ کر عمل سے بیگانگی، اپنے آپ کو اللہ کی چہیتی قوم تصور کر کے اقوامِ عالم پر (محض نسلی تفوّق کی بنا پر) افضلیت کا زعمِ باطل. نتیجہ یہ کہ وہی قوم جس نے فرعون جیسی قوتِ قاہرہ سے نجات حاصل کر کے صدیوں تک اپنی حکومت کا بے غل و غش سکہ چلایا تھا اور جو کبھی تمام اقوامِ عالم میں ممتاز و سرفراز سمجھی جاتی تھی، کبھی اہلِ بابل کی تاخت و تاراج کی آماجگاہ بنی، کبھی ایرانیوں کی غلامی میں پھنسی، کبھی رومیوں کی محکومیت کا طوقِ لعنت پہنا. ایں سوراندہ وآں سُودرماندہ. اور یہ سب اس لئے کہ انہوں نے قوانینِ الٰہیہ سے مُنہ موڑا اور اس عظیم الشان نعمت کی حفاظت نہ کی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر ارزاں فرمائی تھی.

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

دو بربادیاں

یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی ہر کڑی عبرت انگیز ہے لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں بربادی کی لعنت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی. (البتہ اس کے بعد مسلمانوں کے زوال نے انہیں بھی مات کر دیا ہے) قرآنِ کریم نے ان دو

لے یہودی لٹریچر میں نبی کے معنی کچھ اور بھی ہیں. اس کے لئے عنوان زیرِ نظر کے اخیر میں ہامان کے تحت دیکھئے.

مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہر بربادی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی، بلاجرم سزا انہیں ملی تھی۔

وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ٥ (۱۷/۴)

اور (دیکھو) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دیدی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔

تورات میں صحفِ یرمیاہ اور حزقیل میں بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ یہی وہ تباہیاں ہیں جن کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ٥ (۵/۷۸)

(چنانچہ دیکھو) بنی اسرائیل میں سے جو لوگ (حق سے) منکر ہوئے تھے' وہ (پہلے) داؤد اور (پھر) مریم کے بیٹے عیسیٰ کی زبانی لعنت[1] کئے گئے اور یہ اس لئے ہوا کہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے گزر گئے تھے۔

بخت نصر کا حملہ

ان میں سے پہلی تباہی بابل کے بادشاہ بنوکد نصر (بخت نصر) کے ہاتھوں ظہور میں آئی جس میں ۵۹۹ ق م میں یروشلم کی (جو یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز

---

[1] لعنت کے معنی انعامِ خداوندی سے محرومی کے ہیں۔ بنی اسرائیل کی تباہی کے متعلق انجیل متی (۲۳/۳۸) اور لوقا (۲۱/۲۴) اور زبور میں اشارات موجود ہیں۔ لوقا میں تو کھلے کھلے الفاظ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں قوموں کی ہلاکت کا ذکر کیا ہے اس سے مفہوم صرف یہ نہیں کہ وہ قومیں صفحۂ ارض سے مٹا دی گئیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض قوموں کے ساتھ ایسا بھی ہوا کہ وہ حوادثِ ارضی و سماوی سے مٹ ہی گئیں۔ لیکن قوموں کی ہلاکت کا مفہوم اس سے وسیع ہے۔ قرآن کی رُو سے وہ قومیں جن پر محکومی اور محتاجی کا رسوا کن عذاب مسلط ہوتا ہے ہلاک شدگان میں شمار کی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کی طبعی زندگی باقی ہوتی ہے یعنی ان کے افراد سانس لینے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ لیکن ان کی انسانی زندگی ختم ہو چکی ہوتی ہے اور یہ وہ عذاب ہے جو یکسر مٹا دینے والے عذاب سے کہیں شدید ہے۔

تھا) اینٹ سے اینٹ بجادی[1]۔ یہ قتل وغارت گری اور سلب ونہب کا ایسا جاں گداز مرقع تھا جو تاریخِ عالم میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت ہی تباہ ہوئی بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی اور غلامی و محکومی، ہلاکت و بربادی کی بڑی سے بڑی مصیبتیں جو کسی قوم پر آسکتی ہیں، سب یکجا جمع ہو گئیں۔

فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝ (۱۷/۵)

پھر جب ان دو وعدوں میں سے پہلا وقت آگیا تو (اے بنی اسرائیل) ہم نے تم پر ایسے بندے بھیج دیئے جو بڑے ہی خوفناک تھے۔ پس وہ تمہاری آبادیوں کے اندر پھیل گئے اور اللہ کا وعدہ تو اسی لئے تھا کہ پورا ہو کر رہے!

اس نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتلِ عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ سانحہ ایسا المناک اور یہ حادثہ ایسا دل سوز تھا کہ تورات میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے (مثلاً دیکھئے سلاطین دوم ۲۴/۱۰)۔ یہودیوں کے بابل کے اسیری کے زمانہ میں ان کے انبیاء، ان کی اس زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ دیکھئے "یرمیاہ نبی کا نوحہ" جس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:۔

> وہ بستی کیونکر خالی پڑی ہے جو خلائق سے بھری تھی! وہ بیوہ کی مانند ہو گئی۔ جو قوموں کے درمیان بزرگ اور صوبوں کے بیچ ملکہ تھی سو خراج گزار ہوئی۔ وہ رات کو زار زار روتی ہے اور اس کے آنسو اس کے رخساروں پر ہیں۔ اس کے یاروں میں سے کوئی نہیں جو اس کو تسلی دے۔ اس کے سارے دوستوں نے اس سے بے وفائی کی وہ اس کے دشمن ہو گئے۔ (یرمیاہ نبی کا نوحہ ۱-۱/۲)

یہ تباہی، یہود کے لئے پہلی تنذیر تھی۔ ان پر اس کا اچھا اثر ہوا اور ان کے دل ایک حد تک اطاعتِ خداوندی کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ ایک سو برس کے اندر اندر فارس کے تین بڑے شہنشاہ خورس، دارا اور ارتخششتا

---

[1] اس سے پہلے، شاہنشاہ سارگن SARGON - II کے زمانہ میں (۷۲۲ ق م میں) بھی بنی اسرائیل پر ایک آفت آئی تھی۔ (ملاحظہ ہو" کی تاریخ مصر ص ۵۲۹) لیکن من حیث القوم ان کی تباہی بخت نصر ہی کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔

دانیال، حجی اور عزیر نبی (میں سے کسی ایک) کی سفارش پر ان کی امداد کے لئے آمادہ ہوگئے۔ انہوں نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ہیکل کی تعمیر ۵۲۷ ق۔م میں شروع ہوکر ۵۱۵ ق۔م میں تکمیل کو پہنچی اور اس کے بعد آوارہ وطن یہودی' پھر سے اپنی اُجڑی ہوئی بستیوں میں آکر آباد ہونے شروع ہوگئے اور یوں ان کی مُردہ جماعت نے قریب ایک صدی کے انقلاب کے بعد دوبارہ زندگی حاصل کی (دیکھئے عزرا ۱/۲، ۱ و ۶/۱۵) قرآنِ کریم میں ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ (۱۷/۶)

پھر (دیکھو) ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے موافق کردی اور مال و دولت اور اولاد کی کثرت سے تمہاری مدد کی اور تمہیں (پھر) ایسا بنا دیا کہ بڑے جتھے والے ہوگئے۔

ملتِ یہودیہ کی موت اور بازآفرینی کی یہی داستان ہے جسے تورات میں حزقیل نبی کے خواب کے استعارہ میں بیان کیا گیا ہے۔

خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے اپنی روح میں اٹھالیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھرپور تھی مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے آس پاس چوگرد پھرایا اور دیکھ وہ وادی کے میدان میں بہت تھیں اور دیکھ وہ نہایت سوکھی تھیں اور اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا کہ اے خداوند یہوداہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوّت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیو تم خداوند کا کلام سنو۔ خداوند یہوداہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو میں تمہارے اندر روح داخل کروں گا اور تم جیو گی اور تم پر نسیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا اور تم میں دم ڈالوں گا اور تم جیو گی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں سو میں نے حکم کے بموجب نبوّت کی اور جب میں نبوّت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش ہوئی اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہوگئی۔ پھر ان میں روح نہ تھی تب اس نے مجھے کہا کہ نبوّت کر تو ہوا سے نبوّت

کرلے آدمزاد اور ہوا سے کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ اے سانس تو چاروں ہواؤں میں سے آ اور ان مقتولوں پر پھونک کہ وہ جئیں. سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور ان میں رُوح آئی اور وہ جی اٹھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے ایک نہایت بڑا لشکر تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدمزاد یہ ہڈیاں سارے اہلِ اسرائیل ہیں. دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہو گئے. اس لئے تو نبوت کر اور ان سے کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے میرے لوگو! میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا اور اے میرے لوگو! جب میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا تب جانو گے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی رُوح تم میں ڈالوں گا اور تم جیو گے اور میں تم کو تمہاری سرزمین میں بساؤں گا تب تم جانو گے کہ مجھ خداوند نے کہا اور پورا کیا. (حزقیل ایل ۱-۱۴/۳۷)

بنی اسرائیل کے "موت وحیات" کے اسی واقعہ کی طرف قرآنِ کریم نے سورۂ بقرہ میں تمثیلی انداز میں اشارہ کیا ہے. جہاں فرمایا.

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ...... فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۲/۲۵۹)

اور پھر اسی طرح اس شخص کی حالت پر بھی غور کرو جو ایک ایسی بستی پر سے گزرا تھا جس کے مکانوں کی چھتیں گر چکی تھیں اور گری ہوئی چھتوں پر در و دیوار کا ڈھیر تھا! (یہ حال دیکھ کر) وہ بول اٹھا، جس بستی کی ویرانی کا یہ حال ہے کیونکر ہو سکتا ہے کہ اللہ اسے موت کے بعد (دوبارہ) زندہ کردے؟" (یعنی دوبارہ آباد کردے).

پھر ایسا ہوا کہ اللہ نے اسے سو برس تک موت کی حالت میں رکھا: اس کے بعد اسے اٹھا دیا اور پوچھا، کتنی دیر اس حالت میں رہے؟ عرض کیا، ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ. ارشاد ہوا نہیں، بلکہ سو برس تک. پس اپنے کھانے اور پانی پر نظر ڈالو. ان میں برسوں تک پڑے رہنے کی کوئی علامت نہیں (یعنی ان میں کوئی ایسا تغیر نہیں ہوا ہے جس سے

معلوم ہو کہ بڑی مدت ان پر گذر چکی ہے) اور (اپنی سواری کے) گدھے پر بھی نظر ڈالو (کہ وہ کس حالت میں ہے؟) اور (یہ جو کچھ کیا گیا سو) اس لئے کیا گیا تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے (حق کی) ایک نشانی ٹھہرائیں (اور تمہارا علم ان کے لئے یقین و بصیرت کا ذریعہ ہو) اور تم جنین کی حالت پر غور کرو۔ کس طرح ہم (اس کا ڈھانچہ بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور پھر (کس طرح) اس (ڈھانچے) پر گوشت (کا غلاف) چڑھا دیتے ہیں (کہ ایک مکمل اور متشکل ہستی ظہور میں آجاتی ہے؟) پس جب اس شخص پر یہ حقیقت کھل گئی، تو وہ بول اٹھا میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں بلاشبہ اللہ ہر بات پر قادر ہے!

لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی نہج زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ اہلِ فارس کے زیرِ اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی، سکندر نے (۳۳۲ق۔م میں) اس پر ضربِ کاری لگائی۔ ان کا شیرازہ پھر منتشر ہونے لگا۔ پھر ۳۲۰ق۔م میں بطلیموس (PTOLEMY) نے مصر کے راستے حملہ کیا اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں آگیا اور یہودیوں پر سخت مظالم شروع ہوئے۔ حتیٰ کہ ۶۶ق۔م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہو گئی جس کا ذکر صحفِ یہود میں اور جس کے آثار ان کی پیشانیوں میں جھلک رہے تھے۔ یہ تباہی رومیوں کے ہاتھوں ظہور میں آئی۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ قف وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ط فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ○ (۱۷/۷)

اگر تم نے اچھے کام کئے، تو اپنے ہی لئے کئے اور اگر برائیاں کیں، تو بھی اپنے ہی لئے کیں پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا (تو ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو بھیج دیا) تاکہ (مار مار کر) وہ تمہارا حلیہ بگاڑ دیں اور اسی طرح (ہیکل کی) مسجد میں داخل ہو جائیں، جس طرح پہلی دفعہ حملہ آور گھسے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالیں۔

پامپی (رومی) بڑھا اور اس نے یوروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں قریب (۱۲،۰۰۰) یہودی تباہ ہو گئے۔ پھر ۵۱ق۔م کے قریب ایک اور یورش میں قریب (۳۰،۰۰۰) یہودی غلام بنا لئے گئے اور ڈھور

ڈنگروں کی طرح فروخت ہوئے. فطرت کی طرف سے انہیں اپنی بازآفرینی کا ایک آخری موقع دیا گیا اور ان میں حضرت عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر رسول مبعوث ہوئے. لیکن انہوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے. اس اتمامِ حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آگیا. چنانچہ رومیوں کے گورنر طیطوس (ٹائٹس) نے ۷۰ء میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس سوختہ بخت قوم پر اجتماعی ہلاکت کی مہر ثبت کردی.

عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر از مآلِ اُمتِ موسیٰؑ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز را ز دست رشتۂ جمعیتِ ملت شکست
قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے

جرائم کی فہرست

اب دیکھئے کہ ان پر اس ذلت و خواری، بےکسی و بےبسی، نکبت و ادبار، غلامی و محکومی، ذل و مسکنت کا عذاب کن جرائم کی پاداش میں مسلط ہوا؟ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ان جرائم کا ذکر آیا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے عہدِ رسالتمآبؐ تک ان سے سرزد ہوتے چلے آرہے تھے. ان جرائم کی فہرست طویل ہے. لیکن اصل جرم صرف ایک ہی ہے یعنی قوانینِ الٰہیہ سے سرتابی. باقی سب اسی اصل کی شاخیں یا اسی اجمال کی تفصیل ہیں.

وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ع (۵/۴۳)

"اور ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا فیصلہ ہے، لیکن یہ اس کے بعد پھر جاتے ہیں اور یہ مومن نہیں". پیغامِ خداوندی کا اتباع تو کجا، ان کی قساوتِ قلبی کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ انبیاء تک کو قتل کر دیا کرتے تھے[1] (دیکھئے ۲/۸۷؛ ۵/۷۰؛ ۴/۱۵۵).

---

[1] یہود کے قتلِ انبیاء کا ذکر بائبل کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے. حضرت مسیحؑ نے ان کی تباہی و بربادی کا بہت بڑا سبب اسی جرمِ عظیم کو قرار دیا ہے. فرمایا.

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے. کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانہ میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے. اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

"قتلِ انبیاء" کے بعد ان کا دوسرا جرم یہ تھا کہ وہ کبھی عہد کی پابندی نہیں کرتے تھے۔

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(۲/۱۰۰)

(اور یہ لوگ جو آج دعوتِ حق کی مخالفت کر رہے ہیں تو غور کرو، اس سے پہلے ان لوگوں کی روش کیسی رہ چکی ہے؟) جب کبھی ان لوگوں نے عہد کیا، تو کسی نہ کسی گروہ نے ضرور اسے پسِ پشت ڈال دیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں بڑی تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے دل سچے ایمان سے خالی ہیں!

ثواب کا ایک عجیب کام

فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے اور اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز یہ کہ باہمی خونریزی تک اُتر آیا کرتے تھے۔ آپس میں جنگ و جدال کرتے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کو نکال باہر کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ستم ظریفی یہ کہ قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑانے میں ثواب بھی سمجھتے، یعنی ان کے نزدیک، نیکی اور بدی کے دو الگ الگ شعبے تھے، ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق۔ جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ انسانوں کا خون چوسنے والے، مویشیوں کے پانی پینے کے استھان بنواتے اور کیڑے مکوڑوں کے لئے خوراک کا سامان فراہم کرتے رہتے ہیں[۱]۔ اپنوں کو گھروں سے نکال دینا اور جب وہ یوں دوسروں

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) فرزند ہیں بزعم اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو، اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟ اس لئے دیکھو، میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنے عبادتخانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بشہر ستاتے پھرو گے تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریاہ کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانہ کے لوگوں پر آئے گا۔

اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے انہیں سنگسار کرتی ہے! کتنی ہی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں۔ مگر تم نے نہ چاہا۔ (متی ۲۹ ـــ ۲۳/۳۷)

[۱] تقسیم ہند سے پہلے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہندو اس قسم کے "پُن" (ثواب) کے کام کیا کرتے تھے۔

کی قید میں گرفتار ہو جائیں تو انہیں فدیہ دے کر چھڑا لینا اور سمجھ لینا کہ یہ بڑے ثواب کا کام ہے، خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے درخت کو جڑ سے کاٹ دینا اور اس کے پتوں پر پانی چھڑکنا کسی توضیح کا محتاج نہیں۔ خود ہم بھی آج یہی کچھ کرتے ہیں۔ ایک طرف غلط نظام کی ترویج سے قوم کی مفلسی و محتاجی کے اسباب پیدا کرنے میں ممد و معاون بننا اور دوسری طرف صدقات و زکوٰۃ سے محتاجوں اور مفلسوں کی مدد کرنا' اسی قبیل کا "ثواب" ہے۔ بنی اسرائیل کے متعلق سورۃ بقرہ میں ہے۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ...... وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝[۱] (۲/۸۵)

تم وہ قوم ہو جس کے افراد ایک دوسرے کو بے دریغ قتل کرتے ہیں اور ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف جتھا بندی کر کے اسے اس کے وطن سے نکال باہر کرتا ہے (اور تم میں سے کسی کو بھی یہ بات یاد نہیں آتی کہ اس بارے میں خدا کی شریعت کے احکام کیا ہیں؟) لیکن پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ تمہارے جلا وطن کئے ہوئے آدمی دشمنوں کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں' اور قیدی ہو کر تمہارے سامنے آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہیں (اور کہتے ہو' شریعت کی رُو سے ایسا کرنا ضروری ہے) حالانکہ (اگر شریعت کے حکموں کا تمہیں اتنا ہی پاس ہے' تو) شریعت کی رُو سے تو یہی بات حرام تھی کہ انہیں ان کے گھروں اور بستیوں سے جلا وطن کردو (اور ان کے خلاف ظلم و معصیت سے جتھا بندی کرو۔ پھر یہ گمراہی کی کیسی انتہا ہے کہ قیدیوں کے چھڑانے اور ان کے فدیہ کے لئے مال جمع کرنے میں تو شریعت یاد آجاتی ہے لیکن اس ظلم و معصیت کے وقت یاد نہیں آتی جس کی وجہ سے

۱؎ یہ آیتِ جلیلہ ایک عظیم الشان حقیقت کی حامل ہے جس سے یہ راز بے نقاب ہو جاتا ہے کہ آج مسلمان اس قدر ذلیل و خوار کیوں ہے؟ کسی غیر خدائی نظام میں قرآنی نظام کی بعض جزئیات کا پیوند لگا کر سمجھ لینا کہ یہ روشِ زندگی دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی کا باعث ہے' سب سے بڑا دھوکا ہے۔ تؤمنون ببعض الکتٰب و تکفرون ببعض کا طرزِ عمل دنیا و آخرت کی کامیابی نہیں، بلکہ دونوں میں روسیاہی کا موجب ہے۔ "خزی فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم القیٰمۃ یردّون الی اشدّ العذاب"۔ لیکن اس کی تفصیل اس جگہ نہیں' اپنے مقام پر آئے گی (انشاء اللہ)۔

وہ دشمنوں کے ہاتھ پڑے اور قید ہوئے ؟) کیا یہ اس لئے ہے کہ کتابِ الٰہی کے ایک حصہ پر تم ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ یاد رکھو تم میں سے جن لوگوں کے اعمال کا یہ حال ہے، اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ذلت و رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب ! یاد رکھو، اللہ (کا قانونِ جزا و سزا) تمہارے اعمال کی طرف سے غافل نہیں ہے۔

ایک اور بڑی لعنت یہ تھی کہ ان کی سوسائٹی میں عیوب اس قدر عام ہو چکے تھے کہ کوئی شخص کسی کو بد عملی سے روکتا ہی نہیں تھا۔ جب کسی سوسائٹی کی حالت یہ ہو جائے کہ بُرائی پر ملامت کرنے والا کوئی نہ رہے تو اس قوم کے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہا کرتی۔ وہ جس بُرائی میں ایک مرتبہ پڑ جائے اس سے پھر باز ہی نہیں آسکتی۔

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۵/۷۹ نیز ۵/۶۳)

وہ برائیوں میں (ایک مرتبہ) پڑ جاتے تو پھر اس سے باز نہیں آتے۔ یہ بجائے خویش بہت بڑی برائی تھی جو وہ کیا کرتے تھے۔

برائیوں سے روکنے کے بجائے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے، سود خوار تھے اور حرام خور۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۴/۱۶۰-۱۶۱)

الغرض یہودیوں کے اس ظلم کی وجہ سے ہم نے (کئی ایک) اچھی چیزیں ان پر حرام کر دیں جو (پہلے) ان کے لئے حلال تھیں اور نیز اس وجہ سے کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہت روکنے لگے تھے۔ نیز ان کی یہ بات کہ ربٰو لینے لگے، حالانکہ اس سے روک دیئے گئے تھے اور یہ کہ ناجائز طریقوں پر لوگوں کا مال کھانے لگے (حالانکہ انہیں ہر حال میں اور ہر انسان کے ساتھ راستی اور دیانت برتنے کا حکم دیا گیا تھا) اور (یاد رکھو) ان میں جو لوگ (اس طرح احکامِ حق کے) منکر ہو گئے، تو ہم نے ان کے لئے (پاداشِ عمل میں) عذابِ دردناک تیار کر رکھا ہے !

سورۂ مائدہ میں ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ (۵/۴۲)

یہ لوگ جھوٹ کے لئے کان لگانے والے اور بُرے طریقوں سے مال کھانے میں بیباک ہیں۔

حتّٰی کہ دین فروش بھی۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا .... وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۷/۱۶۹)۔

پھر ان لوگوں کے بعد ناخلفوں نے ان کی جگہ پائی اور کتابِ الٰہی کے وارث ہوئے۔ وہ (دین فروشی کر کے) اس دنیائے حقیر کی متاع (بے تأمل) لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اُسکی تو ہمیں معافی مل ہی جائے گی"۔ اور اگر کوئی متاع انہیں اس طرح (فریقِ ثانی سے) ہاتھ آجائے، تو اسے بھی بلاتأمل لے لیں۔ کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا ہے کہ خدا کے نام سے کوئی بات نہ کہیں مگر وہی جو سچ ہو اور جو کچھ کتاب میں حکم دیا گیا ہے، وہ پڑھ نہیں چکے ہیں؟ جو متقی ہیں ان کے لئے تو آخرت کا گھر (دنیا اور دنیا کی خواہشوں سے) کہیں بہتر ہے (وہ دنیا کے لئے اپنی آخرت تاراج کرنے والے نہیں۔ اے علمائے یہود!) کیا اتنی سی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی؟

طبائع کی مطلق العنانی کا یہ عالم تھا کہ تھوڑا سا ضبطِ نفس بھی ان پر گراں گزرتا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ سبت[1] کے دن شکار نہ کریں۔ لیکن یہ مختلف حیلوں سے اس حکم سے سرتابی کرتے۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ

---

[1] سبت ان کے لئے دراصل تعطیل کا دن تھا۔ لیکن اس کے تقدس کے لئے تورات میں (حسبِ معمول) عجیب سی توجیہہ بیان ہوئی ہے۔ خروج ۲۰/۱۱ میں ہے۔

کیونکہ خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین، دریا اور سب کچھ جو ان میں ہے بنایا اور ساتویں دن آرام کیا۔ اس لئے خداوند نے سبت کے دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا۔ (خروج ۲۰/۱۱)

لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ (۷/۱۶۳)

اور بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارے میں پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھا اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے۔ سبت کے دن ان کی (مطلوبہ) مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی ان کے پاس آجاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے، نہ آتیں۔ وہ سبت کے ضابطہ کو علی الرغم توڑ کر مچھلیاں پکڑ لیتے اور اس طرح قانون سے سرکشی اختیار کرتے جس کا نتیجہ تباہی تھا۔

ہفتہ میں ایک دن کے کاروباری ناغہ کی بنیاد معاشی تھی اور چونکہ اس نے ایک قسم کے بین القبائلی قانون کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اس لئے اس کا احترام ضروری قرار دیا گیا تھا۔ لیکن مفاد پرستانہ ذہنیت اس قسم کے قوانین کی خلاف ورزی میں اپنی منفعت دیکھتی ہے۔ جو شخص اس دن دکان کھلی رکھے جب عام مارکیٹ بند ہو تو اس کے ہاں یقیناً گاہکی زیادہ ہوگی۔ لیکن اس معروف قانون کی خلاف ورزی سے، جو معاشی نظام میں نقص پیدا ہوگا، وہ ظاہر ہے۔ بہرحال، یہ بات ضمناً سامنے آگئی ہے۔ اب پھر اسی سلسلہ کی طرف لوٹئے۔ یہود کی کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ خدا کی طرف سے عائد شدہ پابندیوں کے توڑنے میں اس قدر بے باک تھے۔ لیکن خود ساختہ پابندیوں پر بڑی سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ اللہ کی راہ سے بھٹکنے والی ہر قوم کی یہی حالت

انسانی قوانین کا اتباع

ہوتی ہے کہ وہ قوانینِ الٰہیہ کو پس پشت ڈال دیتی ہے اور خود ساختہ رسومات پر شریعت کا لیبل لگا کر انہیں بڑی شدت سے مانتی اور منواتی ہے۔ یہ قوانین ان کے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی طرف سے وضع ہوتے تھے اور قوم قوانینِ خداوندی کی جگہ انسانوں کے انہی قوانین و ضوابط کا اتباع کرتی تھی۔ یہی وہ شرک تھا جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱)

انہوں نے اللہ سے ورے ہی اپنے احبار و رہبان کو اپنا رب بنا لیا۔

اور خود احبار و رہبان کی حالت یہ تھی کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ

يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (۹/۳۴)۔

مسلمانو! یاد رکھو (یہودیوں اور عیسائیوں کے) علماء و مشائخ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق و ناروا کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انہیں روکتے ہیں اور جو لوگ چاندی سونا اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے، تو ایسے لوگوں کو عذابِ دردناک کی خوشخبری سُنا دو۔

حالت تو یہ تھی، لیکن چاہتے یہ تھے کہ ساری دنیا ان کی تعریف کرے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۳/۱۸۷)

(اے پیغمبر!) جو لوگ اپنے کرتوتوں پر خوش ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں کے لئے سراہے جائیں جو انہوں نے کبھی نہیں کئے، تو تم ہرگز ایسا نہ سمجھنا کہ وہ (آنے والے) عذاب سے بچے رہیں گے۔ نہیں، یقیناً ان کے لئے رسوا کُن عذاب ہے!

ظاہر ہے کہ اس قسم کی جھوٹی تعریف و ستائش حاصل کرنے کے لئے انہیں کس قسم کی نمائشوں اور حیلہ جوئیوں سے کام لینا ہوتا ہوگا؟

کسی قوم کی اجتماعیت اور مرکزیت کے برباد ہونے کا سب سے بڑا سبب اس کے باہمی اختلافات ہوتے ہیں۔ اللہ کی کتاب کا اوّلین مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے باہمی اختلافات کو رفع کرکے انہیں ایک مرکز پر جمع کر دے لیکن اگر کوئی قوم کتاب اللہ العلم کے باوجود اختلاف پر اُتر آئے تو ان کی ہلاکت میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ ہر مٹنے والی قوم کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ یہی کچھ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا۔

وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِیْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۱۰/۹۳)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اپنے وعدہ کے مطابق فلسطین میں) بسنے کا بہت اچھا ٹھکانا دیا تھا

اور پاکیزہ چیزوں سے ان کی روزی کا سامان کر دیا تھا۔ پھر جب کبھی انہوں نے (دینِ حق کے بارے میں) اختلاف کیا، تو علم کی روشنی ضرور ان پر نمودار ہو گئی (یعنی ان میں یکے بعد دیگرے نبی مبعوث ہوتے رہے)۔ یوم مکافات کو تمہارا پروردگار ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرتا ہے گا، جن میں باہم اختلاف... کرتے رہے ہیں۔

ضد کی بنا پر اختلافات

یہ اختلافات کسی اصول پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ باہمی ضد اور تعصب کی بنا پر ہوتے ہیں۔

وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۴۵/۱۷﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو امرِ حق کی کھلی کھلی نشانیاں دے دی تھیں مگر پھر بھی انہوں نے محض باہمی ضد اور عداوت کی بنا پر (دینِ حق کے بارے میں) اس کے بعد اختلاف کیا جب کہ علم کی روشنی ان پر نمودار ہو چکی تھی (یعنی سلسلۂ رشد و ہدایت مسلسل جاری رہا لیکن پھر بھی وہ متفق نہ ہوئے)۔ یوم مکافات کو تمہارا پروردگار ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے رہتے تھے۔

ان اختلافات کے رفع کرنے کی بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں ہوتی کہ انسان اپنے تمام رجحاناتِ قلبی و ذہنی اور خود ساختہ معتقدات و نظریات کو الگ رکھ کر کتاب اللہ کی طرف لوٹ آئے کہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) کتاب اللہ کا مقصد اختلافات کو دُور کرنا ہوتا ہے۔ لیکن جو قوم کتاب اللہ کو محض "حصولِ ثواب" کی خاطر الگ رکھ چھوڑے اور اپنی زندگی انسانوں کے وضع کردہ آئین و دستور کے مطابق چلائے تو اس کے اختلافات کس طرح مٹ سکتے ہیں؟ یہود نے کتاب اللہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئیگا۔ لیکن اتنا تو ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے باہمی ضد سے اختلافات پیدا کر رکھے تھے اور پیغامِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اپنے علماء و مشائخ کی وضع کردہ شریعت کو عین دین سمجھ رکھا تھا۔ یہی ان کی تباہی کا موجب تھا۔ ان علماء و مشائخ کی حالت یہ تھی کہ کتاب اللہ کی صاف اور سیدھی سادی تعلیم کو عملی مسائلِ حیات میں راہ نما بنانے کے بجائے لفظی مناظروں اور مباحثوں میں اُلجھ کر" انبار در انبار کتبِ دینیہ" تصنیف

کرتے چلے جاتے تھے۔ اسی کا نام " دین کی خدمت" تھا۔ یہ دینی خدمت ایسے ہی ہے جیسے (قرآنِ کریم کی بیان کردہ مثال کے مطابق) کسی گدھے پر کتابوں کا بوجھ لاد دیا جائے اور وہ دعویٰ کرتا پھرے کہ دین میری ہی وجہ سے قائم ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۶۲/۵)

اور دیکھو ان لوگوں کی مثال جو تورات کے حامل کہلاتے ہیں مگر اس) کے احکام اور شرائع) پر عمل نہیں کرتے' اس گدھے جیسی مثال ہے جو (بڑی بڑی کتابیں .. .. (اپنی پشت پر) لادے ہوئے ہو۔ کیسی بُری مثال ہے ان لوگوں کی جو اللہ کے (احکام اور احکام کے متعلق) آیات کو جھٹلاتے رہتے ہیں اور (یاد رکھو) خدا نافرمان لوگوں کو کبھی (سیدھی) راہ نہیں دکھایا کرتا (کہ یہی اس کا قانون ہے)۔

پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ اور عملی زندگی، انسانیت سے گری ہوئی! کتنا فرق ہے لفاظی اور عمل میں بقول علامہ اقبالؒ ؎

قلندر جز دو حرفِ لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

باہمی تکذیب و تنقیص

باہمی اختلافات کے علاوہ' ان کی یہ حالت تھی کہ اپنی ساری قوتیں' اپنی تعمیر کے بجائے دوسروں کی تخریب و تکذیب میں صرف کرتے تھے۔ یہودی اور نصرانی دراصل ایک ہی اصل کی دو شاخیں تھیں۔ لیکن یہ دونوں آپس میں ہمیشہ مصروفِ پیکار رہتے تھے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَىْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ...... (۲/۱۱۳)

یہودی کہتے ہیں، عیسائیوں کا دین کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے۔ حالانکہ دونوں اس کے مدعی ہیں کہ ان کے پاس خدا کی کتاب ہے۔

ایک دوسرے کی تکذیب و تنقیص کرتے تھے اور خود دونوں ایک ہی قسم کے شرک میں مبتلا تھے۔

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ۣابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ یُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ ۝ (۹/۳۰)

اور یہودیوں نے کہا، عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی باتیں ہیں، محض ان کی زبان سے نکالی ہوئی (ورنہ سمجھ بوجھ کر کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتا)۔ ان لوگوں نے بھی انہی کی سی بات کہی جو ان سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان پر اللہ کی مار! یہ کدھر کو بھٹکے جا رہے ہیں۔

نجات بلا اعمال

دنیا میدانِ سعی و عمل ہے۔ یہاں زندہ وہی رہ سکتا ہے، جس میں (قانونِ خداوندی کے مطابق) زندہ رہنے کی آرزو ہو۔ آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو۔ تنازع للبقاء (Struggle for existence) یہاں کے ذرہ ذرہ کا شیوۂ زندگی ہے۔ لیکن جس قوم میں قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیتی ہے کہ انہیں کسی جدوجہد اور تگ و تاز کی ضرورت نہیں۔ وہ خدا کی چہیتی قوم ہے۔ نہ ان پر کوئی مصیبت آسکتی ہے، نہ عذاب طاری ہو سکتا ہے۔ ان کی فلاح و سعادت کے لئے یہ کافی ضمانت ہے کہ وہ ایک خاص قسم کا نام رکھتے ہیں اور خاص تراش خراش کا لباس پہنتے ہیں۔ اس سے زیادہ انہیں کچھ اور کی ضرورت نہیں۔ وہ خود فریبی کی اس جنت الحمقا میں آنکھیں بند کر کے پڑے رہتے ہیں اور کبھی اتنا دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ فطرت کے اس قانون کے ماتحت وہ کس طرح ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے تک جا پہنچے ہیں۔ یہی حالت یہود کی ہو چکی تھی۔ ان کا ادّعا یہ تھا کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ (۵/۱۸) "ہم اللہ کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں"۔ اس لئے ان کا زعمِ باطل یہ تھا کہ انہیں دنیا کی ذلت و خواری تو ایک طرف، عاقبت میں بھی (سوائے چند دنوں کے، جو ان کے عقیدہ کے مطابق وہ چالیس دن تھے جن میں انہوں نے گوسالہ پرستی کی تھی یا دوسرے اقوال کے مطابق گیارہ ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کا عرصہ) عذاب چھو نہیں سکتا۔

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ

عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۸۰)

یہ لوگ (یعنی یہودی)، کہتے ہیں، جہنم کی آگ ہمیں کبھی چھونے والی نہیں (کیونکہ ہماری اُمّت خدا کے نزدیک نجات یافتہ اُمّت ہے)، اگر ہم آگ میں ڈالے جائیں گے تو (اس لئے نہیں کہ ہمیشہ عذاب میں رہیں، بلکہ) صرف چند دنوں کے لئے. ان لوگوں سے کہہ دو، یہ بات جو تم کہتے ہو (دو حالتوں سے خالی نہیں یا تو) تم نے خدا سے (غیر مشروط) نجات کا کوئی پٹہ لکھوا لیا ہے کہ اب وہ اس کے خلاف جا نہیں سکتا اور یا پھر تم خدا کے نام پر ایک ایسا بہتان باندھ رہے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم (یا سند) نہیں!

جنّت کے واحد مالک

وہ تو بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے اور کہتے کہ جنّت کے واحد مالک ہم ہی ہیں. ہمارے علاوہ کوئی دوسرا جنّت میں جا ہی نہیں سکتا۔[1]

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۲/۱۱۱)

اور یہودی کہتے ہیں، جنّت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو۔ اسی طرح عیسائی کہتے ہیں، جنّت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ عیسائی نہ ہو (گویا جنّت انہی کے باپ دادا کی میراث یا جاگیر ہے. اے پیغمبرؐ! یہ ان لوگوں کی (جاہلانہ) امنگیں اور آرزوئیں ہیں، نہ کہ حقیقتِ حال ہے. تم ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو، تو ثابت کرو. تمہارے اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟

اپنی نجات کے متعلق انہوں نے عجیب و غریب عقائد وضع کر لئے تھے. ان کی مقدّس کتاب، تالمود میں ہے کہ

---

[1] جنّت کیونکہ اتباعِ قرآن سے مشروط ہے اور اس میں اور یہود و نصاریٰ کے مذکورہ صدر دعوے میں کیا فرق ہے، اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی

آخرت میں (حضرت) ابراہیمؑ جہنم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اب رہے ایسے اسرائیلی جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے، سو ان کے لئے وہ ایک کام کریں گے۔ وہ ان بچوں کے ختنہ کی کھال اتار کر، جو ختنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے، اس قسم کے اسرائیلیوں کے مقامِ ختنہ پر چپکا دیں گے اور اس طرح انہیں نا مختون بنا کر جہنم میں (چند دنوں کے لئے) بھیج دیں گے۔ (تالمود ص ۴۰۴)

لیکن ان اسرائیلیوں پر جہنم کی آگ بالکل اثر نہیں کرے گی۔ ان کا جہنم میں داخلہ محض ایک رسم (formality) پورا کرنے کے لئے ہوگا۔

جہنم کی آگ کا اسرائیلی گناہ گاروں پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ (ایضاً ص ۶۰۵)

اور اس کی وجہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں یہ لکھی ہے۔

اسرائیلی گناہ گاروں کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ وہ جہنم کے دروازہ پر گناہوں کا اقرار کریں گے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (جلد پنجم صفحہ ۵۸۳)

ان بیانات میں باہمی تضاد بھی ہے۔ لیکن نفسِ عقیدہ قابلِ غور ہے۔ پھر محض اُخروی نجات ہی کے لئے نہیں بلکہ، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، دنیاوی زندگی میں سرفرازی و سربلندی کے لئے بھی ذاتی سعی و عمل کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ یہود کے عقیدہ کے مطابق

بعض کو عزت ان کے آباؤ اجداد کے اعمالِ حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کے آنے والی نسلوں کے اعمال کے صدقہ میں۔ (جلد ششم، ص ۶۰)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ "یہودیوں کی اُمیدوں کا مرکز ان کے آباؤ اجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ (حضرت) ابراہیمؑ ہمارے جدِّ امجد ہیں۔" اسی طرح انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس میں مذکور ہے کہ "یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کر لئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں نجات و سعادت آجائے گی۔" (ج ۱۱/۱۴۴)

اندھی تقلید جب زندگی سے متعلق تصورات اس قسم کے قائم ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ پھر تلاشِ حقیقت کی کوئی تڑپ سینہ میں باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ لوگ ہدایت کی کوئی ضرورت ہی

نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے اسلاف کی اندھی تقلید میں جس روش پر چلے جارہے تھے اسی کو صراطِ مستقیم سمجھتے تھے اس لئے اس پر کبھی غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کرتے کہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھ تو لیں کہ جس راہ پر چلے جارہے ہیں وہ نجات وسعادت کی راہ ہے یا بربادی وتباہی کا راستہ۔ اسی لئے وہ کہتے تھے کہ ہمارے دل پر کسی پیغام یا نصیحت کا کوئی اثر ہی نہیں ہو سکتا! اور اثر ہوتا بھی کس طرح؟ اثر تو اس پر ہوتا ہے جو اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو۔

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ۝

(۲/۸۸ نیز ۴/۱۵۵)

اور (یہ لوگ اپنے جمود اور بے حسی کی حالت پر فخر کرتے ہیں اور) کہتے ہیں' ہمارے دل تہ در تہ غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں (یعنی اب کسی نئی بات کا اثر ان تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ یہ اعتقاد کی پختگی اور حق کا ثبات نہیں ہے جو قابلِ تعریف ہو) بلکہ انکارِ حق کے تعصب کی پھٹکار ہے (کہ حق بات سننے اور اثر پذیر ہونے کی استعداد ہی معدوم ہوگئی اور) اسی لئے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ دعوتِ حق سنیں اور قبول کریں۔

اسی بنا پر انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی حیات بخش دعوت کو ٹھکرادیا۔ اور اس سے آگے بڑھے تو قرآنِ کریم کے انقلاب آفریں پیغام کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے تک سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے زعمِ باطل میں اس قدر مست تھے کہ وہ اپنی روش کو حق وباطل کے معیار پر پرکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے۔

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝ (۲/۸۹)

چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی ہدایت کے لئے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی مصدق تھی جو ان سے انبیاء کو ملی تھی' تو باوجودیکہ وہ (تورات کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے ظہور کے منتظر تھے اور) کافروں کے مقابلہ میں اس کا نام لے کر فتح ونصرت کی دعائیں مانگتے تھے، لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آگئی' تو صاف انکار کر گئے (اور اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی)۔ پس ان لوگوں کے لئے جو دیدہ ودانستہ کفر کی راہ اختیار کریں'

اللہ کی طرف سے محرومی ہے (اور اس کا قانون یہی ہے کہ ایسوں پر فلاح وسعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی!)۔

حالانکہ قرآنِ کریم انہیں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ تمہارا زعم باطل ہے۔ دنیا میں کوئی قوم چہیتی نہیں ہو سکتی۔

وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ بَلٰى ۗ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۧ (۱۱۱-۱۱۲/۲)؛

اور یہودی کہتے ہیں، جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ یہودی نہ ہو اور اسی طرح عیسائی کہتے ہیں، جنت میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا جب تک عیسائی نہ ہو (گویا جنت انہی کے باپ دادا کی میراث یا جاگیر ہے، اے پیغمبر!) یہ ان لوگوں کی (جاہلانہ) امنگیں اور آرزوئیں ہیں نہ کہ حقیقتِ حال ہے۔ تم ان سے کہو' اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو تو ثابت کرو۔ تمہارے اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جنت کی راہ تمام بنی نوع انسان کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ جس کسی نے بھی قوانینِ خداوندی[لہ] کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس نے حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر ضرور پائے گا۔ نہ تو اس کے لئے کسی طرح کا کھٹکا ہے نہ کسی طرح کی غمگینی!

اس اصول کی وضاحت کے بعد ان سے کہا گیا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں واقعی آخرت میں عذاب نہیں چھو سکتا (اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ آخرت کی زندگی جس میں عذاب نہ ہو موجودہ زندگی سے بدرجہا اچھی ہے) تو پھر موت کے تصور تک سے تمہاری جان کیوں جاتی ہے؟ ایسی محبوب زندگی کی تو تمنا کرنی چاہیئے!

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ (۲/۹۴)

(یہ لوگ کہتے ہیں کہ جنت صرف انہی کے حصہ میں آئی ہے) تم ان سے کہو' اگر آخرت کا گھر خدا کے نزدیک' صرف تمہارے ہی لئے ہے اور کسی انسان کا اس میں حصہ نہیں' اور تم اپنے اس اعتقاد میں

لہ یہ قوانین اپنی اصلی شکل میں قرآنِ کریم کے اندر ہیں۔

سچے ہو، تو (تمہیں دنیا کی جگہ آخرت کا طلبگار ہونا چاہیئے۔ پس بے خوف ہو کر) موت کی آرزو کرو۔
اس کے ساتھ ہی فرمادیا کہ[1]

وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲/۹۵)

اور اے پیغمبر! تم دیکھ لوگے کہ یہ لوگ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے جن کا ذخیرہ جمع کر چکے ہیں، کبھی ایسا کرنے والے نہیں اور اللہ ظلم کرنے والوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

جن لوگوں پر دنیاوی محبت اس درجہ غالب آچکی ہو وہ موت کی تمنا کس طرح کر سکتے ہیں؟

وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ؑ (۲/۹۶ نیز ۲/۸۶)

اور پھر اتنا ہی نہیں، بلکہ تم دیکھو گے، زندگی کی سب سے زیادہ حرص رکھنے والے یہی لوگ ہیں، مشرکوں سے بھی زیادہ (ان مدعیانِ توحید کے دلوں میں دنیاوی مفاد کا عشق ہے) ان میں سے ایک ایک آدمی کا دل یہ حسرت رکھتا ہے کہ کاش ایک ہزار برس تک جیتے! حالانکہ (یہ لوگ کتنے ہی زیادہ عرصہ تک جئیں، بہر حال ایک دن مرنا ضرور ہے اور) عمر کی درازی انہیں عذابِ آخرت سے نجات نہیں دلادے گی، اور جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کی نظر سے مخفی نہیں ہے۔

ان پر تو موت کی ہیبت اس طرح چھا جاتی ہے کہ اس کے تصور سے ان کی روح میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔
حالانکہ موت ایک ایسا یقینی حادثہ ہے جسے واقع ہو کر رہنا ہے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؑ (۶۲/۸)

(ان سے) کہو کہ وہ موت جس سے تم (یوں) بھاگتے ہو، ایک دن آکر رہے گی۔ پھر تم اس خدا کی طرف جاؤ گے جو غیب و حاضر کا جاننے والا ہے (اس کی طرف اس لئے لوٹو گے کہ) وہ تمہیں بتادے جو کچھ تم کیا

---

[1] اسی کو ۶-۷/۶۲ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے ان آیات میں ایک عظیم الشان اصول کو واضح کیا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاءاللہ۔

کرتے تھے۔

لیکن یہ تو صرف مومن کی شان ہے کہ

چو مرگ آید، تبسم بر لب اوست

ایسی قومیں، جو اپنی خودی کو متاعِ دنیاوی کے عوض بیچ چکی ہوں (دیکھئے ۲/۸۶) ان میں یہ جرأت کہاں کہ موت کا استقبال عروسی شان سے کریں۔ یہود کی تو یہ حالت ہو چکی تھی کہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ (۲/۲۴۳)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کی سرگذشت پر غور نہیں کیا جو اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور باوجودیکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے' مگر (دلوں کی بے طاقتی کا یہ حال تھا کہ) موت کے ڈر سے بھاگ گئے تھے؟ (یعنی باوجود کثرتِ تعداد کے' انہوں نے حملہ آور دشمن کا مقابلہ نہیں کیا تھا اور اپنا گھر بار چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی تھی۔ جب ان بزدلوں نے ایسا کیا) تو اللہ کا حکم ہوا (تم موت کے ڈر سے بھاگ رہے ہو' تو دیکھو) اب تمہارے لئے موت ہی ہے۔ (یعنی ان کی بزدلی کی وجہ سے دشمن ان پر غالب آگئے اور زندگی و کامرانی کی برکتوں سے محروم ہو گئے) لیکن جب انہوں نے راز کو پا لیا کہ زندہ وہی رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا تو ان میں ہمت پیدا ہو گئی (اور وہ دشمنوں کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے اور فتحمند ہوئے) یقیناً اللہ انسان کے لئے بڑا ہی فضل و بخشش رکھنے والا ہے لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر') اکثر آدمی ایسے ہیں جو ناشکری کرنے والے ہیں!

یہ تھی حالت اس قوم کی جو رفعت و بلندی کی قابلِ رشک زندگی کے بعد ذلت و پستی کے عبرت انگیز عذاب میں مبتلا کی گئی۔ مبتلا کیا کی گئی' ان کے اعمال خود ذلت و پستی کا عذاب بن کر ان پر مسلط ہو گئے۔

محکومی کا عذاب

یہ عذاب کیا تھا؟ غلامی اور محکومی کا عذاب، وہ عذاب جس سے انسانیت کی روح کانپ اُٹھے۔ محکومی! ہزار لعنت کی ایک لعنت اور لاکھ بدبختیوں کی ایک بدبختی۔ نہ صرف مجبوری کی غلامی' بلکہ اس غلامی کی زندگی پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہنے کی لعنت وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۚ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ (۲/۶۱) اس دنیا میں بھی رسوائی اور عاقبت میں بھی رسوائی خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (۲/۸۵، ۵/۴۱) خدا کی رحمت سے دُوری فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ (۵/۱۳) ان کی "عہد شکنی" کی وجہ سے ہم نے ان پر "لعنت" کی اور ان کے دل سخت کر دیئے۔" ایسی "لعنت" جس کے آثار دیدہ وروں کی نگاہوں نے بہت پہلے بھانپ لئے تھے کہ دیکھنے والی نگاہیں بیج سے پھل پہچان لیتی ہیں۔

وہ "لعنت" جس سے اس قوم میں باہمی عداوت ڈال دی گئی

وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (۵/۶۴)

اور (اسی سرکشی و کفر کا نتیجہ ہے کہ) ہم نے ان کے (مختلف فرقوں کے) درمیان عداوت اور کینہ ڈال دیا ہے (کہ) کبھی مٹنے والا نہیں۔ جب کبھی لڑائی کی آگ سلگاتے ہیں، اللہ اسے بجھا دیتا ہے (یعنی اس کا فتنہ تمام ملک میں پھیلنے نہیں پاتا)۔ یہ لوگ ملک میں خرابی پھیلانے کے لئے سعی کرتے ہیں اور اللہ خرابی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اور اس کا نتیجہ غیروں کی محکومی؛

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚۖ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۷/۱۶۷)

اور (اے پیغمبر!) جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا (اگرچہ بنی اسرائیل شرارت و بدعملی سے باز نہ آئے تو) وہ ہمیشہ کے لئے ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دیگا جو انہیں ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا پروردگار (بدعملی کی سزا دینے میں دیر کرنے والا نہیں اور ساتھ ہی بخشنے والا رحمت والا بھی ہے۔

بدن کی بھی محکومی اور روح کی بھی محکومی! بقول علامہ اقبالؒ۔

جان بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

نہ اپنی حکومت و سلطنت، نہ اپنے تصوراتِ حیات، جسم بھی غیروں کے محکوم اور دل و دماغ بھی دوسروں کے نظریاتِ زندگی کے تابع، ذہنیت بالکل بندروں کی سی (apish mentality) اپنا مستقل نظریۂ حیات کوئی نہیں، باہمی عداوت اور غیروں کے تصوراتِ زندگی کی اندھی تقلید۔ یہ تھیں خصوصیات اس قوم کی جس پر اللہ کا عذاب یوں نازل ہوا تھا۔

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ ۚ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ○ (۶۵-۶۶/۲) ؛ (۷/۱۶۶)

اور یقیناً تم ان لوگوں کے حال سے بے خبر نہیں ہو جو تم ہی میں سے تھے اور جنہوں نے سبت کے معاملہ میں راست بازی کی حدیں توڑ ڈالی تھیں (یعنی حکمِ شریعت سے بچنے کے لئے حیلوں بہانوں سے کام لیا تھا۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو انسانیت کے درجہ سے گر گئے) ہم نے کہا ذلیل و خوار بندروں کی طرح ہو جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہم نے اس معاملہ کو ان سب کے لئے جن کے سامنے ہوا اور ان کے لئے بھی جو بعد کو پیدا ہوئے "تازیانۂ عبرت بنا دیا اور ان لوگوں کے لئے جو متقی ہیں اس میں نصیحت و دانائی رکھ دی۔

مسخِ سیرت قرآنِ کریم نے ان لوگوں کو جو اپنے اعمال کی وجہ سے رحمتِ خداوندی سے دُور ہو جاتے ہیں اور یوں ان پر عذابِ الٰہی مسلط ہو جاتا ہے، شر الدواب (بدترین خلائق) قرار دیا ہے۔ اور انہیں قردۃ اور خنازیر سے تشبیہ دی ہے کیونکہ ان کی نفسیاتی کیفیت، درجۂ انسانیت سے گر کر "اسفل السافلین" کی سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِیْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ ○ (۵/۶۰)

(اے پیغمبر!) تم کہو کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ معیارِ خداوندی کے مطابق کس کی حالت بدترین ہے؟ اِن لوگوں کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گئے۔ ان کی متاعِ حیات جھلس گئی۔ ان کی سیرت بدترین حیوانات (بندروں اور خنزیروں) جیسی ہو گئی اور وہ بڑی سرکش

قوموں کی محکومی کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ یہی لوگ ہیں جو سب سے بدتر درجے میں ہیں اور سب سے زیادہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے۔

یہاں قردۃ (بندر) اور خنازیر (سور) کے ساتھ عبد الطاغوت مفہوم کو واضح کر رہا ہے یعنی سرکش قوتوں کے محکوم اور فرماں پذیر۔ خود نبی اکرمؐ کے زمانہ کے اہلِ کتاب کا، جنہوں نے قرآنِ کریم سے انکار کیا، اسی درجہ میں شمار کیا گیا ہے (دیکھئے ۴/۴۷) یعنی جس طرح حکمِ سبت کی معصیت کرنے والوں پر اللہ کی "لعنت" ہوئی تھی اسی طرح تم پر بھی "لعنت ہوئی! ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی صورتوں کی نہ تھی سیرتوں کی تھی۔ احکامِ سبت سے سرکشی کرنے والوں کے متعلق خود تورات میں ہے کہ

> تو نے میرے مقدسوں کو ناچیز جانا ہے اور میرے سبتوں کو ناپاک کیا ہے۔ تیرے بیچ میں وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کر کے خون کرواتے ہیں اور تیرے درمیان وہ ہیں جو بتوں کی قربانی سے کھاتے ہیں۔ تیرے بیچ میں وہ ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں۔ تیرے بیچ باپ کو بھی انہوں نے بے ستر کیا۔ تیرے بیچ انہوں نے اس عورت سے جو حیض کے سبب خارج کی گئی تھی مباشرت کی ہے۔ کسی نے دوسرے کی جورو سے بُرا کام کیا ہے اور دوسرے نے اپنی بہو سے بدذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن، اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا ہے۔ تیرے بیچ میں انہوں نے رشوت لی تاکہ خون کیا جائے۔ تو نے بیاج اور سود لیا ہے اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لوٹا ہے اور مجھے فراموش کیا خداوند یہوواہ کہتا ہے۔ دیکھ تیرے ناروا نفع کے سبب جو تو نے لیا اور تیری خوں ریزی کے باعث جو تیرے بیچ میں ہوئی ہے میں نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا ہے۔ کیا تیرا دل سنبھلے گا اور تیرے ہاتھوں میں زور رہے گا، ان دنوں میں جب تیرا معاملہ فیصل کروں گا؟ مجھ خداوند نے کہا ہے اور میں ہی عمل کروں گا۔ ہاں میں تجھ کو قوموں میں کھنڈا دوں گا اور تجھے ملکوں میں پراگندہ کروں گا اور تیری گندگی جو تجھ میں ہے نابود کر دونگا اور تو قوموں کی نظر کے آگے آپ اپنے میں ناپاک ٹھہرے گا اور معلوم کرے گا کہ میں خداوند ہوں۔ (حزقی ایل ۸۔۲۲/۱۶)

یہود پر غلامی و محکومی (ذلت و مسکنت) کا عذاب کسی خاص زمان و مکان سے مشروط نہ تھا بلکہ ایسا عذاب تھا جو ہر زمانہ میں، زمین کے ہر حصہ میں، منحوس سایہ کی طرح ان کے ساتھ لگا رہا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے۔

ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الۡمَسۡکَنَةُ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّکَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۳/۱۱۱﴾

ان لوگوں پر (یعنی یہودیوں پر) ذلت کی مار پڑی جہاں کہیں بھی یہ پائے گئے، اِلّا یہ کہ خدا کے عہد سے یا انسانوں کے عہد سے کہیں پناہ مل گئی ہو اور خدا کا غضب ان پر چھا گیا۔ محتاجی و بدحالی میں گرفتار ہو گئے اور یہ اس لئے ہوا کہ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے تھے اور نبیوں کے ناحق قتل میں بیباک تھے اور (بدعملی و شقاوت کی یہ حالت) اس لئے (پیدا ہوئی) کہ نافرمانی اور سرکشی کرنے لگے تھے اور (اپنی شرارتوں میں) حد سے گزر گئے تھے۔

ذلت کے معنی ذلت، عزت کی ضد ہے۔ عزت کے معنی ہیں غلبہ و قوت۔ لہٰذا ذلت کے معنی ہوئے کمزوری اور مغلوبیت، غیروں کی محکومی۔

ا۔ یہودیوں کی ملی پریشانی اور اجتماعی انتشار و پراگندگی کے متعلق خود حضرت موسیٰؑ نے پیش گوئی کی تھی جو تورات میں ان الفاظ میں مذکور ہے۔

اور خداوند تجھ کو سب قوموں کے درمیان زمین کے اِس سرے سے اُس سرے تک تتر بتر کریگا اور وہاں تو غیر معبودوں کی جو لکڑیاں اور پتھر ہیں جن سے نہ تو تیرے باپ دادے واقف تھے اُن کی پرستش کریگا۔ اور ان قوموں میں تجھ کو آرام نہ ملے گا بلکہ تیرے پاؤں کے تلوے کو قرار نہ ہوگا کیونکہ خداوند وہاں تجھ کو دل کا دھڑکا اور آنکھوں کی دُھندلاہٹ اور جی کی غمناکی دے گا اور تیری زندگی تیری نظر میں بے ٹھکانے ہو جائے گی اور تُو رات اور دن ڈرتا رہے گا اور تجھ کو اپنی زندگی پر کچھ بھروسہ نہ ہوگا۔ اپنے دل کے خوف سے جسے تو کھائے گا اور ان چیزوں سے جنہیں تیری آنکھیں دیکھیں گی صبح کو تو کہے گا اے کاش کہ شام ہوتی! اور شام کو کہے گا کہ اے کاش صبح ہوتی اور خداوند تجھ کو اس راہ سے جس کی بابت میں نے تجھے کہا کہ تو پھر اسے نہ دیکھے گا کشتیوں پر مصر کو پھر لے جائے گا اور تم وہاں غلام اور لونڈی ہونے کے لئے اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچے جاؤ گے اور تمہیں کوئی مول نہ لے گا۔ (استثناء ۶۴-۲/۶۸)

بنی اسرائیل کے لئے سورۃ بقرہ میں جہاں ذلّت و مسکنت کے عذاب کا ذکر ہوا ہے (دیکھئے ۲/۶۱، جو پہلے درج کی جا چکی ہے) وہ اس واقعہ سے تعلق رکھتا ہے جہاں انہوں نے دشت و بیاباں کی آزادانہ زندگی کو چھوڑ کر (جہاں نگاہوں میں کشادگی اور عزائم میں بلندی پیدا ہوتی تھی) شہروں کی تیرہ و تنگ زندگی کی خواہش کی تھی. وہ عذاب پھر بھی وقتی تھا اور چالیس برس کی صحرانوردیوں سے کٹ گیا. لیکن جو عذاب بعد میں نازل ہوا (دیکھئے مندرجہ صدر آیت ۳/۱۱۱) وہ ان پر اس طرح مسلّط رہا کہ دنیا میں "آوارہ گرد یہودی" (Wandering Jews) کی اصطلاح بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگ گئی. یہ ذلّت کا عذاب (یعنی پہلا وقتی عذاب) ان پر گوسالہ پرستی کے شرک کی پاداش میں نازل ہوا تھا.

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝ (۷/۱۵۲)

خدا نے فرمایا "جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی ان کے حصے میں ان کے پروردگار کا غضب آئے گا اور دنیا کی زندگی میں بھی ذلّت و رسوائی پائیں گے. ہم افترا پردازوں کو (ان کی بدعملی کا) اسی طرح بدلہ دیتے ہیں.

مسکنت کے معنی

سورۂ بقرہ اور آلِ عمران میں ذلّت کے ساتھ مسکنت کا لفظ بھی آیا ہے. مسکنت (سکون[1]) کے معنی ہیں عدمِ حرکت، یعنی غلامی و محکومی کے گڑھے میں گر جانا اور پھر اس میں بے حس و حرکت پڑے رہنا، عذاب در عذاب!

محتاجی و مسکینی و نومیدیٔ جاوید

حبل اللہ سے مراد

آگے بڑھنے سے پیشتر سورۂ آلِ عمران کی مصرحہ صدر آیت (۳/۱۱۱) پر ایک نگاہ پھر ڈال لیجئے جس میں ارشاد ہے کہ یہ ذلّت و مسکنت (محکومی و غلامی اور جمود و تعطل کی زندگی) اس طرح رفع ہو سکتی تھی (اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ) کہ یا تو دعوتِ خداوندی کے سررشتہ سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا جاتا یا (بہ سبیلِ تنزل) دوسری قوموں کے ساتھ معاہدات کر کے ان کی پناہ میں آجاتے.

---

[1] مسکینی کے معنی ایسا محتاج ہوں گے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے. (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی).

اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے سررشتہ سے منسلک کر لینے سے حکومت و ثروت کے ساتھ شرفِ انسانیت کی نعمتِ کبریٰ بھی مل جاتی. لیکن اگر کسی کو یہ میسر نہ ہو تو ان میں کم از کم اتنی اجتماعیت تو ہو کہ وہ دوسری اقوام کیساتھ معاہدات ہی کر سکیں اور اس طرح لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرنے لگ جائے. لیکن جس قوم کو نہ حبل اللہ کی مقدس مرکزیت حاصل ہو اور نہ ہی حبلِ النّاس کی تقویت میسر، اسے بھلا انسانوں کے زمرہ میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟ یہ تو یکسر عذاب کی زندگی ہے. (۲۶ـ۱۰/۲۷)

آخری واقعہ

یہ تھی بنی اسرائیل کی نزولِ قرآن کے وقت کی حالت. نبی اکرمؐ کے عہدِ رحمت مآب میں ایک موقع پھر آیا تھا کہ ان کی اندوہناک پستیاں شرف و مجد کی سرفرازیوں میں بدل جائیں لیکن انہوں نے اپنی ضد اور قساوتِ قلبی کی بنا پر اس دعوتِ ربانی پر لبیک کہنے کے بجائے اپنے سابقہ شیوہ کے مطابق اس کی انتہائی مخالفت کی اور اس مخالفت میں ایسی ایسی حرکات پر اتر آئے جو ان کی قومی تاریخ کے اوراق پر ایک افسوسناک دھبہ ہے لیکن اس سے اس دعوت کا کچھ نہ بگڑا. البتہ انہوں نے خود اپنی پیشانی پر گہری ہلاکت کی مہر ثبت کر لی.

اتباعِ دعوتِ قرآنی

سورۂ اعراف میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے اس قوم کے لئے ابدی برکات کی دعا مانگی تو بارگاہِ ایزدی سے جواب ملا کہ یہ سرفرازیاں مشروط ہیں اس بات پر کہ جب وہ نبی آخر الزماںؐ آئے تو یہ اس پر ایمان لائیں اور اس دعوت کی تائید کریں.

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۚ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا ...... فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿ع﴾ (۱۵۶ـ۷/۱۵۷)

(اور خدایا!) اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لئے خوشگواری لکھ دے اور آخرت کی زندگی میں بھی خوشگواری. اس لئے کہ ہم تیری طرف رجوع کر رہے ہیں.

خدا نے فرمایا، میری طرف سے تباہی کا حال یہ ہے کہ وہ میرے قانونِ مشیت پر مبنی ہے اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے. پس میں ان لوگوں کے لئے رحمت لکھ دوں گا جو میرے

قوانین کی نگہداشت کریں گے اور دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں گے' یعنی وہ لوگ جو ہمارے قوانین کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھیں گے' جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبیؐ اُمّی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے. وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا' برائی سے روکے گا' پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، خبیث چیزیں حرام ٹھہرائے گا' اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے. تو جو لوگ اس پر ایمان لائے' اس کے مخالفوں کے لئے روک ہوئے' (راہِ حق میں) اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہو لئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے، سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں!"

یہ چیزیں خود ان کے ہاں تورات میں موجود تھیں. یہ لوگ ایک آنے والے کے انتظار میں تھے جس کی بشارتیں ان کے ہاں متواتر چلی آتی تھیں (ان امور کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی). لیکن جب وہ آنیوالا آیا اور "دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کو اپنے جلو میں لئے فاران کی چوٹیوں پر جلوہ بار ہوا" تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتے' سب سے پہلے مخالفت پر اُتر آئے. حالانکہ ان سے بار بار کہا گیا کہ تمہیں تو یہ زیبا نہیں کہ تم ہی اس دعوت کا انکار کرو. تم سے تو عہد لیا گیا تھا کہ تم اس آنے والے کی تائید و نصرت کرو گے تو تم پر رحمتِ ایزدی کی گہرباریاں ہوں گی. تم اس عہد کو پورا کرو اللہ اپنے عہد کو پورا کرے گا (۲/۴۰). یہ دعوت کوئی نئی دعوت اور یہ پکار کوئی انوکھی پکار نہ تھی، بلکہ اسی تعلیم کی تجدید و تکمیل تھی جو اس سے پیشتر تورات میں آچکی تھی. لیکن جسے یہ لوگ اپنے ہاں سے کھو چکے تھے. (۸۳—۲/۸۴ ؛ ۲/۶۵ ؛ ۴/۱۵۴ ؛ ۷/۱۶۱ ؛ ۱۲—۵/۱۳)

علاوہ ازیں' قرآنِ کریم نے دیگر متعدد مقامات میں بھی اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت یہودیوں کی حالت کیا ہو چکی تھی اور وہ کس طرح قوانینِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کرنے سے دُور بھاگتے تھے.

(دیکھئے ۲/۷۴ ؛ ۵/۶۴ ؛ ۲/۱۰۰ ؛ ۲/۱۰۱ ؛ ۲/۱۴۴ ؛ ۲/۱۴۶ ؛ ۶/۲۰)

آخری تباہی

قدرت کی طرف سے اس قوم کو یہ آخری موقع دیا گیا تھا کہ وہ ضابطہ خداوندی کی طرف رجوع کریں تاکہ ان کی بازآفرینی کی صورت پیدا ہو سکے. لیکن انہوں نے اس نایاب موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل اپنی پوری قوت و شدت کے ساتھ لوٹا جس کے سامنے یہ خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے.

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ

لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ (۱۷/۸)

کچھ عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے (اگر اب بھی باز آجاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی و فساد کی طرف لوٹے تو پھر ہماری طرف سے بھی پاداشِ عمل لوٹ آئے گی اور (یاد رکھو) ہم نے منکرینِ حق کے لئے جہنم کا قید خانہ تیار کر رکھا ہے!

مدینہ کے یہودیوں نے پہلے نبی اکرمؐ کے ساتھ امن وسلامتی کا عہد کر لیا تھا لیکن بعد میں انہوں نے عہد شکنی کی جس کی وجہ سے انہیں مدینہ سے نکلنا پڑا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے عہد میں انہیں ایسے ہی جرائم کی پاداش میں خیبر سے شام کی طرف نکال دیا گیا[1] (۵۹/۲)۔ اس کے بعد اس راندۂ بارگاہِ خداوندی قوم کی جو حالت ہوئی اس کی کیفیت ہم سے نہیں آسمان کی آنکھوں سے پوچھئے۔

آیۂ عبرت

یہ ہے داستان اس قوم کی جو ذلت کی خاک سے ابھر کر عزت کی بلندیوں تک پہنچی اور وہاں سے ایسی گری کہ پھر سنبھلے نہ سنبھل سکی۔ اور یہ داستان محض افسانہ نہیں حقیقت ہے جسے وحی کی زبان نے ہمارے کانوں تک پہنچایا ہے اور اس لئے پہنچایا ہے کہ ہمارے لئے عبرت کا موجب اور موعظت کا ذریعہ بن سکے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (۲۶/۶۷-۶۸)

دیکھو یقیناً اس میں (بڑی) نشانی موجود ہے۔ مگر ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ (کیونکہ تعصب وعناد کی وجہ سے وہ قبولِ ایمان کی صلاحیت ہی گم کر چکے ہیں) اور (یاد رکھو) تمہارا پروردگار بڑا ہی غالب اور مہربان ہے۔

لیکن یہ عبرت اس کے لئے ہے جو اپنے دل کی گہرائیوں میں اللہ کے قانونِ مکافات کا ڈر محسوس کرے، ورنہ دوسروں کے لئے محض ایک کہانی ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ (۷۹/۲۶)

باز بخویشتن نگر

اس اجڑی ہوئی قوم کی پراگندہ داستان کی مختلف کڑیوں پر نگاہ ڈال لیجئے اور پھر سوچئے کہ اس آئینہ میں کہیں ہماری ہی شکل تو نظر نہیں آرہی؟ قرآنِ کریم نے نبی اکرمؐ

---

[1] ان امور کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

کو مثلِ موسیٰؑ قرار دیا ہے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ (۷۳/۱۵)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) بلاشبہ ہم نے اسی طرح تمہاری طرف تم پر گواہ بنا کر ایک رسول بھیجا ہے، جیسا کہ فرعون کی طرف ایک رسول (موسیٰ کو) بھیجا تھا۔

(یہ مماثلت کیسی ہے اس کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئے گا)۔ قومِ فرعون نے دعوتِ موسوی کا انکار کیا اور کفارِ عرب نے دعوتِ محمدیؐ کا۔ دونوں کا جو کچھ انجام ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۝ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝ (۷۳/۱۶-۱۷)

چنانچہ فرعون (اور قومِ فرعون) نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے بہت سختی سے پکڑ لیا اور نتیجہ میں ہلاکت و بربادی اس کے حصہ میں آئی۔ سو اگر تم بھی (ان کی طرح) نافرمانی کرو تو اس دن (کی ہولناکی) سے کیسے بچ سکتے ہو جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا؟

اس کے بعد قومِ موسیٰؑ شوکت و ثروت کی انتہائی بلندیوں پر سرفراز ہوئی اور ان سے کہیں بڑھ کر امتِ محمدیہ۔ پھر اس عروج کے بعد قومِ موسیٰؑ اس پستی میں گری جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے اور امتِ محمدیہ ـــــ؟ اس کا جواب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے دل سے پوچھئے! قومِ موسیٰؑ سے ان کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے کیا ارشاد ہوا تھا؟ دعوتِ قرآنی کا اتباع! اور اُمتِ محمدیہ کی بازآفرینی کے لئے بھی تمسک بالقرآن!!

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝

(۷۳/۱۹)

یہ ایک بھولے ہوئے سبق کی یاددہانی ہے سو جس کا جی چاہے (اس سے) اپنے اللہ (کے نظام) کی طرف راستہ اختیار کرلے۔

کیا یہودیوں کی تباہی ابدی ہے؟

ہمارے ہاں صدیوں سے یہ خیال چلا آ رہا ہے کہ خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ یہودیوں کو کبھی سلطنت نہیں مل سکتی۔ یہ خدا کا فیصلہ نہیں، ہمارا اپنا وضع کردہ عقیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نزولِ قرآن کریم سے قریب ایک ہزار سال پہلے سے، بنی اسرائیل میں جو اجتماعی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں ان کا فطری نتیجہ ذلت و خواری اور محکومی و محتاجی تھا۔ یہ ذلت و خواری انہیں مختلف اقوام کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ نزولِ قرآن کے وقت ان کی یہ خرابیاں اور بھی بڑھ چکی تھیں۔ اس لئے قرآن نے ان کی ذلت و رسوائی کی زندگی کو اس دعوے کی صداقت میں بطور شہادت پیش کر کے کہا کہ دیکھ لو! قوانین خداوندی سے انحراف کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا انہیں دنیا میں کبھی بھی حکومت و سطوت کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی، تو اس سلسلہ میں اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ قوموں کی تباہی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس تباہی کے بعد اس قوم کا اجتماعی تشخص ہی باقی نہ رہے، جیسے اکال الامم ــــ "بھارت ماتا" ــــ باہر سے آنے والی بیشتر قوموں کو اس طرح ہضم کر گئی کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اس قسم کی قوموں کے لئے باز آفرینی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری قسم کی قومیں وہ ہیں جو اپنی تباہی کے باوجود اپنا قومی تشخص قائم رکھتی ہیں۔ ان قوموں کی صورت یہ ہے کہ اگر وہ ان خرابیوں کو رفع کر لیں جن کی وجہ سے ان پر ذلت اور ادبار کے بادل اُمڈ آئے تھے اور ان کی جگہ وہ صلاحیتیں پیدا کر لیں جن سے (قرآن کے الفاظ میں) "مُردہ قومیں زندگی حاصل کر لیتی ہیں" تو انہیں پھر حیات تازہ مل سکتی ہے۔ خدا کا قانونِ مکافات یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے اسلاف میں کسی زمانے میں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، تو ان کی آنے والی نسلوں میں اس کا امکان ہی نہ رہے کہ وہ ان خرابیوں کو دُور کر کے، از سرِ نو اپنی صلاحیتیں بیدار کر لیں۔ یہ ہماری خوش فہمی تھی جو ہم نے سمجھ لیا کہ یہودیوں کو ابدالآباد تک حکومت نہیں مل سکتی۔ لیکن قانون تو کسی کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کے فیصلے حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس نے اپنے فیصلوں کے متعلق (خود مسلمانوں سے کہہ دیا کہ) ــــ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ (۴/۱۲۳) "یہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوں گے، نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں کے مطابق" ــــ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ (۴/۱۲۳) جو غلط کار ہو گا وہ اپنی غلط روش کا نتیجہ بھگتے گا۔ جب وہ غلط روش چھوڑ دے گا تو نقصان سے بچ جائے گا۔ یہ تو عیسائیت کا عقیدہ ہے کہ انسان کے اوّلین ماں باپ (آدم و حوا) کی لغزش کی

وجہ سے ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ، ان کے گناہوں کا بوجھ لے کر دنیا میں آتا ہے۔ قرآن اس باطل عقیدہ کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ لہٰذا، دو چار ہزار سال پہلے کی کسی نسل (generation) کی غلطیوں کی پاداش میں، اس کی آنے والی تمام نسلوں پر بازآفرینی کے دروازے بند کر دینا ــــ می نہ سزد خدائے را۔ بنابریں، جس طرح ہمارے اسلاف کے کارنامے ہمارے لئے عزت و سطوت کی زندگی کا موجب نہیں بن سکتے، ہمیں عزت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ہم خود قابلِ عزت کام کریں۔ اسی طرح یہودیوں کے اسلاف کے ذلت و خواری پیدا کرنے والے کام، ان کی موجودہ نسل کے لئے ذلت و خواری کا سبب نہیں بن سکتے۔ اگر وہ ان کی روش کو چھوڑ کر صحیح روش اختیار کر لیتے ہیں، تو انہیں اپنے کاموں کا بدلہ ملے گا۔ اس باب میں قرآن کا فیصلہ بڑا واضح ہے جب اس نے کہا کہ

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ؏ (۲/۱۴۱)

(یہ (تمہارے اسلاف) اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ تھے، تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ تمہارے متعلق فیصلہ اس سے ہو گا کہ تم نے کیا کیا ہے۔

اس لئے نہ مسلمان، بلند کردار اسلاف ہونے کی بنا پر مقربِ بارگاہِ خداوندی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی یہودی اپنے غلط کار اسلاف کی نسل ہونے کی وجہ سے راندۂ درگاہ، ــــ کارگہِ حیات میں ــــ ؏

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

اگلی بات یہ سمجھ لیجئے کہ اس دنیا کے طبیعی معاملات خدا کے مقرر کردہ قوانینِ فطرت ــــ (Laws of Nature) کے مطابق طے پاتے ہیں اور قوانینِ فطرت کی نگاہ میں کافر و مومن کی کوئی تمیز اور فرق نہیں۔ اگر کوئی "شیر سنگھ یا رام داس" فطرت کے قاعدے کے مطابق اپنی زمین تیار کر کے اس میں کھیتی کرتا ہے تو اس کی بھی اتنی ہی فصل ہو گی جتنی کسی "عبدالرحمٰن" کاشتکار کی جو انہی قواعد کے مطابق کاشت کرتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر "شیر سنگھ یا رام داس" ان قواعد کی پابندی کرتے ہیں اور "عبدالرحمٰن" ان سے اعراض برتتا ہے، تو "شیر سنگھ اور رام داس" کی "کوٹھیاں" دانوں سے بھر جائیں گی، "عبدالرحمٰن" کی جھولی خالی رہ جائے گی۔ اس باب میں فطرت نہ کسی سے رعایت برتتی ہے، نہ کسی سے بَیر

رکھتی ہے. خدا کا ارشاد ہے کہ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ—
جو چیزیں عطیۂ خداوندی کے طور پر مائدۂ ارض پر بکھری ہوئی ہیں، انہیں جو بھی ہمارے قانون کے مطابق
حاصل کرنا چاہے، ہم اسے برابر آگے بڑھائے جاتے ہیں — وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۟
(۱۷/۲۰). یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہم راستے میں پھاٹک لگا دیں کہ اس سے آگے "عبدالرحمٰن" تو جا سکتا ہے "شیر سنگھ
اور رام داس" نہیں جا سکتے —

ہمت ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا

اپنی اپنی ہمت اور کوشش کے مطابق جو جتنا حاصل کرنا چاہے، حاصل کر لے. یہودیوں کی ذلت کی بنیادی
وجہ یہ تھی کہ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ — نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ — ہم خدا کی چاہیتی اولاد ہیں. اس
لئے ہم کچھ کریں یا نہ کریں (یا جو جی میں آئے کریں) ہمیں زندگی کی سرفرازیاں از خود حاصل ہوتی جائیں گی.
ان کا یہ عقیدہ ان کے لئے ترکِ عمل کا باعث بن گیا جس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟
انہوں نے اس عقیدہ کو ترک کر دیا تو ذلت و خواری کے عذاب سے نکل گئے. ان کی جگہ ہم نے یہ عقیدہ اختیار
کر لیا کہ "ہم خدا کے محبوب کی محبوب اُمت ہیں" اس لئے ہم جو جی میں آئے کریں، ہم سے کوئی باز پرس
نہیں ہوگی. تو اس غلط عقیدہ کے فطری نتیجہ کی رُو سے، جس عذاب میں یہودی گرفتار تھے اس میں ہم ماخوذ ہیں.
یاد رکھئے: خدا کے ہاں نہ کوئی قوم (محض کسی نسبت کی بنا پر) چاہیتی ہوتی ہے، نہ سوتیلی. وہاں تو اصول یہ ہے کہ
— مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲/۸۱) جو کوئی بھی غلط روش اختیار کرے اور اس کی غلط اندیشیاں اسے چاروں طرف سے
گھیر لیں تو اس کی زندگی جہنم کی ہوگی.

ہم نے اوپر کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایسی اجتماعی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کی وجہ سے ان کی
حکومت و سطوت ان سے چھن گئی اور وہ دنیا کی ذلیل ترین قوم بن گئی. قرآن کریم نے ان خرابیوں کو بڑی شرح
و بسط سے بیان کیا ہے. اس لئے نہیں کہ وہ اس قوم کو مطعون کرنا چاہتا تھا، بلکہ اس لئے کہ وہ مسلمانوں
کو متنبہ کرنا چاہتا تھا کہ دیکھنا! کہیں تم میں اس قسم کی خرابیاں نہ پیدا ہو جائیں. اگر ایسا ہوا، تو جو حالت
بنی اسرائیل کی ہوئی ہے وہی حالت تمہاری ہو جائے گی. یہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اٹل ہے —
وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲) تم اس کے قانونِ مکافات میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے.

ہم ان خرابیوں میں سے چند ایک اصولی امور کا تذکرہ کرتے ہیں. آپ دیکھئے کہ ان میں کونسی خرابی ایسی ہے جو (یہودیوں میں تھی اور) اب ہم میں پیدا نہیں ہو چکی! قلتِ گنجائش کی وجہ سے ہم ان کا ذکر محض اشارۃً کریں گے. آپ انہیں غور سے دیکھئے.

(۱) خود اپنی قوم کے ساتھ غدّاری ان کا شیوہ تھا. ان کے اربابِ اقتدار کرتے یہ تھے کہ پہلے ایسے حالات پیدا کر دیتے جن سے کمزور طبقہ دوسروں کا محتاج ہو جاتے اور پھر "نیک بننے" کے لئے ان کی بہبود کے لئے خیراتی فنڈ اکٹھا کرتے. (۲/۸۵).

(۲) عہد شکنی اور اصول فراموشی ان کا عام شعار تھا. (۲/۱۰۰)

(۳) وہ محنت سے جی چراتے تھے اور محض روپیہ لگا کر دوسروں کی کمائی کو ہتھیا لیا کرتے تھے، یعنی ان کے ہاں نظامِ سرمایہ داری عام تھا. (۴/۱۶۱) اور یہ سرمایہ دار خود اپنی ہی قوم کا خون چوستے تھے چنانچہ قرآن نے بتایا ہے کہ فرعون اور ہامان تو قوم مخالف سے متعلق تھے، لیکن قارون خود بنی اسرائیل میں سے تھا.

(۴) ان میں ہوسِ زر اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ ان کا مقصدِ حیات روپیہ حاصل کرنا رہ گیا تھا اور اس میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی تھی. (۵/۴۲)

(۵) معاشرہ میں اخلاقی برائیاں اس قدر عام ہو چکی تھیں کہ کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں تھا. (۵/۷۹)

(۶) مذہبی پیشوائیت کا اقتدار اس قدر غالب آ چکا تھا کہ وہ خدائی مسند پر بیٹھ گئے تھے اور اپنے احکام کو خدا کی شریعت کہہ کر لوگوں سے منواتے تھے. (۹/۳۱)

(۷) یہ مذہبی علماء اور روحانی مشائخ ہر طریق سے لوگوں کا مال ہڑپ کر جاتے تھے اور انہیں کبھی خدا کے راستے کی طرف آنے نہیں دیتے تھے. (۹/۳۴)

(۸) دین فروشی ان مذہبی راہ نماؤں کا عام شیوہ تھا. (۷/۱۶۹)

(۹) ان کے اربابِ اقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ وہ کرتے کچھ نہیں تھے، لیکن چاہتے یہ تھے کہ لوگ ان کاموں کی وجہ سے ان کی تعریف کریں جنہیں وہ کر کے نہیں دکھاتے تھے. (۳/۱۸۷)

(۱۰) قوم میں بات بات پر اختلاف ہوتا تھا اور اس سے ان میں بے شمار فرقے پیدا ہو چکے تھے (۱۰/۹۳).

یہ اختلافات، مذہبی پیشواؤں کی باہمی ضد اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کے جذبات کی بنا پر پیدا کئے اور قائم رکھے جاتے تھے۔ (۴۵/۱۷)

(۱۱) ان کے علماء کے پاس کتابوں کے انبار در انبار لگے رہتے لیکن حرام جو وہ ان میں سے کسی پر عمل کرتے۔ ان کی مثال ایسی تھی جیسے گدھے پر بڑی بڑی کتابوں کا بوجھ لاد کر سمجھ لیا جائے کہ وہ بڑا مقدس بن گیا ہے۔ (۶۲/۵)

(۱۲) وہ اپنے آپ کو "خدا کی چاہیتی اولاد" سمجھتے تھے، اس لئے اس زعمِ باطل میں مبتلا تھے کہ انہیں عمل کی ضرورت نہیں۔ وہی جنت کے واحد اجارہ دار ہیں۔ (۸۰/۲، ۲/۱۱۱)

(۱۳) اندھی تقلید ان کا شیوہ تھا اور وہ کوئی نئی بات سننے اور اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔

(۲/۸۸)

(۱۴) بلا محنت، ہوسِ زر نے ان میں حرکت و عمل کی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ موت کے تصور سے ان کی جان جاتی تھی۔ (۲/۹۴)۔

(۱۵) انہیں اگر کبھی دشمن کے مقابلہ کے لئے ہانک کر لے جایا جاتا، تو وہاں سے بیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھتے۔ (۲/۲۴۳)

(۱۶) معاشرتی ضوابط کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر سخت گراں گزرتیں اور ان سے بچ نکلنے کے لئے وہ چور دروازے تراشتے رہتے۔ (۷/۱۶۳) اسی لئے منافقت ان کے رگ و ریشے میں رچ چکی تھی۔

(۱۷) ان کا اپنا مثبت نظریۂ زندگی کوئی نہیں رہا تھا۔ اس لئے دوسروں کی نقالی میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے۔ (۷/۱۶۶)

(۱۸) ان کی ساری توانائیاں باہمی سرپھٹول اور انتشار میں ضائع ہو جاتی تھیں۔ (۵/۶۴)

یہ تھیں مختصراً وہ اخلاقی خرابیاں جو ان میں عام ہو چکی تھیں اور جن کا نتیجہ یہ تھا کہ ان سے سرفرازیاں چھن گئیں۔ وہ سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی سے محروم ہو گئے اور ان پر ذلت و خواری کی مار پڑ گئی۔ ان پر سب سے بڑا عذاب یہ طاری ہوا کہ ان کی اجتماعیت فنا ہو گئی، مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد، ان کی زندگی انفرادی رہ گئی۔ ان کا یہی وہ سوختہ بخت مآل تھا جس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ ؎

عبرتے، اے مسلمِ روشن ضمیر | از مآلِ اُمّتِ موسےٰ بگیر
داد چوں او قوم مرکز را ز دست | رشتۂ جمعیتِ ملت شکست
قوم را ربط و نظام از مرکزے | روزگارش را دوام از مرکزے

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اس (غلط) عقیدے کی تائید میں (کہ یہودیوں کو کبھی سلطنت نہیں مل سکتی) خود قرآنِ کریم سے جو شواہد پیش کئے جاتے ہیں، ان کی اصل و حقیقت کیا ہے۔

(۱) سورۃ فاتحہ میں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (۱/۷) کے سلسلہ میں ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہودی ہیں اور ضَآلِّيْن سے مراد عیسائی۔ قرآنِ کریم کی رُو سے یہ تخصیص نہیں۔ اس میں متعدد مقامات پر بتایا گیا ہے کہ غضبِ خداوندی کے مستوجب کون لوگ ہوتے ہیں ـــــ یا یوں کہئے کہ وہ کون سے جرائم ہیں جن کا نتیجہ خدا کا غضب ہوتا ہے اور راستے سے بھٹک جانے والے (ضَآلِّيْن) کون۔ بنابریں، سورۃ فاتحہ میں مذکور (مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور ضَآلِّيْن) میں وہ تمام افراد اور اقوام شامل ہیں جن پر قرآن کی رُو سے ان اصطلاحات کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہم ان مقامات میں سے (مثال کے طور پر) صرف دو ایک درج ذیل کرتے ہیں۔ سورۃ انفال میں جماعتِ مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ جب میدانِ جنگ میں تمہارا مقابلہ دشمن سے ہو تو وہاں پیٹھ دکھا کر مت بھاگ اٹھو۔ یاد رکھو، جو ایسا کرے گا ـــــ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ (۸/۱۶)۔ وہ غضبِ خداوندی کا مستحق ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔" سورۃ نساء میں ہے۔

وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ (۴/۹۳)

جو کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اس کے لئے سخت عذاب تیار کیا گیا ہے۔

لہٰذا، یہ سمجھنا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" سے مراد صرف یہودی ہیں، خود فریبی ہے۔

(۲) یہودیوں کے متعلق بھی قرآنِ کریم میں ہے کہ وہ اپنے متعدد جرائم کی وجہ سے خدا کے غضب کے مستحق قرار پاگئے تھے. مثلاً جب انہوں نے (حضرت موسیٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے دوران) گوسالہ پرستی شروع کردی تو اس پر کہا گیا کہ ـــ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط..... (۷/۱۵۲) ان پر خدا کا غضب ہوگا یعنی وہ اس دنیا میں ذلیل ہوں گے. لیکن اس سے اگلی آیت میں ہے کہ جو لوگ جرم کرنے کے بعد اس سے تائب ہوکر صحیح روش اختیار کرلیتے ہیں انہیں حفاظت اور رحمت نصیب ہوجاتی ہے. چنانچہ اس کے بعد یہودیوں نے ایسا ہی کیا اور انہیں حکومت وسطوت نصیب ہوگئی. اسی سینا کے صحرا میں انہوں نے احکامِ خداوندی سے اعراض اور سرکشی کی راہیں اختیار کیں تو اس پر کہا گیا کہ ـــ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ق وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط (۲/۶۱) ان پر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی اور اس طرح خدا کا غضب ان پر وارد ہوگیا. ظاہر ہے کہ ذلت ومسکنت کی یہ سزا بھی وقتی تھی، کیونکہ اس کے بعد انہیں نہ صرف فلسطین کا علاقہ ہی ملا بلکہ وہ سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی کے بھی وارث ہوئے.

(۳) اس کے بعد ان میں پھر خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں تو اُن پر دو دفعہ ایسی تباہی کا عذاب آیا جس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی. ان کی پہلی تباہی بابل کے مستبد شاہنشاہ بخت نصر کے ہاتھوں (چھٹی صدی قبل مسیح میں) ظہور میں آئی. لیکن اس کے بعد ایران کے شاہنشاہ کیخسرو نے دوبارہ یروشلم میں بسا دیا اور دوسری تباہی، ۷۰ء میں رومیوں کے گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں ہوئی جس کے بعد انہیں پھر سرفرازی کی زندگی نصیب نہ ہوئی. سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۷ـ۴ میں ان دونوں تباہیوں کا ذکر آیا ہے.

(۴) نزولِ قرآنِ کریم کے وقت ان سے کہا گیا کہ اگر تم خدا کی ان صداقتوں پر ایمان لاکر، اپنی روش میں تبدیلی کرلو، تو تمہاری ذلت کی زندگی ختم ہوسکتی ہے. لیکن انہوں نے اس موقع کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا اور بدستور غضبِ خداوندی کے مورد بنے رہے. اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ میں کہا گیا کہ اس سے فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ط (۲/۹۰). وہ پہلے ہی (اپنے سابقہ جرائم کے نتیجے میں) مغضوب علیہ تھے، اس انکار وسرکشی سے اس میں اور اضافہ ہوگیا.

انہوں نے نہ صرف یہ کہ قرآنِ کریم کی صداقتوں سے انکار کیا بلکہ (مدینہ میں) اسلامی مملکت کے

امن پسند شہریوں کی حیثیت سے بھی رہنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے مملکت کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں سے عہد شکنی کی۔ پھر کھلے بندوں میدانِ جنگ تک میں مقابلہ کے لئے آ گئے۔ اِس مقام پر جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ اِن کی اِن حرکات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ان کا ہر منصوبہ ناکام رہے گا۔ انہیں ذلت آمیز شکست ہوگی اور بُری طرح سے خوار ہو کر یہاں سے نکلیں گے۔ اس سلسلہ میں سورۃ آلِ عمران میں کہا گیا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا ــــ یہ جہاں بھی جائیں گے۔ ذلت و خواری ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی ــــ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ــــ بجز اس کے کہ کسی نے انہیں اہلِ کتاب سمجھ کر خدا کے نام پر پناہ دے دی یا انہوں نے ویسے ہی کسی قوم سے معاہدہ کر لیا۔ ورنہ عام حالات میں ان کی کیفیت یہی رہے گی کہ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ (۳/۱۱۱) خدا کا غضب ان پر مسلط رہے گا اور اس طرح یہ ذلت و مسکنت کی زندگی بسر کریں گے۔ چنانچہ پہلے انہیں مدینہ سے نکالا گیا، پھر خیبر سے اور ازاں بعد پورے کے پورے جزیرہ نمائے عرب سے انہیں باہر نکال دیا گیا۔ صفحۂ ارض پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں یہ باعزت زندگی بسر کر سکتے۔ عیسائی ان کے شدید ترین دشمن تھے، کیونکہ وہ انہیں حضرت مسیحؑ کے صلیب دیئے جانے کے مجرم قرار دیتے تھے اور مسلمانوں کی مملکت کے خلاف انہوں نے یہ کچھ کیا تھا۔ لہٰذا ان کے لئے کہیں ٹھکانا ہی نہیں رہا تھا۔

(۵) آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں، نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے تک یہودیوں کی ذلت آمیز زندگی کا ذکر ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ابدالآباد تک ان کی یہی حالت رہے گی۔ بلکہ خود اسی آیت میں اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" کہہ کر ان کی ذلت سے بچ جانے کی ایک امکانی شکل کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

(۶) انہوں نے اپنی فلسطینی زندگی کے زمانے میں سرکشی اور قانون شکنی کی جو زندگی اختیار کر رکھی تھی، اس سلسلہ میں سورۃ اعراف میں ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ (۷/۱۶۷)

اور جب تیرے رب نے (بذریعہ وحی) اعلان کر دیا کہ وہ ان پر "قیامت کے دن تک" ایسے

لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں سخت سزائیں دیا کریں گے۔

اس آیت میں " اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ " (قیامت کے دن تک) کے الفاظ سے یہ دلیل لائی جاتی ہے کہ یہ قیامت تک ایسے لوگوں کی محکومی میں رہیں گے جو انہیں بُری طرح ستائیں گے۔ اس لئے ان کی اپنی حکومت کبھی قائم نہیں ہوگی۔

ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے " قیامت " کا تصور کیا ہے اور یوم القیٰمۃ سے مراد کیا؟[1] اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہدیتے ہیں کہ تم قیامت تک ایسا نہیں کر سکو گے " اور اس طرح اس سے یا تو شدت مراد ہوتی ہے یا لمبا عرصہ اسی طرح قرآنِ کریم میں بھی " اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ " کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً قرآنِ کریم میں عیسائیوں کے متعلق ہے کہ فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَۃَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (۵/۱۴) ہم نے ان میں " قیامت کے دن تک " باہمی بغض و عداوت ڈال دی۔ اسی طرح یہودیوں کے باہمی اختلاف کے متعلق بھی انہی الفاظ میں کہا گیا ہے (۵/۶۴)۔ " اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ " تو خیر پھر بھی ایک محدود مدت ہے، قرآنِ کریم میں تو " ابد " کا لفظ بھی لامتناہی مدت کے بجائے " لمبے عرصے " کے لئے استعمال ہوا ہے ــــ بلکہ ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں کہ " میں کبھی ایسا نہیں کروں گا "۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ " تم میں اور ہم میں باہمی عداوت ہوگی۔ آبداً (۶۰/۴)، لیکن اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ (۶۰/۴) تا آنکہ تم اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہی مراد " یہودیوں پر ان کے دشمنوں کے تسلط " تا قیامت " سے ہے، یعنی ان پر وہ لوگ مسلط رہیں گے، تا آنکہ یہ اپنی غلط روش کو نہ چھوڑ دیں۔ خود وہ آیت جس میں یہودیوں پر ان لوگوں کے تا قیامت مسلط رہنے کا ذکر ہے، اس مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ اس میں یہ کہہ کر کہ ان لوگوں پر وہ مسلط رہیں گے، یہ کہا گیا کہ ــــ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ ج خدا کا قانونِ مکافات غلط اعمال کا بہت جلد بدلہ دے دیا کرتا ہے اور اس کے بعد ہے وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۷/۱۶۷) اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سامانِ حفاظت و مرحمت بھی عطا کرنے والا ہے۔ یہ الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہود پر بازآفرینی کے دروازے ابدی طور پر

---

[1] اس کی تفصیل ہماری کتاب " جہانِ فردا " میں ملے گی۔

بند نہیں ہو گئے تھے۔ ان کے لئے حفاظت طلبی کے راستے کھلے تھے۔

اس سے اگلی آیت میں بات اور بھی واضح کر دی جہاں کہا کہ وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ اُن کے ان جرائم کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی، ان کا شیرازہ بکھر گیا اور مختلف گروہوں میں بٹ کر زمین میں منتشر ہو گئے۔ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ نے یہ نہیں تھا کہ ان کی ساری قوم میں کوئی بھی فردِ صالح نہیں تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے اور کچھ لوگ ویسے۔ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ ان کی تاریخ میں، ان کے لئے بگڑنے اور سنورنے کے مختلف مواقع آتے رہے۔ یہ اس لئے کہ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (۷/۱۶۸) تاکہ یہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح راستے کی طرف آجائیں اور اس طرح اپنی ذلت و محکومی کو پھر سے عزت اور وقار میں بدل سکیں۔ "لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ" کے الفاظ نے ساری بات واضح کر دی۔ یعنی یہ کہ ان پر ان کی باز آفرینی کے دروازے ابدی طور پر بند نہیں ہو چکے تھے۔ ان کے لئے اس کا امکان باقی تھا۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حکومت و سلطنت حاصل کرنے کے لئے کچھ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو قوم بھی ان صلاحیتوں کو پیدا کر لے گی، اسے حکومت مل جائے گی۔ جن میں وہ صلاحیتیں باقی نہیں رہیں گی، ان سے حکومت چھن جائے گی۔ ان صلاحیتوں کے باقی نہ رہنے سے قوموں کی حالت کیا ہو جاتی ہے اس کا اندازہ دو ایک تاریخی واقعات سے لگائیے۔ یورپ کی عیسائی سلطنتوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ فلسطین کے ان مقامات کو جنہیں وہ مقدس سمجھتے تھے، مسلمانوں کے قبضے سے چھین لیں۔ قریب دو سو سال تک ان جنگوں کا سلسلہ (جنہیں صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے) جاری رہا۔ لیکن وہ مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے۔ اس کی وجہ ایک فرانسیسی مصنف (ڈ این ویل) کی زبان سے سنئے۔ جو خود اس جنگ میں شریک تھا۔ وہ مصر کے محاذ کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ

> ایک رات جب ہم اُن بُرجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لئے بنائی گئی تھیں، پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن سا لا کر نصب کر دیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر ہمارے لارڈ والٹر نے ہم سے یوں خطاب کیا — اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آ گیا ہے۔ ...... ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کر سکے۔ آپ لوگوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ جونہی

مسلمان آگ کے بان چلائیں ہمیں چاہیئے کہ ہم گھٹنوں کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا کریں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے،" چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے آگ کے یہ شعلے ہم پر برستے رہے اور ہم ہر شعلہ پر گھٹنوں کے بل جھک کر خدا سے دعائیں مانگتے تھے۔ حتیٰ کہ ہمارے ولی صفت بادشاہ کی بھی یہ حالت تھی کہ جب وہ اس شعلہ کی گرج سنتا تو بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا اور روتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا۔

وہ یہ دعائیں کرتے رہے اور آگ کی اس بارش نے ان کی تمام برجیوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

یہ تیرھویں صدی میں عیسائیوں کی کیفیت تھی۔ اس کے پانچ سو سال بعد، جب اٹھارویں صدی میں، نپولین نے مصر پر حملہ کیا، تو مراد بک نے جامعہ ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان علماء نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ ہمیں جامعہ ازہر میں، بخاری شریف کا ختم شروع کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ہنوز بخاری شریف کا ختم، اختتام تک بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ مصر کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔

یہ اٹھارویں صدی کا ذکر ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا ہے، تو امیرِ بخارا نے حکم دے دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں "ختمِ خواجگان" پڑھا جائے چنانچہ ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں، ادھر ختمِ خواجگان میں لوگ بیٹھے یا مقلّب القلوب یا محوّل الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ لیکن توپیں جیت گئیں اور یہ دعائیں ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں۔

اور یہ کچھ مصر اور بخارا تک ہی محدود نہیں۔ اب تو ہمارا عام شیوہ یہ ہو گیا ہے کہ اُدھر کوئی قومی مصیبت آئی اور ادھر ہم نے مسجدوں میں دعائیں مانگنا، مناجاتیں پڑھنا اور اذانیں دینا شروع کر دیں۔ سکولوں میں آیت الکرسی کے ورد کے لئے چاندنیاں بچھ گئیں اور مزاروں پر ختمِ خواجگان شروع ہو گئے، آپ نے جمعہ کے ہر خطبہ میں خطیب صاحب کو یہ کہتے سُنا ہو گا کہ ۔۔۔ اَللّٰھُمَّ دَمِّرْ دِیَارَھُمْ ۔۔۔ یا اللہ! تو اسلام کے دشمنوں کی بستیوں کو تباہ کر دے ۔۔۔ اَللّٰھُمَّ شَتِّتْ شَمْلَھُمْ ۔۔۔ یا اللہ! تو ان کی اجتماعیت کو منتشر کر دے۔ ہم صدیوں سے اپنے خطبوں میں یہ دعائیں

مانگتے اور سامعین ان پر نہایت خشوع و خضوع سے آمین، اَللّٰھُمَّ آمین کے نعرے بلند کرتے چلے آرہے ہیں اور اسلام کے دشمنوں کی بستیاں دن بدن ترقی کرتی اور ان کی اجتماعیت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جارہی ہے ۔۔۔ اذانوں میں بے شک زلزلہ انگیز قوت اور دعاؤں میں لاریب جمعیتِ خاطر کا سامان ہوتا ہے لیکن انہی کی اذانوں اور دعاؤں میں جن کے بازو غار اشگاف اور جن کے حوصلے آہن گداز ہوں،

قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں!

بہرحال ہم اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ یہودیوں کو ابدالاباد تک حکومت نصیب نہیں ہوسکتی اور انہوں نے اسلام دشمن اور مسلم کش سلطنتوں کی مدد سے، پہلے فلسطین کے ایک حصے میں اپنے قدم جمائے اور اس کے بعد، اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لی کہ جب ۱۹۶۷ء میں ان سے عربوں کا ٹکراؤ ہوا تو انہوں نے چھ گھنٹے کی جنگ میں انہیں ایسی فاش شکست دی کہ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی اور یوں ہماری ان خوش فہمیوں کے پردے چاک ہوگئے کہ یہودیوں کو ابدالاباد تک حکومت نہیں مل سکتی اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے اس عظیم دعوے کی صداقت بھی سامنے آگئی کہ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ (۴/۱۲۳) قوموں کی تقدیروں کے فیصلے کسی کی خوش فہمی کی رُو سے نہیں ہوا کرتے۔ ان کے فیصلے ان کے اپنے اعمال و کردار کے مطابق ہوتے ہیں اور یہی اس باب میں حرفِ آخر اور قولِ فیصل ہے۔

فاوحینا الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر ؕ [۲۶ / ۶۳]

برقِ طور

عروج و زوالِ امم کا عبرت انگیز مرقع

از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ
جگرِ بحر شگافید و بہ سینا نرسید

حضرت موسیٰ علیہ السلام

داستانِ بنی اسرائیل

یوں تو قصصِ قرآنی کا ہر ٹکڑا عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور جوں جوں نگہ دوررس غور و تدبر سے ان کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے ان کے حقائق و رموز، زمانہ کی پیچ در پیچ لہروں کی طرح خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان قصص میں داستانِ بنی اسرائیل کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول و مبادی، اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیئے گئے ہیں کہ وہ بصائر و حکم کا ایک سبق آموز مرقع بن گئی ہے۔ فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے۔ تین گوشے نمایاں طور پر ابھرے ہوئے نظر آئیں گے: استبدادِ حکومت کی سرکش طغیانیاں، برہمنیت کی خواب آور فریب کاریاں اور سرمایہ داری کی پُرسکوت خون آشامیاں۔ ان میں سے ہر فتنہ بجائے خویش انسانیت کا گلا گھونٹ دینے کے لئے کافی ہے لیکن ذرا سوچیئے کہ جس دور میں بیک وقت سطحِ ارض پر سبعیت و بربریت کے ایسے ہولناک عفریت، فضا میں تباہی و بربادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم اور دریا کی پُرسکون روانیوں کے نیچے ایسے خوفناک نہنگ و اژدر موجود ہوں، وہاں مخلوقِ خدا پر کیا گذر رہی ہوگی؟ تاریخ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس شرح و بسط سے آیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ، ہامان، برہمنیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر اور قارون، سرمایہ داری کی لعنت کا بہت

فسادِ آدمیت کے تین گوشے

اور تینوں یک جا

بڑا نمائندہ، تینوں یک جا اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی، پھڑکتی، بلبلاتی انسانیت! حضرات انبیائے کرامؑ کی انقلاب انگیز بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کے جور و استبداد سے چھڑا کر براہِ راست قانونِ خداوندی کی اطاعت میں لے آئیں. جو قومیں اس قسم کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت کلیتہً کھو چکتی ہیں وہ اپنے اعمال کے فطری نتائج کی بنا پر ہلاک ہو جاتی ہیں. لیکن جن میں ہنوز "صحت یابی" کا امکان ہوتا ہے ان کا علاج کیا جاتا ہے. بنی اسرائیل کی نئی نسل میں صحتیابی کی صلاحیت موجود تھی. لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ ایک بےکس و مظلوم قوم کو، ایک سرکش قوم کے دندانِ حرص و آز اور پنجۂ خونیں سے چھڑانے کے لئے کس قدر کوہ تمثال پیکرِ جبروت و جلال اور مظہرِ استقامت و استقلال، مصلحِ اعظم کی ضرورت تھی جو قانونِ خداوندی کی راہ نمائی میں باطل کی ان انسانیت سوز قہرمانی قوتوں کے استیصال کے لئے مقابلہ میں آئے اور اپنی ضربِ کلیمی سے، استبداد و فرعونیت کے ان طاغوتی مجسموں کو پاش پاش کر دے. وہ تھی قوم اور یہ تھے اس قوم کی کشتی کے ناخدا! لہٰذا قرآنِ کریم، جس کے پیشِ نظر، استبداد و قہرمانی کی طاغوتی قوتوں کی تخریب اور انسانیت کی سرفرازی و برومندی کا مقصدِ عظیم ہے، اس قوم کے احوال و کوائف اور اس داعیٔ انقلاب کے تذکارِ جلیلہ کو جس قدر بھی شرح و تفصیل سے بیان کرتا بجا اور ضروری تھا۔

بنی اسرائیل اور یہودی

"جوئے نور" میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مردِ خدا) تھا. آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں. حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (JUDA) تھا. جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ، فلسطین کے علاقہ 'JUDA' میں حکمران تھا. انہیں اسی نسبت سے یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل. لیکن بعد میں یہ تفریق عام طور پر باقی نہ رہی. اب بنی اسرائیل اور یہودی سے بالعموم ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا. لیکن "جوئے نور" میں بیان کردہ قصۂ حضرت یوسفؑ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ (حضرت یوسفؑ) نے اپنے والدِ بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا. حضرت یوسفؑ کی وجہ سے ان کی یہاں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی. چار سو برس تک یہ مصر میں رہے. یہیں بڑھے، پھولے، پھلے. اور جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا اس عرصہ میں ایک کثیر التعداد قوم بن گیا. یہ ہے وہ زمانہ جس سے ہمارے

موجودہ قصہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کا زمانہ قریب (۲۱۰۰) ق م تھا۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کا زمانہ قریب (۱۶۰۰/۱۷۰۰ ق م) قیاس کرنا چاہیئے۔ قصۂ حضرت یوسفؑ میں ہم فرعون کے لفظ سے آشنا

فرعون

ہو چکے ہیں۔ یہ کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں، بلکہ شاہانِ مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ آمن رع (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فارآع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ قریب تین ہزار سال (ق م) سے لے کر سکندر کے زمانہ تک، فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے[1]۔ حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں ہیکسوس[2] (HYKSOS) کا خاندان برسرِ حکومت تھا جنہیں عمالقہ کہتے تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی یہی خاندان مصر پر حکمران تھا۔ لیکن بعض علمائے اثریات و مکتشفینِ مصریات کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ابتدائی زمانے کے فرعون کا نام ریمیسس ثانی (RAMESES II) تھا، اور خروج کے وقت کا بادشاہ، اس کا بیٹا منفتاح (Merneptah) تھا۔ اگرچہ بعض شواہد اس کی تردید کرتے ہیں[3]۔ بالخصوص اس لئے کہ منفتاح کے زمانہ کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل فلسطین میں متمکن ہو چکے تھے (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)۔ بہرکیف، عام اندازہ یہی ہے کہ یہ زمانہ (۱۵۰۰ ق م) سے پہلے کا ہے۔ یہ سب قیاسات ہیں جن سے قرآنِ کریم بحث نہیں کرتا، اس لئے کہ اس کا کام ان حقائق کو پیش کرنا ہے جو ان واقعات میں مضمر ہیں، نہ کہ وقائع نگاری۔

---

[1] فراعنہ کا سب سے آخری خاندان اہلِ فارس کا تھا جسے سکندر نے (۳۳۲ ق م) میں شکست دی تھی۔

[2] چرواہے بادشاہ۔ قیاس یہ ہے کہ دراصل یہ عرب قبائل ہی کی ایک شاخ تھی۔

[3] ڈاکٹر BREASTED کی کتاب A HISTORY OF EGYPT مصرِ قدیم کی تاریخ پر مشہور تصنیف ہے (اس وقت میرے سامنے اس کا ۱۹۵۴ء کا ایڈیشن ہے)۔ اس کی تحقیق کی رُو سے ہیکسوس کا زمانہ ۱۷۸۸ سے ۱۵۸۰ ق م تک کا تھا اور ریمیسس ثانی کا عہد ۱۲۹۲ لغایت ۱۲۲۵ ق م۔ منفتاح نے ۱۲۲۵ سے ۱۲۱۵ ق م تک حکومت کی تھی۔

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اس چار سو سال کے عرصہ میں بنی اسرائیل مصر میں ایک مستقل قوم کی حیثیت اختیار کر گئے تھے جو اہلِ مصر سے الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ جیسا کہ انسانی حکومتوں کا قاعدہ ہے، فرعونِ مصر اس

فرعون کا خطرہ

"اجنبی" قوم کی بڑھتی ہوئی قوت وکثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کر دیں۔ اس لئے اس نے انہیں کچلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ تورات میں ہے:-

> لیکن اسرائیل کی اولاد برومند ہوئی اور بہت بڑھی اور فراواں ہوئی اور نہایت زور بپیدا کیا اور وہ زمین ان سے معمور ہو گئی۔ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسف کو نہ جانتا تھا پیدا ہوا اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا، دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جاویں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جاویں۔ اس لئے انہوں نے ان پر خراج کے لئے محصّل بٹھلائے تاکہ انہیں اپنے سخت کاموں کے بوجھ سے ستائیں۔ اور انہوں نے فرعون کے لئے خزانے کے شہر پتوم اور رعمسیس بنانے پر انہوں نے جتنا انہیں دُکھ دیا وہ زیادہ تر بڑھے اور فراواں ہوئے۔ اور وہ بنی اسرائیل کے سبب ناخوش ہوئے اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں، جو وہ اُن سے کرواتے تھے مشقت کی تھیں۔ (خروج ۷ـ ۱/۱۴)

فرعون کے قلب و دماغ پر یہ خوف اس درجہ مسلط ہو گیا کہ اس نے یہیں تک اکتفا نہیں کیا بلکہ، تورات کے بیان کے مطابق، یہ حکم بھی دے دیا کہ بنی اسرائیل کی کثرت کو روکنے کے لئے، ان کے بیٹوں کو ہلاک کر دیا جائے اور ان کی بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں۔

> تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو جن میں سے ایک کا نام سفرہ اور دوسری کا نام فوعہ تھا، یوں کہا۔ اور اس نے کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے لئے تم دائی کا کام کرتی ہو اور تم انہیں پتھروں پر دیکھو۔ اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور اگر بیٹی ہو تو اسے جینے دو۔
>
> خروج ۱۵ـ ۱/۱۶)

"ذبح ابنار" کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں ہے۔

وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۝ (۲/۴۹)

اور (اپنی تاریخ حیات کا) وہ وقت یاد کرو، جب ہم نے تمہیں خاندانِ فرعون (کی غلامی) سے جنہوں نے تمہیں نہایت سخت عذاب میں ڈال رکھا تھا، نجات دی تھی۔ وہ تمہارے ابنار ذبح کرتے تھے اور نسار کو زندہ رکھتے تھے اور فی الحقیقت اس صورتِ حال میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے بڑی ہی آزمائش تھی!

لیکن بعض کا خیال ہے (اور میں بھی اس کا مؤید ہوں) کہ اس سے مراد سچ مچ بچوں کا ذبح کرنا نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر اس حکم پر ایک نسل تک بھی عمل درآمد ہوتا تو مصر سے بنی اسرائیل کا نام و نشان تک مٹ جاتا لیکن وہ حضرت موسےٰؑ کے زمانہ میں بھی اتنی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نیز ان کے زمانہ میں ان کے بھائی حضرت ہارونؑ بھی موجود تھے جو اُن سے بڑے تھے۔ اگر لڑکے ذبح ہوجایا کرتے تو ہارونؑ کس طرح زندہ بچ جاتے؟ پھر، قرآن میں دوسرے مقام (۴۰/۲۵) پر ہے کہ فرعون نے یہ حکم دیا تھا کہ جو لوگ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائیں ان کے لڑکوں کو ذبح کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبحِ ابنار کا حکم حضرت موسےٰؑ کی پیدائش کے وقت موجود نہیں تھا۔ ذبح اور قتل سے مراد ذلیل و خوار کرنا بھی ہے "ابنارِ قوم" سے مراد ہیں بنی اسرائیل کے وہ لوگ جن میں جوہرِ مردانگی نظر آتا تھا اور "نسارِ قوم" سے مقصود ہیں وہ لوگ جو ان جوہروں سے عاری تھے۔ قرآن میں ہے (۲۸/۴) کہ فرعون (ہر مستبد اور فریب کار حاکم کی طرح) اس قوم میں پارٹیاں پیدا کرتا رہتا تھا۔ ایک پارٹی کو معزز و مکرم بنا کر آگے بڑھاتا اور دوسری پارٹی کو ذلیل و خوار کرکے پیچھے ہٹاتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑاتا بھڑاتا رہتا۔ وہ بنی اسرائیل (قومِ محکوم) کے اُن افراد کو آگے بڑھاتا جو نہایت کمزور اور خصائصِ مردانگی سے عاری ہوتے اور ان کے ان فرزندانِ جلیل کو ذلیل کرتا جن میں اُسے جوہرِ مردانگی نظر آتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مقصد کے پیشِ نظر، بنی اسرائیل کے اونچے خاندانوں کے لڑکوں کو بچپن ہی سے ایسی حالت میں رکھتا ہو کہ وہ صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رہیں اور اس طرح بڑے ہو کر ذلیل و خوار ہو جائیں۔ (جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا) ممکن ہے کہ حضرت موسےٰؑ کی والدہ کو اپنے بچے کے متعلق

اسی قسم کا خوف لاحق ہوا ہو۔ ان کا گھرانا بڑا معزز نظر آتا ہے۔

بہرحال قرآن نے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کہہ کر ان تمام مظالم کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو ایک مستبد حاکم قوم، محکوم قوم پر روا رکھا کرتی ہے۔ یہ ہے وہ زمانہ جب حضرت موسیٰؑ کا ظہور ہوا۔

پیدائشِ حضرت موسیٰؑ

حضرت موسیٰؑ کی پیدائش دارالسلطنت میں ہوئی۔ آپ پیدا تو ہوئے محکوم قوم کے گھرانے میں لیکن مشیّت کا پروگرام کچھ اور تھا۔ قصّۂ حضرت یوسفؑ میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ جب مشیّت کو منظور ہوا کہ کنعان کا چرواہا، منصب حکومت پر متمکن ہو تو آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لئے کس طرح آپ کو مصری محلات میں پہنچایا گیا۔ یہاں بھی مشیّت کو یہ منظور تھا کہ حضرت موسیٰؑ سیاستِ مصر کے رموز و اسرار سے واقف ہوں، اس لئے آپ کی ابتدائی پرورش و تربیت کے لئے بھی مصر کے شاہی محلات کو منتخب کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل محکومیت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور محکومیت بھی ایسی ذلّت و بے کسی کی۔ ان حالات میں انہیں امورِ مملکت میں حصّہ لینے کا کوئی موقعہ حاصل نہ تھا۔ مستبد حکومتیں، غلاموں کو شریکِ حکم نہیں کیا کرتیں۔ زیادہ سے زیادہ (بقول علامہ اقبالؒ) ان کے "جوہرِ ادراک" خرید لیتی ہیں۔ اندریں حالات حضرت موسیٰؑ کے لئے امورِ سیاست و حکومت سے بہرہ یاب ہونے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس لئے مشیّتِ ایزدی نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ آپ کی پرورش اس انداز سے ہو کہ رموزِ سیاست و مملکت سب آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوں۔ تورات میں چونکہ "ذبحِ ابناء" سے مفہوم لڑکوں کا سچ مچ قتل کر دینا لیا گیا ہے اس لئے حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلہ میں وہاں مذکور ہے کہ فرعون نے اگرچہ مصری دائیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے بچّوں کو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیا کریں۔ لیکن، اس حکم کی شدّت سے پابندی نہیں ہو رہی تھی۔

> پر دائی جنائیاں خدا سے ڈریں اور جیسا کہ مصر کے بادشاہ نے انہیں حکم کیا تھا نہ کیا اور لڑکوں کو جیتا رہنے دیا۔ (خروج ۱/۱۷)

سپردِ دریا

قرآن میں ہے کہ بچّے کی پیدائش پر (حضرت موسیٰؑ کی) والدہ کو تردّد لاحق ہوا۔ اگر فرعون کا حکم بچّوں کو سچ مچ قتل کرنے کا تھا تو یہ تردّد بچّے کی جان کی حفاظت کے لئے ہو سکتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اگر اس حکم سے مراد یہی تھی کہ معزز خاندانوں کے

بچّوں کو ایسی ذلّت کی حالت میں رکھا جائے جس سے ان کے جوہرِ مردانگی اور خصائصِ آدمیت تباہ و برباد ہو جائیں تو ایک حسّاس ماں کے لئے یہ چیز بھی کچھ کم وجۂ پریشانی نہیں ہو سکتی۔ بہرحال، قرآن میں ہے کہ جب حضرت موسٰےؑ کی والدہ کو اس قسم کا تردّد لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی برگزیدہ بندے (نبی) کی وساطت سے اس کی طرف یہ حکم بھیجا[1] کہ وہ بچّے کو دریا میں بہا دے۔

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡہِ فَاَلۡقِیۡہِ فِی الۡیَمِّ وَ لَا تَخَافِیۡ وَ لَا تَحۡزَنِیۡ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡہُ اِلَیۡکِ وَ جَاعِلُوۡہُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۷﴾ (۲۸/۷)

اور ہم نے موسیٰؑ کی ماں کی طرف یہ حکم بھیجا کہ بچّے کو دودھ پلاؤ اور جب اس کے متعلق خوف (محسوس) ہو تو اسے دریا میں ڈال دو۔ اور (دیکھنا دریا کے سپرد کر دینے میں) نہ ڈرنا نہ غم کھانا۔ ہم اسے تیری طرف واپس لے آئیں گے اور اسے اپنے برگزیدہ رسولوں میں سے بنائیں گے۔

غور کیجئے اُمِّ موسٰےؑ کو کس قدر تسکین دی جا رہی ہے اس لئے کہ کسی ماں سے یہ کہہ دینا کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دے، اس کے قلبِ حزیں میں اضطراب و بیتابی کا تلاطم اور یاس و الم کی قیامت برپا کر دینا تھا۔ خدا کا حکم ہی ایسا کر سکتا تھا۔ (اس سے نظر آتا ہے کہ حضرت موسٰےؑ کا گھرانہ کس قدر خدا پرست تھا، یعنی اس کے احکام کا اطاعت گذار) چنانچہ وقت آنے حضرت موسٰےؑ کی والدہ نے بچّے کو دریا میں بہا دیا۔ لیکن مامتا کی بے تابی! بیٹی سے کہا کہ ذرا دُور ہٹ کر، دریا کے ساتھ ساتھ چلتی رہو اور دیکھتی رہو کہ بچّے پر کیا گذرتی ہے۔

وَ قَالَتۡ لِاُخۡتِہٖ قُصِّیۡہِ ۫ فَبَصُرَتۡ بِہٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾ (۲۸/۱۱)

اور (موسیٰؑ کی ماں نے) اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ سو وہ اسے دُور دُور سے دیکھتی رہی اور (فرعون کے لوگوں نے) محسوس بھی نہ کیا (کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے)۔

بچّہ صندوق میں بہے جا رہا تھا کہ ایک موج نے صندوق کو جانبِ ساحل پہنچا دیا جہاں وہ مصری لوگوں

---

[1] اَوۡحَیۡنَا کے ان معانی کے لئے میری "لغات القرآن" دیکھئے۔

کی نظر پڑ گیا جو (معلوم ہوتا ہے کہ) محلاتِ شاہی سے متعلق تھے۔ انہوں نے بچے کو باہر نکالا اور،

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ ۝ (۲۸/۸)

پس فرعون کے لوگوں نے اسے لے لیا تاکہ وہ ان کے لئے دشمن اور (موجبِ) غم والم ہو۔
فرعون اور ہامان اور ان کے لاؤ لشکر بلاشبہ خطا کار تھے (اور ان کی خطا کاریوں کی سزا اس بچہ کے ہاتھوں ملنے والی تھی)۔

کہاں سے کہاں؟

وہ بچے کو محلاتِ شاہی میں لے آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں انہوں نے (بچے کے خط و خال) سے اندازہ لگا لیا کہ وہ اسرائیلیوں کا بچہ ہے اس لئے اسے نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھا گیا۔ لیکن بچوں کے معاملہ میں فطرتِ نسائیت کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے فرعون کی بیوی نے جب بچے کو دیکھا تو اپنے خاوند سے کہا کہ اسے مار نہ دیا جائے یا ذلیل و حقیر سمجھ کر پھینک نہ دیا جائے۔ اسے میں اپنی گود میں لے لینا چاہتی ہوں[1]۔ (غالباً ان کے ہاں اس وقت تک کوئی اولاد نہیں تھی)۔

وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَ لَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ٭ۖ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ (۲۸/۹)

اور فرعون کی بیوی نے کہا کہ (یہ بچہ) میرے لئے اور تیرے لئے آنکھ کی راحت (ہوسکتا) ہے۔
اسے مار نہ ڈالو (یا ذلیل نہ کرو) شاید وہ ہمارے لئے نفع کا موجب ہو یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنالیں۔
لیکن وہ نہیں جانتے تھے (کہ مشیت کے پروگرام کیا ہیں؟)۔

" وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ " پر غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم کا حسنِ بلاغت کس قدر دلآویز ہے۔ ایک واقعہ بیان ہو رہا ہے لیکن ذہن کو کہانی کی دلچسپی میں کھونے نہیں دیا جاتا، بلکہ اسے فوراً مآل (نتیجہ) کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ تشبیب سے گریز کا یہ اسلوب کس درجہ لطیف ہے؟

---

[1] قرآن نے فرعون کی بیوی کے ایمان کی بھی شہادت دی ہے (۶۶/۱۱) اس لئے انسانی بچوں کے ساتھ یہ جذبۂ محبت ایمان کا تقاضا (یا نتیجہ) بھی ہوسکتا ہے۔

جب بیٹی نے ماں سے آکر کہا ہوگا کہ بچے کو فرعون کے لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں تو ماں کا دل بیم و رجا کی کش مکش میں جس قدر طلسمِ پیچ و تاب بنا ہوگا ظاہر ہے۔ دیکھئے قرآن کریم نے اس نفسیاتی کیفیت کو کیسے دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۸/۱۰)

اور موسیٰؑ کی ماں کا دل (صبر و شکیب سے) خالی ہوگیا اور قریب تھا کہ وہ (وفورِ اضطراب سے) اس راز کو افشا کر دیتی اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کر دیتے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو (کہ خدا نے جو وعدہ کیا تھا وہ سچا ہو کر رہے گا)۔

اگر ہم اس کے دل کو تھامے نہ رہتے تو بعید نہ تھا کہ وہ جوشِ محبت میں مصلحت کوشیوں کو یکسر بھول جاتی اور راز کو چھپا نہ سکتی۔" لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا سکون عطا فرما دیا کہ اس نے دل پر قابو رکھا۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی بہن، صندوق کو دیکھتی جا رہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہن نے وہیں تک ہی تعاقب نہیں کیا بلکہ محلات کے اندر تک رسائی کا انتظام بھی کر لیا (شاید خادمہ کی حیثیت سے پہنچ گئی ہوں یا پہلے ہی سے محل تک ان کی رسائی ہو۔ قرآن سے ایسا ہی پایا جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد فرعون کی بیوی سے جو بات چیت ہوتی ہے وہ اجنبیوں جیسی نہیں بلکہ متعارف حیثیت لئے ہوئے ہے)۔ محل میں فیصلہ ہوگیا کہ فرعون کی بیوی بچہ کی پرورش کرے گی۔ اب مشیتؔ، اپنی تدبیر کی دوسری کڑی سامنے لے آئی۔ بہتیری اتائیں دودھ پلانے پر متعین کی گئیں لیکن بچہ ہے کہ کسی کی طرف دھیان ہی نہیں کرتا۔ فکر لاحق ہوئی کہ اب کیا کیا جائے؟ اسکا علاج بچہ کی بہن نے (بغیر بتلائے کہ بچہ کون ہے) تجویز کر دیا۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝ (۲۸/۱۲)

اور ہم نے بچہ کو پہلے ہی سے دودھ پینے سے روک دیا۔ سو (اس کی بہن نے) کہا کہ کیا میں تمہیں ایسا گھرانہ بتاؤں جو اسے تمہارے لئے نہایت خیر خواہی سے پال پوس دے۔

یہ دودھ پلانے والی کون تھی؟ خود اُمِّ موسیٰؑ۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ

اللّٰہِ حَقٌّ وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَھُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝ (۲۸/۱۳)

سو ہم نے موسیٰؑ کو (یوں) اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ غم نہ کرے اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے (کہ مشیّت اپنی تدابیر کس طرح بروئے کار لایا کرتی ہے)۔

جب حضرت موسیٰؑ کو شرفِ نبوّت سے سرفراز فرمایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس احسان کی بھی یاد دلائی تھی۔ (دیکھئے ۳۷-۴۰/۲۰)۔

ایوانِ شاہی میں پرورش

یوں حضرت موسیٰؑ نے ایوانِ شاہی میں پرورش پائی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و بصیرت اور رموز و اسرارِ مملکت سے بہرہ یاب فرمایا۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسۡتَوٰۤی اٰتَیۡنٰهُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ؕ وَکَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝ (۲۸/۱۴)

اور جب (موسیٰؑ) اپنی جوانی کو پہنچا اور (ہر طرح سے) توانا ہو گیا تو ہم نے اسے علم و حکم عطا کیا اور اس طرح ہم ان لوگوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں۔

"محسنین" سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کی کیفیت، محلات میں پرورش یافتہ امیرزادوں کی سی نہ تھی جن کی زندگی بالعموم جوانی کی رنگین مستیوں میں شرابور ہوتی ہے۔ بلکہ آپ پر ماحول کا کچھ اثر نہ تھا اور آپ دماغی قابلیت کے ساتھ ساتھ حُسنِ سیرت کی نعمت سے بھی سرفراز کئے گئے تھے۔ یہی ایک رسول کی سیرت کا خاصہ ہے کہ وہ (زمانہ قبل از نبوّت میں بھی) ماحول سے متاثر نہیں ہوتی۔ (تفصیل "ابلیس و آدم" میں وحی کے عنوان میں گذر چکی ہے)۔

اب ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوئی۔ ایک دن وہ سوفتہ میں شہر کا چکر لگا رہے تھے کہ دیکھا ایک اسرائیلی اور ایک قبطی (قوم فرعون کا فرد)

قبطی کا قتل

آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ اسرائیلی نے آپ سے فریاد کی۔ آپ نے اسے برحق سمجھتے ہوئے قبطی کے مُکّا مارا۔ مارا تو مُکّا ہی تھا لیکن اس میں ضربِ کلیمی کی جلالت پنہاں تھی۔ قبطی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ کا ارادہ قتل کا نہیں تھا، محض تادیباً مُکّا مار دیا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اس سے مر ہی گیا آپ کو بہت افسوس ہوا۔ قرآن میں ہے۔

وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ .... قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝ (۲۸/۱۷–۱۵)

وہ شہر میں اس کے باشندوں کی غفلت کی حالت میں داخل ہوا تو اس میں دو شخصوں کو لڑتے پایا۔ ان میں سے ایک اس کی قوم میں سے تھا اور دوسرا دشمنوں میں سے تھا۔ جو اس کی قوم میں سے تھا اس نے موسیٰؑ سے اپنے دشمن کے خلاف مدد مانگی۔ پس موسیٰ نے (دوسرے شخص کو غلطی پر سمجھتے ہوئے) اسے ایک مُکا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ (جب دیکھا کہ وہ تو مر ہی گیا تو فرطِ تاسّف سے کہا کہ او ہو) یہ تو شیطان کے عمل کی وجہ سے ہو گیا۔ وہ یقیناً دشمن اور کھلا ہوا گمراہ کرنے والا ہے۔

عرض کیا کہ اے میرے رب! میں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے۔ سو تو میری حفاظت فرما۔ سو اللہ نے اس کی حفاظت فرمائی کہ وہ غفور الرحیم ہے۔ موسیٰؑ نے کہا کہ میرے رب! اس لئے کہ تو نے مجھ پر (اس حفاظت سے) انعام کیا ہے میں (اب) کبھی مجرموں کا مددگار نہ ہوں گا۔

آخری آیت سے مترشح ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ قصور دراصل اسرائیلی کا تھا۔ لیکن اس سے پہلے آپ کو اس کا علم نہ تھا۔ اس لئے کہ جو شخص دیدہ و دانستہ کسی مجرم کی حمایت کرے اسے اپنے کئے پر تاسّف و ندامت نہیں ہوا کرتی۔

اسرائیلی کی حمایت کیوں تھی؟

یہ بھی واضح رہے کہ اسرائیلی کی حمایت کسی نسلی عصبیت کی بنا پر نہ تھی۔ ہم شروع سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیائے کرامؑ کے نزدیک نسلی عصبیت، حتّٰی کہ خون کے رشتے بھی، کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک یگانگت اور بیگانگی کا معیار، حق و باطل کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہی وہ تعلیم ہے جس کی تبلیغ کے لئے ان کی بعثت ہوتی ہے۔ (اور ان کا طرزِ عمل نبوت ملنے سے پہلے بھی اپنی اصولی تعلیم کے خلاف نہیں ہوتا)۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں قبطی مستبد قوتوں کے مالک تھے اور اسرائیلی بے حد مظلوم و مقہور۔ اس لئے آپ پر مظلوموں اور بے کسوں کی حمایت ضروری تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ آپ بھی نسلی اعتبار سے اس قوم سے متعلق

تھے جو مظلوم تھی. ورنہ اگر قبطی مظلوم اور اسرائیلی بالادست ہوتے تو آپ یقیناً قبطیوں کے طرفدار ہوتے یا اگر اسرائیلی مظلوم تھے تو خواہ آپ قبطی النّسل ہی کیوں نہ ہوتے آپ مظلوموں کی حمایت کرتے. اس لئے آپ نے جب قبطی کو مُکّا مارا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ دوسری قوم کا فرد تھا، بلکہ اس لئے کہ قبطیوں کے مظالم اور اسرائیلیوں کی مظلومیت ایک ایسی مسلّمہ حقیقت تھی جس کے لئے بداہتاً کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی. لیکن بعد میں تاسّف و ندامت اس لئے تھا کہ ایک کلیہ کے ماتحت اسرائیلی کو مظلوم کیوں سمجھ لیا اور اصل بات کی تحقیق کیوں نہ کی؟

دوسرے دن حضرت موسیٰؑ پھر شہر میں جا رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ وہی اسرائیلی کسی اور سے جھگڑ رہا ہے۔ اُس نے آپ کو پھر مدد کے لئے پکارا. آپ نے کہا کہ تم بڑے جھگڑالو ہو. ہر ایک سے لڑتے جھگڑتے ہو.

فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَۃِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَہٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُہٗ ط قَالَ لَہٗ مُوْسٰٓی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (۲۸/۱۸)

موسیٰ (دوسرے دن) صبح شہر میں آیا. ڈرتے ڈرتے اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے (یہ جاننے کے لئے کہ کل کے واقعہ کا شہر میں کیا چرچا ہے۔ وہ اس طرح جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا) وہی شخص جس نے اس سے کل مدد مانگی تھی اسے مدد کے لئے پکار رہا ہے. موسیٰ نے اسے کہا کہ تو بڑا غلط کار ہے.

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی نے جب کیفیت بیان کی تو حضرت موسیٰؑ کو یقین ہو گیا کہ آج وہ فی الواقعہ مظلوم ہے اور قبطی اس پر زیادتی کر رہا ہے. ورنہ اگر یہ ظاہر ہو جاتا کہ اسرائیلی مجرم ہے تو حضرت موسیٰؑ کبھی اس کی حمایت کے لئے آگے نہ بڑھتے اس لئے کہ ابھی کل ہی آپ نے اپنے ربّ سے وعدہ کیا تھا کہ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَہِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ (کہ میں مجرموں کا کبھی مددگار نہیں ہوں گا). اس لئے آپ اسرائیلی کو مجرم جانتے ہوئے اس کی مدد کے لئے کبھی نہیں بڑھ سکتے تھے. آپ نے ہاتھ آگے بڑھایا. یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک کل کے واقعۂ قتل کا چرچا عام ہو گیا تھا. اس لئے یہ قبطی دستِ قضا کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر چلایا.

ل واضح رہے کہ قرآنِ کریم کسی قصہ کی تمام کڑیاں بیان نہیں کرتا بلکہ ان کڑیوں کو چھوڑ جاتا ہے جو قصہ کے سیاق و سباق کا لازمی نتیجہ ہوں اور نفسِ واقعہ یا قصہ کے کرداروں سے واقف انسان انہیں بآسانی پُر کرے. واقعہ زیرِ نظر میں آیت ۱۸ اور ۱۹ کے درمیان اتنا حصہ محذوف ہے کہ اسرائیلی نے جب واقعہ بیان کیا تو حضرت موسیٰؑ کو یقین ہو گیا کہ وہ فی الواقعہ مظلوم ہے اس لئے آپ اس کی حمایت کے لئے آگے بڑھے. اس قیاس کی دلیل وہی وعدہ ہے جو آپ نے اپنے ربّ سے کیا تھا اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے.

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى
اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ
اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝

(۲۸/۱۹)

جب (موسےٰؑ نے) ارادہ کیا کہ اسے پکڑلے جو (اُن) دونوں کا دشمن تھا (یعنی قبطی) تو اس (قبطی) نے کہا کہ اے موسےٰ! کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے بھی قتل کردے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کردیا تھا۔ تیرے تو یہ ارادے دکھائی دیتے ہیں کہ ملک میں (سب سے زیادہ) جابر تو ہی ہوجائے۔ تو تو اصلاح کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔

سازش

یہ تو کہا نہیں جاسکتا کہ فرعون اور اس کے اراکینِ سلطنت کو حضرت موسےٰؑ کے اسرائیلی ہونے کا علم ہوچکا تھا یا نہیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ مظلوم اسرائیلیوں کے متعلق آپ کا جذبۂ ہمدردی اور انصاف کی ترازو میں اسرائیلی اور قبطی کے درمیان عدم امتیاز ان لوگوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا ہوگا۔ وہ اس فکر میں ضرور ہوں گے کہ کوئی واقعہ ملے تو آپ پر ہاتھ ڈالا جائے اور اس "فتنہ" کو وہیں دبا دیا جائے۔ اب جو یہ واقعہ سامنے آگیا تو انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا اور مشورہ کیا کہ حضرت موسےٰؑ کو قبطی کے قتل کے جرم میں قتل کردیا جائے تاکہ یہ مستقل کانٹا نکل جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی نیک طینت اللہ کا بندہ بھی تھا جو دل سے حضرت موسےٰؑ کی اس انصاف پسندی اور مظلوم نوازی کا قدردان تھا۔ قبل اس کے کہ اربابِ حکومت کا مشورہ، فیصلہ کی صورت اختیار کرے وہ بھاگا بھاگا آیا اور حضرت موسےٰؑ کو اطلاع کردی کہ ان کے خلاف کیا سازش ہو رہی ہے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ
الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ
النّٰصِحِيْنَ ۝ (۲۸/۲۰)

اور شہر کے آخری کنارہ کی طرف سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ اے موسےٰ! بڑے بڑے لوگ (اراکینِ سلطنت) تیرے متعلق مشورہ کررہے ہیں کہ تجھے قتل کردیا جائے۔ سو تو (یہاں سے) نکل جا۔ میں تیرے خیرخواہوں میں سے ہوں۔

(فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے)

چنانچہ اس پر حضرت موسیٰؑ مصر سے نکل آئے۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۚ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۲۸/۲۱)

سو (موسیٰؑ) ڈرتے ہوئے، اس کی نگرانی کرتے ہوئے (کہ پیچھے سے کوئی آن نہ پکڑے) وہاں سے نکل پڑا اور عرض کی۔ اے میرے ربّ! مجھے ان ظالموں سے بچائے رکھیو۔

مصر کے بعد مدین

مصر سے نکلے تو کوئی متعین منزل سامنے نہ تھی (لیکن مشیّت کے سامنے تو راستہ اور منزل دونوں متعین تھے)۔ مدین کی طرف رُخ کر لیا اور نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں کہ بھولے بھٹکوں کو وہیں سے نشانِ راہ مل سکتا ہے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○ (۲۸/۲۲)

اور جب (موسیٰؑ نے) مدین کی طرف رُخ کیا تو کہا کہ مجھے اُمید ہے کہ میرا ربّ مجھے سیدھے راستے پر لگا دے گا۔

چلتے چلتے مدین کی بستی کے قریب پہنچے۔ زبردست مظلومیت اور بالادست کا استبداد، جو مصر میں چھوڑ آئے تھے، یہاں بھی موجود تھے۔

مدین کا پیاؤ

پیاؤ پر اہلِ مدین اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ "قوت کا حق مستبد" (MIGHT IS RIGHT) زبردست اپنے مویشیوں کو آگے بڑھا رہے تھے اور دو کمزور اور ناتواں لڑکیاں اپنے جانوروں کو الگ لئے کھڑی تھیں کہ ان کے مویشی پانی پی جائیں تو تلچھٹ اِن کے جانوروں کے حصے آجائے۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ڭ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ سکتہ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ○ (۲۸/۲۳)

لہ (گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) "سول لائن" کی طرف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بڑا آدمی تھا۔ جبھی تو اُسے ارکانِ سلطنت کی اس سازش کا علم تھا۔

اور جب (موسےؑ) مدین کے پیاؤ پر پہنچا تو وہاں کچھ لوگوں کو (مویشیوں کو) پانی پلاتے دیکھا۔ (آدمیوں کے علاوہ) دو عورتوں کو بھی دیکھا جو (اپنے جانوروں کو) روک رہی تھیں۔ موسےؑ نے ان سے کہا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے (یوں الگ کھڑی ہوئی اپنی بکریوں کو روک کیوں رہی ہو؟) انہوں نے کہا کہ جب تک (یہ) چرواہے اپنے جانوروں کو نہ لے جائیں ہم پانی نہیں پلا سکتیں۔ (اس لئے کہ ہم کمزور عورتیں ہیں) اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن، اشارہ ہی اشارہ میں کتنی عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔ ان کی بھیڑیں پیاس سے بے تاب ہیں اس لئے بھاگ بھاگ کر پانی کی طرف جانا چاہتی ہیں (انہیں معلوم نہیں کہ وہ غریبوں اور کمزوروں کی بھیڑیں ہیں اس لئے انہیں اس کا حق نہیں پہنچتا کہ امیروں اور طاقتوروں کے مویشیوں کے ساتھ پانی پی سکیں۔ لیکن لڑکیاں اس حقیقت سے باخبر تھیں۔ اس لئے بھیڑیں آگے بڑھ رہی تھیں اور یہ انہیں روک رہی تھیں)۔

دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا جائے گا جب تک انسان خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا نہیں سیکھے گا!

بہرحال، حضرت موسےؑ نے جب یہ بات سُنی تو آپ آگے بڑھے اور ان کمزوروں کے جانوروں کو خود پانی پلایا اور پھر وہیں سائے میں آکر بیٹھ گئے اور دل میں کہنے لگے کہ

بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست

مصر کو چھوڑا تھا کہ وہاں حق و انصاف کے بجائے قوت و استبداد کا حکم نافذ تھا۔ جی میں تھا کہ کسی ایسی زمین میں جا بسوں جہاں کمزوروں کو ستانے والا کوئی نہ ہو لیکن یہاں تو کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں طاغوتی قوتیں درندوں کی طرح بپھری نہ پھر رہی ہوں۔

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ۝ (۲۸/۲۴)

سو اس نے ان عورتوں کے (مویشیوں کو) پانی پلایا اور پھر سایہ کی طرف لوٹ آیا اور (یہ سب ماجرا دیکھ کر) عرض کیا کہ اے میرے رب! تو جو بھلائی میری طرف بھیجے میں اس کا

غور کیجئے۔ یوں تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے (بلکہ یوں کہیئے کہ سلسلۂ داستان کے ضمنی گوشہ کی ایک ہلکی سی کڑی) لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس ذرہ میں کتنی بڑی حقیقتوں کے آفتاب

فطرت کی فیاضیاں اور انسانی تصرفات

جھلک رہے ہیں۔ مبدء فیض نے اپنی کرم گستری سے جو چیزیں نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے بلامزد و معاوضہ عطا کی ہیں، طاغوتی قوتیں ان پر بھی اپنا تسلط جما لیتی ہیں اور کمزوروں کا ان میں کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ مستبد قوتیں انہیں اپنی ملکیت سمجھتی ہیں اور باقی انسان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ خدا کی یہ وسیع و عریض زمین، دریاؤں کے زرفشاں پانی، زمین کے خزائن و دفائن سب خدا کی عطا فرمودہ نعمتیں ہیں جو کسی انسان نے اپنے کسب و ہنر سے پیدا نہیں کیں۔ لہٰذا ان پر ذاتی قبضہ ظلمِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ لہٰذا ان کی تقسیم اس طرح نہیں ہونی چاہیئے کہ جو صاحبِ قوت و اقتدار ہو وہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے قبضہ میں کر لے اور کمزور و ناتواں نانِ شبینہ تک کے بھی محتاج ہو جائیں۔ ان کی تقسیم انسانی ضروریات کے مطابق ہونی چاہیئے۔ جسے جس قدر ضرورت ہو اسے اس قدر مل جائے۔ اس لئے رزق کے سرچشموں پر کسی کا انفرادی قبضہ اور ملکیت جائز نہیں قرار پا سکتی[1]۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

لیکن یہ حقیقت منتظر اس وقت تک لباسِ مجاز میں نہیں آ سکتی جب تک مبدء فیض کی ان کرم گستریوں کی تقسیم انسانوں سے چھین کر اسی مبدء فیض کے سپرد نہ کر دی جائے جو ان تمام چیزوں کا حقیقی مالک اور رب العٰلمین ہے۔ اسی کا نام حکومتِ خداوندی ہے جس کے قیام و بقا کے لئے آسمانی رشد و ہدایت کے

---

[1] ناقۂ حضرت صالحؑ بھی اسی حقیقت کی ترجمان تھی۔ (دیکھئے جوئے نور، عنوان قوم ثمود صفحہ ۶۷، ایڈیشن دسمبر ۱۹۸۶ء)

سلسلہ کی ضرورت پڑی۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ملے گی)۔

لڑکیاں اپنے باپ کے پاس آئیں اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ واقعہ تھا بھی قابلِ ذکر۔ اس لئے کہ "قوت" کا کمزوروں کی مدافعت میں صرف ہونا کسی اور دیس کی ریت تھی۔ ان کی بستی میں اس روش سے کون آشنا تھا؟ وہ اپنے گھر میں بے شک اس اصول کے چرچے سنتی ہوں گی۔ لیکن باہر کی دنیا میں ایسا صاحبِ قوت و سطوت کہاں دکھائی دیتا ہوگا، جو اپنی قوت کو بیچاروں اور درماندوں کی حمایت میں صرف کردے؟ باپ نے بیٹی سے کہا کہ جاؤ، ایسے سعادت اطوار محسن کو گھر لے آؤ۔

فَجَآءَتۡهُ اِحۡدٰىهُمَا تَمۡشِىۡ عَلَى اسۡتِحۡيَآءٍ قَالَتۡ اِنَّ اَبِىۡ يَدۡعُوۡكَ لِيَجۡزِيَكَ اَجۡرَ مَا سَقَيۡتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيۡهِ الۡقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفۡ ۖ نَجَوۡتَ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۝ (۲۸/۲۵)

سو ان دو (لڑکیوں) میں سے ایک (نہایت شرم و) حیا سے موسیٰ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے والد نے آپ کو بلایا ہے تاکہ آپ نے جو ہمارے (مویشیوں کو) پانی پلایا ہے اس کا اجرِ خدمت دیں۔ سو جب (موسیٰ) اس کے پاس آیا اور اس سے اپنی سرگذشت بیان کی تو اس نے کہا کہ خوف مت کھاؤ۔ تم ظالموں (کی گرفت) سے بچ گئے۔

جب حضرت موسیٰؑ وہاں ٹھہر گئے تو ایک لڑکی نے اپنے والد سے تجویز کیا کہ اس صالح نوجوان کو اپنے ہاں ملازم کیوں نہ رکھ لیا جائے۔

قَالَتۡ اِحۡدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡهُ ۖ اِنَّ خَيۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِىُّ الۡاَمِيۡنُ ۝ (۲۸/۲۶)

ان میں سے ایک لڑکی نے اپنے باپ سے کہا کہ اباجان! اسے (اپنے ہاں) کارندہ کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ بہترین کام کرنے والا ثابت ہوگا۔ (اس لئے کہ یہ) قوی بھی ہے اور امین (دیانت دار) بھی۔

آخری الفاظ پر غور فرمائیے۔ معتمد علیہ کے لئے کیا کیا جوہر ضروری ہیں؟ صاحبِ قوت ہو، تاکہ وہ ہر طرح کا انتظام کرسکے اور اس کے ساتھ ہی امین بھی ہو۔

لڑکیوں کے والد نے تمام معاملہ پر غور کر کے ایک عمدہ شکل پیدا کی۔

قَالَ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡکِحَکَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ هٰتَیۡنِ عَلٰۤی اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ .... سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۝ (۲۸/۲۷)

اس نے (موسےٰ سے) کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تیرے ساتھ کردوں اس شرط پر کہ تو آٹھ سال تک میری نوکری کرے۔ پھر اگر تو دس سال پورے کردے تو یہ تیری طرف سے (حُسنِ معاملہ) ہوگا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تجھ پر (ناجائز) بوجھ ڈالوں۔ اگر اللہ نے چاہا تو تو مجھے اچھے لوگوں میں پائے گا۔

حضرت موسےٰؑ نے کہا بہت اچھا۔

قَالَ ذٰلِکَ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ ؕ اَیَّمَا الۡاَجَلَیۡنِ قَضَیۡتُ فَلَا عُدۡوَانَ عَلَیَّ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوۡلُ وَکِیۡلٌ ۝ (۲۸/۲۸)

(موسےٰ نے کہا) کہ یہ تیرے اور میرے درمیان (عہد) ہوا۔ جونسی مدت (آٹھ یا دس سال کی) میں پوری کردوں مجھ کوئی پابندی (یا زیادتی) نہ ہوگی۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں اس پر خدا کارساز ہے۔

("جوئے نور" میں) حضرت شعیبؑ کے قصہ میں بیان کیا جاچکا ہے کہ قیاس یہ ہے کہ یہ صاحب بزرگوار جن کے ہاں حضرت موسےٰؑ قیام پذیر ہوئے حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے لئے ایسا انتظام کردیا تھا کہ وہ فرعون کے محلّات میں پرورش پاکر سیاست کے رموز و اسرار سے واقف ہو جائیں۔ اب یہ سبیل پیدا کردی کہ سیاست کو حکومت خداوندی میں بدلنے کے قرینے سیکھ جائیں۔ حضرت شعیبؑ کے ہاں کی ملازمت محض گلہ بانی ہی نہ تھی بلکہ کلیم الٰہی کی تمہید تھی ؎

اگر کوئی شعیبؑ آئے میسّر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے (اقبالؒ)

مدین کے بعد

حضرت موسیٰؑ اپنی مدتِ معینہ تک مدین میں رہے (۲۰/۴۰)۔ جب یہ منزل بھی طے ہوئی تو اب سلسلہ آگے بڑھا۔ چرواہوں کی زندگی کچھ ایسی ہوتی ہے

کہ اپنے ریوڑ کو لیئے لئے مختلف چراگاہوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ آج اس جنگل میں، کل اس نخلستان میں، ایک چھوٹا سا خیمہ، چند ضروریات کی چیزیں، سر پر اللہ کا آسمان، سامنے اس کی کھلی ہوئی زمین، صاف ہوا، مصفّا پانی۔ اسی انداز میں، حضرت موسیٰؑ شبانی سے جہانبانی کے طریقے سیکھ رہے تھے کہ اب ایک اور منزل سامنے آئی۔ اندھیری رات، جاڑے کا موسم، جنگل کا سماں، اپنی بستی سے دُور، کوہِ طور کے دامن میں، شاید راستہ بھولے ہوئے، دور پہاڑ پر آگ دکھائی دی۔ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ میں جاتا ہوں۔ وہاں سے آگ کا انگارہ بھی لاتا ہوں اور راستہ کا اتا پتا بھی۔

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ (۲۸/۲۹)

سو جب موسیٰ نے (مدین میں) اپنی مدتِ معینہ پوری کر لی اور اپنے اہلِ خانہ کو ساتھ لے کر چلا تو طور کی جانب آگ دیکھی۔ اس نے اپنے اہلِ خانہ سے کہا کہ ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تمہیں وہاں سے (راستے کی) کوئی خبر لا دوں یا آگ کا انگارہ تاکہ تم تاپ سکو۔

تجلّی گاہِ طور

یہ سورۂ قصص کی آیت ہے۔ لیکن سورۂ طٰہٰ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اس لئے پہلے اس سورت کی متعلقہ آیات دیکھئے۔ فرمایا۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰی ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی ۝ (۲۰/۹-۱۰)

اور (اے پیغمبر) موسیٰ کی حکایت تُو نے سنی؟ جب اس نے (دُور سے) آگ دیکھی تو اپنے گھر کے لوگوں سے کہا "ٹھہرو، مجھے آگ دکھائی دی ہے۔ میں جاتا ہوں ممکن ہے تمہارے لئے ایک انگارا لے آؤں یا (کم از کم) الاؤ پر کوئی راہ دکھانے والا ہی مل جائے"۔

حضرت موسیٰؑ، آگ کے نشان پر نگاہ رکھے، اپنے دھیان میں چلے جا رہے تھے کہ کسی پکارنے والے نے آپ کا نام لے کر پکارا۔ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی ۝ (۲۰/۱۱)

پھر جب وہ وہاں پہنچا، تو اس وقت پکارا گیا۔ اے موسیٰ!

اس سنسان جنگل میں، جہاں کوئی واقف معلوم نہیں ہوتا تھا اپنا نام سنکر ٹھٹک کر رہ گئے کہ اتنے میں پکارنے والے نے خود ہی اس استعجاب کو رفع کر دیا۔ آواز آئی۔

اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ؕ (۲۰/۱۲)

میں ہوں تیرا پروردگار! پس اپنی جوتی اتار دے۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔

اس آیت سے عام طور پر وہی مفہوم لیا جاتا ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے لیکن جب ہم وَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو ایک بہت بڑی حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ دنیا میں عام طور پر حقائقِ کائنات کے معلوم کرنے کا ذریعہ عقل ہے۔ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے، یعنی وہ کسی ایک معاملہ کو لیتی ہے، اس کے متعلق کچھ فیصلہ کرتی ہے، اس فیصلہ پر عمل کرتی ہے اور پھر تجربہ بتاتا ہے کہ وہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط۔ غلط ہونے کی صورت میں وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے اور پھر اس پر تجربہ کر کے دیکھتی ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق بہت لمبا بھی ہوتا ہے اور گوناگوں مشکلات کا حامل بھی۔ اس کے برعکس، وحی، انسان کو پہلے ہی دن بتا دیتی ہے کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کونسا غلط۔ اس لئے وحی کی راہنمائی سے سفرِ زندگی کی طول طویل راہیں سمٹ کر بہت مختصر ہو جاتی ہیں۔ طویٰ کے یہی معنی ہیں، لپٹی ہوئی، سمٹائی ہوئی۔ کہا یہ گیا کہ تو اب عقل کے تجرباتی طریقوں سے نکل کر وحی کی سمٹی ہوئی مقدس وادی میں پہنچ گیا ہے اس لئے اب تو اس لمبے سفر کے ساز و سامان (نَعْلَیْكَ) کو الگ کر کے اطمینان سے بیٹھ جا۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰى ۝ (۲۰/۱۳)

اور دیکھ! میں نے تجھے (ایک عظیم مقصد کے لئے) چن لیا ہے۔ پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن۔

وہ اوّلین وحی کیا تھی؟

اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ۝ (۲۰/۱۴)

میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی حاکم اور معبود نہیں۔ پس میری ہی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو اور میرے قانون کو غالب کرنے کے لئے نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔

قیامِ حکومتِ خداوندی کی بنیاد

یعنی قیامِ حکومتِ خداوندی کی وہی بنیادی تعلیم جو اس سے پیشتر تمام حضرات انبیائے کرامؑ کی زبانی ہم سنتے چلے آرہے ہیں. ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا جائز نہیں. عبودیت اسی کی اختیار کی جائے گی اور اس عبودیت (یعنی اللہ کی محکومیت) کا نظام، الصَّلٰوۃ سے قائم ہوگا[1]۔ اس انقلابِ عظیم کی اوّلیں منزل، سرکش قوتوں کا استہلاک ہوگا کہ جب تک لَا اِلٰہ (ہر طاغوتی قوت سے انکار) کی تکمیل نہ ہوگی اِلَّا اللہ (اللہ کی محکومیت) کا ظہور نہیں ہوگا. اس لئے:۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ٥ (۲۰/۱۵)

یاد رکھو! کہ تمہارے ہاتھوں سے ایک انقلابِ عظیم رونما ہونے والا ہے. ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب (جو اس وقت تک غیر مرئی طور پر منازل طے کرتا چلا آرہا تھا) اب نکھر کر سامنے آجائے.

اس انقلاب سے مقصود یہ ہے کہ ہر فرد کو اس کی محنتوں کا پورا پورا بدلہ مل جائے.

وہ وقت اب قریب آنے والا ہے کہ سرکش قوتوں کے اعمال کے فطری نتائج ان کے سامنے نمودار ہو جائیں. مستبد قوتوں کے نظام میں ہوتا یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی لے جاتا ہے.

دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد

لیکن اس انقلاب کے بعد، جو قوانینِ خداوندی کے نفاذ کے لئے ظہور میں آئے گا، ایک ایسا معاشرہ قائم ہوگا جس میں سلب و نہب کا کوئی دخل نہ ہو. اس میں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا. کوئی مستبد قوت کسی سے کچھ چھین نہیں سکے گی. اس کے بعد ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا جو آنے والے راستہ میں بڑی خطرناک گھاٹی تھی. ایک طرف بنی اسرائیل کے متعلق علم تھا کہ ان کی خوئے غلامی نے ان کے ایمان و عمل کی قوتوں کو مفلوج کر رکھا ہے، اس لئے وہ اس جانگسل کشاکشِ حق و باطل میں قدم قدم پر ہمت ہار بیٹھیں گے. اس لئے یہ واضح کر دیا کہ ان کی بزدلی اور دُوں ہمتی، عدمِ استقلال و فقدانِ استقامت ضعفِ ایمان اور کمزوریٔ عمل. حضرت موسیٰؑ کے راستہ میں سنگِ گراں بن کر حائل نہ ہو جائیں. دوسری طرف، قومِ فرعون تھی جو اس انقلاب کی سب سے بڑی مزاحم بننے والی تھی. اس لئے کہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں

---

[1] یہ نظام صلوٰۃ کے ذریعے کس طرح قائم ہوگا اس کے لئے "نظامِ ربوبیت" دیکھئے۔

پر زد پڑتی تھی۔ ان کی طرف سے شدید ترین مخالفت کا یقین تھا۔ لہٰذا یہ بھی بتا دیا کہ ان کی اس مخالفت سے یہ خیال کبھی دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ چلئے ان سے مفاہمت کر کے بین بین کا راستہ اختیار کر لیا جائے۔ حق اور باطل میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں حقیقتیں ہیں جن کی طرف اس ایک آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں فرمایا۔

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ٥ (۲۰/۱۶)

پس دیکھ! ایسا نہ ہو کہ جو شخص ہمارے قوانین پر یقین نہیں رکھتا اور اپنے جذبات ہی کے پیچھے چلتا ہے وہ اس نظام کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ اس سے برملا کہہ دو کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

غور کیجئے۔ کتنی اہم حقیقت ہے جسے اشاروں ہی اشاروں میں یوں بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ حق و باطل کی معرکہ آرائی میں وہی قوم کامیاب و کامران ہوگی جو اپنی خواہشات و مقتضیاتِ نفس اور امیالِ عواطفِ قلب کو جذبۂ حصولِ مقصد کے تابع رکھے، خواہ اس میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ جو اس انقلاب کے راستہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوگا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

اس طرح حضرت موسیٰؑ کو اس آنے والے انقلاب کے متعلق ضروری احکام دیئے گئے۔ قرآنِ کریم نے اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ بڑا غور طلب ہے۔ ہم پہلے ان آیات کا وہ ترجمہ لکھتے ہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ اس واقعہ کے عمومی مفہوم کو سامنے لے آتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ اگر ان آیات کے الفاظ کو مجاز پر محمول کیا جائے تو ان سے کون سی حقیقت سامنے آتی ہے۔ پہلے عمومی مفہوم کو لیجئے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوْسٰى ٥ (۲۰/۱۷)

اور " اے موسیٰ! تیرے دہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

عرض کیا۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ٥ (۲۰/۱۸)

عرض کیا، میری لاٹھی ہے، چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں، اسی سے اپنی بکریوں کے لئے

پتے جھاڑ لیتا ہوں۔ میرے لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

آواز آئی۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ○ (۲۰/۱۹)

حکم ہوا "اے موسیٰ اسے ڈال دے۔"

انہوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔

فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ○ (۲۰/۲۰)

چنانچہ موسےٰ نے ڈال دیا۔ اور دیکھتا کیا ہے کہ وہ تو ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔

صدائے غیبی نے کہا۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ قف سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ○ (۲۰/۲۱)

حکم ہوا "اب اسے پکڑ لے اور مت ڈر۔ ہم اُسے پھر اس کی اصلی حالت پر کئے دیتے ہیں۔

پھر ارشاد ہوا۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى لا (۲۰/۲۲)

اور (نیز حکم ہوا) کہ اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ اور پھر نکال۔ بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو چمکتا ہوا نکلے گا۔ یہ (تیرے لئے) دوسری نشانی ہوئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ ہماری نشانیاں ہیں۔ انہیں محض بطور اعجوبہ کاری نہیں دکھایا گیا بلکہ یہ ہماری بہت بڑی نشانیوں کی تمہید ہیں۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ج (۲۰/۲۳)

"یہ نشانیاں اس لئے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔"

دوسرا مفہوم یہ تو ہے ان آیات کا عمومی مفہوم۔ لیکن اگر ہم ان الفاظ کے مجازی معانی لیں تو بات کچھ اور سامنے آتی ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کا یہ انداز ہے کہ وہ غیر محسوس

حقائق کو تشبیہات و استعارات کے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ ایسے مقامات میں، الفاظ کو ان کے ظاہری معنوں پر محمول نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ جس حقیقت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اسے سامنے رکھ کر مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس اعتبار سے ان آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت موسےٰؑ کو اس عظیم مہم سے متعلق احکام دے دیئے گئے تو ندائے غیب نے پوچھا کہ وَ مَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى (۲۰/۱۷) اے موسےٰ! تم ان احکام پر غور کرو اور قوت و برکت دونوں نقاطِ نگاہ سے بتاؤ کہ ان کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے۔ حضرت موسےٰؑ نے جواب میں کہا کہ بارِ الہٰا! یہ احکام کیا ہیں؟ هِيَ عَصَايَ (۲۰/۱۸) یہ تو میرے لئے سفرِ زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں۔ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا میں اب انہی کے آسرے سے چلوں گا۔ وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي انہی کے ذریعے اب میں اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل کو) جھنجوڑوں گا اور ان کے جمود و تعطل کو حرکت و حرارت میں بدل دوں گا۔ وَلِيَ فِيهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۲۰/۱۸)۔ ان کے علاوہ معاملاتِ زندگی بھی جو میرے سامنے آئیں، ان میں ان سے بصیرت و راہ نمائی حاصل کروں گا۔ حکم ہوا کہ جاؤ اور انہیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوسٰى (۲۰/۱۹)

اس وفورِ شوق کے بعد، جب اس نئی مہم اور ان انقلاب آور احکام و ضوابط کے نتیجہ میں جو کچھ ہونے والا تھا اس پر غور کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ احکام نہیں، ایک اژدھا ہے جو بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے (فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝ (۲۰/۲۰)۔ خدا نے کہا کہ موسےٰؑ اس خیال سے مت گھبراؤ، انہیں مضبوطی سے تھام لو (قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ) ان کے متعلق جو بات تم نے پہلے کہی تھی (کہ میں ان سے فلاں فلاں کام لوں گا)، ہم انہیں ایسا ہی بنا دیں گے۔ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْاُولٰى (۲۰/۲۱) اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو۔ تو نہایت سکون و سکوت اور دل جمعی سے اپنی دعوت کو نہایت روشن اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تو ان تمام مشکلات سے محفوظ و مصئون باہر نکل آئے گا۔ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ (۲۰/۲۲) تیری اس طرح کی کامیابی تیری دعوت کی صداقت کی نشانی ہے، یعنی دشمنوں کی ہلاکت منفیانہ حیثیت سے نشان اور تمہاری کامیابی مثبت حیثیت سے نشان۔ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۝ (۲۰/۲۳) یہ احکام ہم تجھے اس لئے دیتے ہیں کہ تجھے دکھا دیں کہ ان کے ذریعے کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

یہ ہوگا ان آیات کا مفہوم اگر ان کے الفاظ کے مجازی معانی لئے جائیں۔ ان احکام و ضوابط اور ان کی

اس طرح تبئین و تشریح کے بعد حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ○ (۲۰/۲۴)

اے موسیٰ! تو فرعون (یعنی پادشاہِ مصر) کی طرف جا۔ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔

طَغٰی کے لفظ پر غور فرمائیے اور قرآنی بلاغت کے اعجاز پر وجد کیجئے۔ سرکشی و معصیت کوشی کی تمام کف بردہاں طغیانیوں کو کس طرح ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔

جب حضرت موسیٰؑ نے سُنا کہ وہ مہم جس کے سر کرنے کے لئے انہیں مامور کیا جا رہا ہے کس قدر صبر آزما اور استقامت طلب ہے تو اس کی توفیق کے لئے بھی اسی بابِ عالی کے سامنے جھولی پھیلا دی۔ عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ لا ..... اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ○ (۲۵-۳۵/۲۰)

موسیٰؑ نے عرض کیا" اے پروردگار! میرے سینے میں ایسی وسعت اور کشاد عطا فرما دے کہ (بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے کے لئے مستعد ہو جاؤں) میرا کام میرے لئے آسان کر دے (کہ راہ کی کوئی دشواری بھی غالب نہ آسکے)۔ میری زبان کی گرہ بھی کھول دے کہ (خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جائے اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے۔ نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا بوجھ بٹانے والا بنا دے کہ اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے۔ وہ میرے کام میں میرا شریک ہو۔ ہم دونوں مل کر تیرے تفویض کردہ پروگرام کی تکمیل میں بہت زیادہ سرگرمِ عمل رہیں اور تیرے قانون کو غالب کرنے میں بیش از بیش قدم اُٹھا سکیں اور تُو ہم دونوں کی حالت سے اچھی طرح باخبر ہے۔

زبان کی گرہ کُشائی

سینہ کی فراخی (شرحِ صدر) وسعتِ ظرف اور دشواریٔ منزل کی آسانی کے ساتھ، زبان کی گرہ کشائی کی بھی دعا مانگی گئی۔ اس لئے کہ ایک مدت تک مدین کے بیابانوں میں بدویت کی زندگی بسر کرنے سے زبان میں وہ طاقت نہیں رہی ہوگی جو ایسے مواقع پر حُسنِ خطابت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کی تائید سورۂ قصص کی چونتیسویں (۳۴) آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا (۲۸/۳۴)

"میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ساتھ بھیجدے کیوں کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے۔"

پھر ان آیات میں نُسَبِّحَكَ (تاکہ ہم تیری تسبیح کریں) اور نَذْكُرَكَ (ہم تیرا ذکر کریں[1]) کے ٹکڑوں پر بھی غور کیجئے۔

تسبیح وذکر کا مفہوم

حضرت موسیٰ کے ذمہ فریضہ عائد کیا گیا تھا کہ وہ جائیں، فرعون اور اُس کے طاغوتی لشکر کو شکست دیں اور بنی اسرائیل کو غلامی ومحکومی کی پستیوں سے نکال کر، حکومت وسطوت کی بلندیوں پر لے جائیں اور ان کی حکومت کی بنیاد قوانینِ خداوندی پر رکھیں۔ اس عظیم الشان مہم کے لئے آپ نے اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت کی التجا کی اور اپنے قوتِ بازو یعنی حضرت ہارونؑ کو بھی ساتھ مانگا۔ اور یہ اس لئے تاکہ وہ عظیم الشان مہم سر ہوسکے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں کہ "تاکہ ہم تیری تسبیح بیان کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں"۔ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کی تسبیح اور ذکر سے صحیح مفہوم کیا ہے؟ دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ واستیلاء (یعنی فساد) کو مٹا کر اس کی جگہ حکومتِ خداوندی کا قیام وبقاء، یہ ہے تسبیح اور یہ ہے ذکر۔ نہ کہ زاویوں اور خانقاہوں کی تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں، سر بزانو، ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہراتے رہنا اور عملاً ہر طاغوتی قوت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا۔ وہ تسبیح وذکر تھا مردانِ خود آگاہ وخدامست کا اور یہ تسبیح وذکر ہے ان کا جو کشمکشِ زندگی سے مُنہ موڑنے کا نام "معرفت" و "حقیقت" رکھ لیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے　　شاید کہ تیرے دل میں اُتر جائے میری بات

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ وخدامست

یہ مذہبِ مُلا وجمادات ونباتات

حضرت موسیٰ کی درخواست کے جواب میں اس درگاہِ عاجز نواز سے ارشاد ہوا کہ

قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ ۝ (۲۰/۳۶)

ارشاد ہوا، اے موسیٰ! تیری درخواست منظور ہوئی۔

اس لئے کہ جو کچھ مانگا گیا ہے وہ تو اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہے جس کے لئے تدبیرِ الٰہی کی مختلف کڑیاں

---

[1] تسبیح وذکر کے معانی اور مفہوم کے لئے لغات القرآن دیکھئے۔

اس سے پیشتر سامنے آچکی ہیں۔

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰى ۙ...... ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ○ (۲۰/۴۰-۳۷)

اور (تجھے معلوم ہے) ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ کیسا احسان کر چکے ہیں؟ ہم تجھے بتاتے ہیں، اس وقت کیا ہوا تھا، جب ہم نے تیری ماں کی طرف یہ حکم بھیجا تھا کہ بچّے کو ایک صندوق میں ڈال دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے، دریا اسے کنارہ پر دھکیل دے گا۔ پھر اسے وہ اٹھالیگا جو میرا دشمن ہے۔ نیز اس بچّہ کا بھی دشمن۔ اور (اے موسٰے!) ہم نے اپنے فضلِ خاص سے تجھ پر محبّت کا سایہ ڈال دیا تھا (کہ اجنبی بھی تجھ سے محبّت کرنے لگے) اور یہ اس لئے تھا کہ ہم چاہتے تھے کہ تو ہماری نگرانی میں پرورش پائے۔ تیری بہن جب وہاں سے گزری تو (یہ ہماری ہی کارفرمائی تھی کہ) اس نے (فرعون کی بیوی سے) کہا، میں تمہیں ایسی عورت بتادوں جو اسے پالے پوسے؟ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور (بچّے کی جدائی سے) غمگین نہ ہو۔ پھر دیکھ ایسا ہوا کہ تُو نے (مصر میں) ایک آدمی مار ڈالا۔ ہم نے تجھے اس معاملہ کے غم سے نجات دی اور تجھے مختلف کٹھالیوں میں تپایا (تاکہ تو کندن بن جائے) پھر تو کئی برس تک مدین کے لوگوں میں رہا۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد، موسٰے! ایسا ہوا کہ تو ہمارے پیمانے پر پورا اُترا (اور ہم نے تجھے نبوّت سے سرفراز کیا)۔

سب کچھ اندازے کے مطابق

"اتنی مختلف منازل سے گزر کر اے موسیٰؑ! اب تو ہمارے متعین کردہ اندازے کے مطابق اس مقام پر آپہنچا ہے۔" "علیٰ قدر" کے الفاظ پر غور فرمایئے، یعنی جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ محض اتفاقیہ امور نہیں، بلکہ اللہ کے متعین فرمودہ پیمانوں اور اندازوں کے بالکل مطابق ہو رہا ہے۔ اب اتنی آزمائشوں کے بعد

وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ○ ج (۲۰/۴۱)

اور (دیکھ اس طرح) میں نے تجھے اپنے لئے (یعنی اپنے خاص کام کے لئے) بنایا اور تیار کیا ہے۔

یعنی "تجھے اپنے لئے تیار کیا ہے۔" دیکھئے! کتنے واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ نبی کو مقامِ نبوّت کے لئے وہبی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ جوہرِ عظمیٰ کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ بھی کہ نبوّت ہر کس و ناکس کو یونہی

نہیں مل جاتی، بلکہ اس کے لئے پیکرِ نبوّت کو مختلف منازل سے گذار کر اس کی خودی کی تکمیل کی جاتی ہے اور اس کے بعد اسے منصبِ جلیلہ پر سرفراز کیا جاتا ہے۔ یہ قول بے خبراں ہے ___ کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے۔ پیغمبری ہر ایک کو یونہی نہیں مل جایا کرتی۔ قدرت اسے پہلے دن سے پیغمبری کے لئے تیار کر رہی ہوتی ہے اور جب وہ اس کے مقرر کردہ اندازے کے مطابق، اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اسے اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ (ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى)۔

عبادت کا مفہوم

پھر لِنَفْسِیْ پر بھی غور کیجئے (یعنی تمہیں اپنے لئے تیار کیا ہے)۔ حضرت موسےٰؑ جس مقصدِ جلیلہ کے لئے تیار کئے گئے تھے وہ سرکش قوّتوں کا استہلاک اور کمزور قوم کو ابھار کر قوانینِ خداوندی کی تنفیذ و ترویج کے لئے مقامِ حکومت و سطوت تک پہنچانا تھا۔ بالفاظِ دیگر، یہ مقصد، قیامِ حکومتِ الٰہیہ تھا۔ اس مقصد کو اللہ تعالیٰ نے "اپنا مقصد" قرار دیا ہے۔ اب اسے اس ٹکڑے سے ملایئے جس میں کہا گیا ہے کہ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ٥ (۵۱/۵۶) یعنی جنّ وانس کی پیدائش کی غرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبودیت (محکومیت) اختیار کریں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "عبادت" سے مفہوم کیا ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ کے لئے وقف ہو جائے اور اللہ کے لئے وقف ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اس کی زندگی کا ہر سانس قیام و بقائے حکومتِ خداوندی میں صرف ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسےٰؑ سے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اپنے لئے وقف کر لیا ہے، یعنی قیامِ حکومتِ خداوندی کے لئے جس کا تفصیلی پروگرام یہ ہے کہ

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۚ (۲۰/۴۲)

اب تُو اور تیرا بھائی دونوں میرے احکام کو لے کر جاؤ اور دیکھنا! ان کی تعمیل میں ذرا سستی نہ کرنا۔

یعنی اس مقصد کی تکمیل یوں ہوگی۔ یہاں پھر ذکر کا لفظ قابلِ غور ہے اور اس تشریح کی تائید کر رہا ہے جو اوپر گذر چکی ہے۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ٥ جصلے فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ٥ (۴۳-۲۰/۴۴)

ہاں، تم دونوں (یعنی موسےٰ اور ہارون) فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ سرکشی میں بہت بڑھ چلا ہے۔

پھر جب اس کے پاس پہنچو تو (سختی سے پیش نہ آنا) نرمی سے بات کرنا۔ (تمہیں کیا معلوم؟) ہوسکتا ہے وہ اس طرح بات کو سمجھ لے یا اپنی غلط روش کے عواقب سے ڈر جائے۔

دعوتِ انقلاب کے دو مقام

دعوتِ حق و صداقت کے سلسلہ کی پہلی کڑی پر غور فرمائیے۔ یعنی فرعون کے پاس پہنچو تو پہلے نرمی سے سمجھانا۔ شاید اس کے دل پر اثر ہو جائے اور وہ صحیح بات کو سمجھ لے اور اپنے انجام و عواقب سے ڈر جائے۔ ایک داعیٔ حق و صداقت کی پہلی آواز، نرمی اور نصیحت کی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس سے سرکش قوتوں پر کچھ اثر نہیں ہوا، بلکہ وہ اپنی معصیت کوشی میں اور زیادہ دلیر ہو گئی ہیں تو پھر ضربِ کلیمی کی باری آتی ہے جس کے لئے عصا کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

جو زخم مرہم سے مندمل نہ ہو اس کا علاج، نوکِ نشتر کے سوا اور کچھ نہیں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے لئے، شکنجوں میں کسنا ہی پڑتا ہے۔

مزید ہدایات

ادھر حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم ملا اور حضرت ہارونؑ کو مصر میں اشارہ مل گیا کہ وہ جاکر اپنے بھائی سے ملیں۔ چنانچہ وہ ان سے راہ میں آکر مل گئے۔ اب واقعہ کی مزید کڑیاں اس زمانہ سے متعلق ہیں جب دونوں بھائی اکٹھے ہو گئے تھے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ○ (۲۰/۴۵)

دونوں نے عرض کیا" پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے فرعون ہماری مخالفت میں عجلت نہ کرے۔

یہ خوف کچھ بیجا نہ تھا۔ ادھر قہرمانی قوتوں کا ایک بپھرتا ہوا سیلاب، جیوش و عساکر، تلوار و سنان، تمرد و فرعونیت کے ساز و سامان کی شکل میں موجزن اور ادھر (یوں سمجھئے کہ) دو گدڑیئے! لیکن جو قوت ان کے ساتھ تھی وہ فرعون اور اس کے جنود و عساکر کو کہاں میسر تھی۔ فرمایا۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ○ (۲۰/۴۶)

ارشاد ہوا، کچھ اندیشہ نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں سب کچھ سُنتا ہوں، سب کچھ دیکھتا ہوں۔

فرعون کے پاس بے دھڑک جاؤ.

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ○ (۲۰/۴۷)

تم اس کے پاس (بے دھڑک) جاؤ اور کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں. پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کردے اور ان پر سختی نہ کر. ہم تیرے پروردگار کے احکام لے کر تیرے پاس آگئے ہیں. اس پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے.

جو سیدھی راہ اختیار کرے اس پر امن و سلامتی کی بشارت ہے لیکن جو اپنی ضد پر اڑ جائے تو

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ○ (۲۰/۴۸)

جو کوئی جھٹلائے اور سرتابی کرے، تو ہم پر وحی اُتر چکی ہے کہ اس کے لئے تباہی کا پیام ہے.

ان دونوں ٹکڑوں میں اسلام کی پوری خصوصیات سمٹ کر آگئی ہیں. جو سیدھی راہ اختیار کرے، وہ امن و سلامتی میں ہے اور یہی وہ جنتِ ارضی ہے جس کے لئے ابنِ آدم مارا مارا پھر رہا ہے اور اپنی ہر ناکام جستجو کے بعد تھک کر پکار اُٹھتا ہے کہ

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

اسلام قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والوں کو امن و سلامتی کی جنت عطا کرتا ہے جو سرکشی اختیار کرے اور دوسرے انسانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنا چاہے، تو اس کے لئے ہلاکت و بربادی کا رسوا کُن عذاب ہے.

مزید بکھرے ہوئے موتی

اس کے بعد اس داستانِ انقلاب کی اگلی کڑی آتی ہے. لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کے جن دیگر مقامات میں اتنا حصہ بیان ہوا ہے انہیں بھی سامنے رکھ لیا جائے تاکہ مفہوم بالکل واضح ہوجائے اور تمام جزئیات سامنے آجائیں. سورۂ قصص کی آیت (۲۹) پہلے لکھی جاچکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کس طرح آگ لینے کے لئے پہاڑ کی طرف بڑھے. اس سے آگے ہے.

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲۸/۳۰)

سو جب (موسیٰ اس آگ کے شعلہ کے) قریب آیا' تو وادی کے دائیں جانب سے' درخت کے بابرکت مقام سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں' رب العٰلمین۔

سورۂ طٰہٰ میں اسے "وَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۲۰/۱۲)" کہا گیا تھا۔ یہاں مزید وضاحت فرما دی کہ ندائے جمال وادی کے دائیں جانب' جھاڑی کے پاس سے آئی تھی۔ اس کے بعد ہے۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰٓي اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝ (۲۸/۳۱)

(آواز نے کہا کہ اے موسیٰ!) اپنا عصا پھینک دے (موسیٰ نے عصا پھینک دیا اور) جب اسے ہلتا ہوا دیکھا' گویا کہ وہ سانپ ہے تو پیٹھ موڑ کر اس طرح لوٹا کہ پھر پیچھے مڑ کر (نہ دیکھا)۔ (آواز آئی) اے موسیٰ! آگے بڑھو' مت ڈرو۔ تم امن پانے والوں میں سے ہو۔

سورہ طٰہٰ میں اسے حَيَّةٌ (سانپ) کہا گیا ہے۔ یہاں كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ کہہ کر وضاحت فرما دی کہ وہ "گویا سانپ" تھا۔ مندرجہ بالا ترجمہ' آیت کے الفاظ کے ظاہراً مفہوم کی رُو سے ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اگر ان الفاظ کو بطور استعارات لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ کو مختلف احکام دے کر کہا کہ ان احکام کو جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا ہیں جا کر فرعون کے سامنے پیش کرو۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اس مہم اور اس سے متعلقہ احکام پر غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ مہم نہیں' ایک اژدہا ہے جسے زندہ پکڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس خیال سے' حضرت موسیٰؑ نے اس مہم سے ہٹنا چاہا اور فرعون کی طرف جانے سے خائف ہوئے' یعنی اس خوف کی بنا پر اپنے دل میں اس مہم کے لئے آمادگی نہ پائی۔ اس پر آواز آئی کہ اے موسیٰ! ڈرو نہیں' تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ تم ہماری حفاظت میں رہو گے۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (۲۸/۳۲)

اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال' وہ بغیر کسی عیب کے سفید ہو کر نکلے گا اور خوف میں اپنا بازو اپنے

(پہلو) سے چمٹالو۔ یہ دو روشن دلیلیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے ارکینِ سلطنت
کی طرف ہیں۔ وہ نافرمان لوگ ہیں۔

سورۂ طٰہٰ میں آیات کہا گیا تھا، یہاں برہان فرمایا۔ سابقہ انداز کے مطابق، اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ کو مبشرات کے احکام دے کر کہا گیا کہ انہیں لوگوں کے سامنے نہایت دل جمعی سے پیش کرنا۔ انہیں یہ احکام بڑے خوش آئند دکھائی دیں گے اور اگر کہیں خوف کا مقام آئے تو پھڑپھڑانا نہیں بلکہ اپنے بال و پر سمیٹ کر مقابلہ کے لئے تیار ہو جانا اور اپنی جماعت کی تنظیم اچھی طرح سے کرنا (۲۸/۳۲)۔ یہ دونوں قسم کے احکام (تنذیرات و تبشیرات) تیرے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے اہلِ دربار کے لئے دلائل ہیں۔ وہ لوگ سخت غلط راستے پر چل رہے ہیں۔

اس پر حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ۝ وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ۝ (۲۸/۳۳-۳۴)

عرض کیا اے میرے ربّ! میں نے ان میں سے ایک شخص کو مار دیا تھا۔ سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے اور میرا بھائی ہارون، جو مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج دے تاکہ وہ میری تصدیق کرے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کریں گے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا ۚ بِآيَاتِنَا ۚ أَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ ۝ (۲۸/۳۵)

(اللہ نے کہا) ہم تیری قوتِ بازو تیرے بھائی کے ساتھ مضبوط کر دیں گے اور تم دونوں کے لئے ایسی قوت فراہم کر دیں گے کہ وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ سو تم ان احکامات کو لے کر جاؤ۔ تم اور جو تمہاری پیروی کریں گے غالب آئیں گے۔

دیکھئے! کس وضاحت اور یقین سے کہا گیا کہ جاؤ! ہماری طرف سے قوت و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی اور تم

اور تمہارے متبعین، اس سرکش و جابر قوم پر غالب آجاؤ گے۔

سورۂ نمل میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۝ (۲۷/۷)

جب موسیٰ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ میں وہاں سے تمہارے لئے کوئی خبر لاؤں گا یا کوئی جلتا ہوا شعلہ تاکہ تم تاپ سکو۔

جب حضرت موسیٰؑ آگ کے نشان کی طرف بڑھے تو آواز آئی۔

فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۷/۸)

سو جب (موسیٰ) آگ کے قریب آیا تو آواز آئی کہ بابرکت ہے وہ (مقام) جس میں آگ ہے اور اس کا اردگرد بھی اور اللہ رب العالمین اس تصور سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی خاص مقام میں گھرا ہوا ہے۔

مقصود یہ بتانا تھا کہ یہ مقام (طور) اور اس کے اردگرد کا علاقہ (ارضِ فلسطین) بڑی بابرکت زمین ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی یہاں مختلف انبیاء کرامؑ کی وساطت سے پیغاماتِ خداوندی کا عام چرچا ہوا تھا اور اب بھی یہ علاقہ (کچھ عرصہ بعد) نظامِ خداوندی کی آماجگاہ بننے والا ہے۔ جب بنی اسرائیل، فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کر کے یہاں آباد ہوں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ برکات و سعادت اسی خطہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ خدا تو رب العالمین ہے۔ اس لئے اس کی رحمتیں تمام خطۂ ارض پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ اس تصور سے بہت بلند ہے کہ اس کی ربوبیت کو کسی خاص علاقہ یا خاص نسل میں محدود کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا:-

يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (۲۷/۹)

اے موسیٰ! میں اللہ غالب، حکمت والا ہوں!

"عَزِيزُ الْحَكِيمُ" کی صفتِ خداوندی پر غور فرمائیے۔ غالب اور حکمت والا۔ جس عظیم الشان مہم کو سر کرنے کے

لے حضرت موسیٰؑ کو مامور کیا جارہا تھا اس کے لئے ایسے غالب و حکیم خدا کی تائید و نصرت کی ضرورت تھی. اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ٥ (۲۷/۱۰)

اور (اے موسیٰ!) اپنا عصا ڈال دے (اس نے ایسا ہی کیا). سو جب اسے ہلتا ہوا دیکھا گویا وہ سانپ ہے، تو (موسیٰ) پیٹھ موڑ کر الٹا پھر گیا (اس طرح) کہ پیچھے (مڑ کر بھی نہ دیکھا). (اللہ نے کہا) اے موسیٰ! ڈرو نہیں. ہمارے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے.

یہاں بھی كَاَنَّهَا جَآنٌّ (گویا کہ وہ سانپ تھا) فرمایا. اس کے ساتھ یہ بھی کہ "ہمارے حضور ہمارے رسول ڈرا نہیں کرتے": رسول تو ایک طرف، عام لوگوں سے بھی اگر کوئی لغزش ہو جائے اور اس کے بعد وہ ندامت سے جھک جائیں اور اپنی برائی کو بھلائی سے بدل دیں تو ہم ان کے لئے سامانِ حفاظت مہیا کر دیا کرتے ہیں.

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (۲۷/۱۱)

لیکن جو زیادتی کرتا ہے، پھر برائی کے بعد (اسے) نیکی سے بدل دیتا ہے، تو میں بخشنے والا، رحمت کرنے والا ہوں.

پھر فرمایا.

وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِىْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ٥ (۲۷/۱۲)

اور (اے موسیٰؑ) اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال (دیکھو گے کہ وہ) بغیر کسی نقص کے سفید ہو کر نکلے گا. یہ فرعون اور اس کی قوم کی طرف (ہماری) نو نشانیوں میں سے ہے (اس لئے کہ وہ نافرمان لوگ ہیں.

ان تسع اٰیات (نو نشانیوں یا احکام) کی تفصیل بعد میں آئے گی. (آیات ۱۰ و ۱۲ کو اگر استعارہ کے انداز میں لیا جائے تو ان کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے) .

لے ہو سکتا ہے کہ یہاں قبطی کے قتل کے واقعہ کی طرف اشارہ ہو. کیونکہ اگرچہ حضرت موسیٰؑ نے اسے عمداً قتل نہیں کیا تھا لیکن نادانستہ ایک مجرم کی حمایت ہو گئی تھی. اس "زیادتی" کو بعد میں حضرت موسیٰؑ کی پیشانی کے عرقِ انفعال نے مبدل بہ حسنات کر دیا تھا.

متذکرہ صدر مقامات میں تفصیل سے ذکر ہے۔ لیکن سورۂ نازعات میں ان تفاصیل کو اجمال میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ فرمایا۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ (۱۵-۱۷/۷۹)

(اے مخاطب!) کیا تجھے موسیٰ (کے واقعہ) کی خبر پہنچ چکی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے وادیٔ مقدس طویٰ میں پکارا (اور کہا کہ) فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ حد سے نکل گیا ہے۔

سورۂ شعراء میں ہے۔

وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۝ (۱۰-۱۱/۲۶)

اور جب تیرے رب نے موسےٰ کو پکارا کہ ظالم قوم کی طرف جاؤ یعنی قوم فرعون کی طرف (اور ان سے پوچھو کہ) کیا وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت نہیں کریں گے؟

حضرت موسےٰؑ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝ وَ يَضِيْقُ صَدْرِيْ وَ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝ (۱۲-۱۳/۲۶)

عرض کیا، اے میرے ربّ! میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کریں (اور اس سے) میرا سینہ تنگ ہو جائے اور میری زبان نہ چلے (تو اس کے لئے) تو ہارون کی طرف (میری مدد کے لئے) پیغام (وحی) بھیج۔

سورۂ طٰہٰ کے الفاظ میں، حضرت موسےٰؑ نے دُعا مانگی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ (۲۰/۲۵) "اے اللہ! میرا سینہ کھول دے"۔ یہاں اس اہم ذمہ داری کے بوجھ کی طرف اشارہ ہے جس کے لئے شرح صدر کی آرزو، دعا بن کر لب پر آگئی۔ پھر حضرت موسےٰؑ نے سورۂ طٰہٰ میں عرض کیا تھا کہ "میری زبان کی گرہ کشائی فرما دیجئے تاکہ وہ میری بات سمجھ لیں" (۲۷-۲۸/۲۰)۔ یہاں اپنے عجزِ بیان کے متعلق کہا کہ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ اس لئے حضرت ہارونؑ کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا (۲۸/۳۴)۔ (وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے)۔

اس کے بعد عرض کیا کہ ایک بات اور بھی ہے۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ۝ (۲۶/۱۵)

وہ میرے ذمہ ایک قصور دھرتے ہیں۔ سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

دیکھئے! حضرت موسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ وہ فی الواقعہ مجرم ہیں۔ اس لئے کہ آپ قتل عمد کے مرتکب نہیں تھے بلکہ وہ حادثہ محض اتفاقی تھا۔ لیکن (جیسا کہ پہلے آ چکا ہے) حکومتِ فرعونی کے اربابِ بست و کشاد آپ پر قتل عمد کا الزام دھر کر آپ کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ (ملاحظہ ہوں آیات (۱۵-۲۱/۲۸) جو پہلے درج کی جا چکی ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دونوں بھائی جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا ۖ إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَمِعُونَ ۝ (۲۶/۱۵)

(ارشاد ہوا کہ) ہرگز (خطرہ کی کوئی بات) نہیں۔ تم دونوں ہمارے احکام کے ساتھ جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ (سب کچھ) سننے (دیکھنے) والے ہیں۔

یہ تھے وہ واقعات جو سرِ طور لہرانے والی برقِ تجلی کے دامن میں آگ کی تلاش میں نکلے ہوئے (حضرت) موسیٰؑ کو پیش آئے۔

طور سے واپسی

اہلِ خانہ انتظار میں ہوں گے کہ آپ آگ لے کر آئیں! انہیں کیا معلوم کہ وہاں سے کونسی زندہ حرارت مل گئی ہے جو افراد کے خون میں ہی نہیں بلکہ پوری قوم کی رگِ جاں میں برقِ تپاں بن کر دوڑ جائے گی۔ حضرت موسیٰؑ اس مقصدِ عظیم کو دل میں لئے، جس کے لئے آپ کو مامور کیا گیا تھا، مصر کی جانب تشریف لے چلے۔ غور کیجئے! یہاں سے بھاگے تھے تو کس حالت میں اور اب لوٹے ہیں تو کس انداز سے! اس وقت فرعون اور اس کے اربابِ حکومت کی سازش سے بچ کر نکلے تھے اور اب مراجعت ہوئی ہے تو بایں نمط کہ انقلابات کی ایک دنیا جلو میں ہے اور سینے میں سوائے ایک اللہ کے کسی

دربارِ فرعون میں

کا خوف مضمر نہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی آمد اور ان کے ارادوں کی اطلاع بنی اسرائیل اور فرعونی حکومت کو مل چکی ہوگی۔ بہرحال آپ فرعون کے پاس پہنچے اور اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۷/۱۰۴)

موسیٰ نے کہا، اے فرعون! میں اس کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں

جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

"میں خدا کا فرستادہ ہوں اس لئے حق کے سوا کچھ اور نہ کہوں گا۔ مطالبہ میرا فقط ایک ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو غلامی پر مجبور نہ کر، خدا کے فرستادہ کے حوالہ کر دے تاکہ وہ انہیں انسانوں کی انسانیت سوز محکومی سے چھڑا کر خدا کی محکومیت میں لائے اور اس طرح انہیں انسانیت کی زندگی سے روشناس کرائے"۔

حَقِيقٌ عَلَىٰٓ أَن لَّآ أَقُولَ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْحَقَّ ۚ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ۝ (۷/۱۰۵)

مجھ پر لازم ہے کہ خدا کے نام سے کوئی بات نہ کہوں، مگر یہ کہ سچ ہو۔ میں تیرے پروردگار کی طرف سے (سچائی کی) روشن دلیلیں لایا ہوں۔ سو بنی اسرائیل کو (آئندہ اپنی غلامی پر مجبور نہ کر، اور) میرے ساتھ رخصت کر دے۔

اس مقام کے علاوہ حسبِ ذیل آیات میں اس بات کو دہرایا گیا ہے۔

(۱۰/۷۵ ؛ ۹۶ ـ ۱۱/۹۷ ؛ ۴۵ ـ ۲۳/۴۶ ؛ ۳۵ ـ ۲۵/۳۶ ؛ ۱۶ ـ ۲۶/۱۷

۲۳ ـ ۴۰/۲۴ ؛ ۱۷ ـ ۴۴/۲۲ ؛ ۵۱/۳۸)

حضرت موسیٰؑ نے سب سے پہلے ہی کہا کہ میں اپنے ربّ کی طرف سے رسول ہوں۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مصری بُت پرست تھے اور ان کے بادشاہ شانِ الوہیت کے مظہر سمجھے جاتے تھے۔ بُت پرستی کا مسلک یہ ہے کہ مختلف صفاتِ باری تعالیٰ کے لئے مختلف دیوتا تصوّر کر لئے جاتے ہیں اور پھر ہر دیوتا کا مجسمہ تراش کر ان سے وہی کچھ مانگا جاتا ہے جس کا اسے دیوتا قرار دیا جاتا ہے۔ بارش برسانے والا دیوتا، ہوائیں چلانے والا دیوتا،

فرعون کا استفسار

اولاد دینے والا دیوتا، وقس علیٰ ہٰذا۔ پھر، ہر قبیلہ اور ہر قریہ کا جدا جدا دیوتا اور الگ الگ "خدا" ہوتا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میں اپنے (یا تمہارے) ربّ کی طرف سے پیغامبر ہوں تو فرعون نے سب سے پہلے یہی سوال کیا کہ

قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَٰمُوسَىٰ ۝ (۲۰/۴۹)

"اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ؟"

کون سے ربّ کی طرف سے؟ کون سے خدا کی جانب سے؟ اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے چار لفظ کہے ہیں۔

اور غور کیجئے تو کس طرح بساطِ کائنات کے چاروں گوشے ان کے اندر سمٹ کر آگئے ہیں۔ فرمایا:۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۲۰/۵۰﴾

موسیٰ نے کہا، ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر اس کی راہ نمائی کی۔

حضرت موسیٰؑ کا جواب

وہ ربّ جس نے ہر شے کو خلقت عطا فرمائی۔ غور کیجئے، ہر شے کا پیدا کرنے والا۔ یہ نہیں کہ صرف بارش برسانے والا' اولاد عطا فرمانے والا، بلکہ اس وسیع وعریض کائنات میں جس شے کا بھی تصور کر سکو اس کا خالق اور صرف خالق ہی نہیں بلکہ پیدا کرنے کے بعد ہر ایک شے کو جس منتہا تک پہنچنا ہے وہاں تک کی راہ نمائی کرنے والا۔ سلسلۂ ارتقاء کی اوّلین اور آخری کڑیوں کا مالک ہے کیجئے! ایسے خدا کی موجودگی میں کسی شے کو اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں کسی اور " خدا " کی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے؟

حضرت موسیٰؑ نے جو کہا تھا کہ اِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷/۱۰۴﴾ اور اس کے جواب میں فرعون نے پوچھا تھا کہ وہ " ربّ " کونسا ہے تو اس میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ فرعون کا دعویٰ تھا (اور دنیا کے ہر " فرعون " کا یہی دعویٰ ہوتا ہے) کہ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی ﴿۷۹/۲۴﴾ لوگوں کو میں سامانِ زندگی عطا کرتا ہوں اس لئے میں ہی ان کا ربّ ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے جو کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں تو اس سے فرعون کے اس دعوائے ربوبیت کی بھی تردید کر دی۔ اس لئے فرعون نے دُہرا کر پوچھا کہ وہ کونسا ربّ ہے جس کی طرف سے تم آئے ہو۔ اس سرزمین میں " ربّ " تو میں ہی ہوں۔

بہر حال فرعون نے سوچا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو اس اُلجھاؤ میں اُلجھا لے گا۔ لیکن جواب ایسا مسکت اور جامع ملا کہ سٹی بھول گیا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس راہ سے کترا کر دوسری طرف نکل جائے۔ کہنے لگا اچھا! یہ بتاؤ کہ جو لوگ پہلے ہو گزرے ہیں ان کا کیا حال ہے؟ ان میں سے کون راہِ راست پر تھا اور کون گمراہ۔ خدا کے ہاں اس وقت ان کی کیا حالت ہے؟ کس کی نجات ہوئی اور کون عذاب میں مبتلا ہے۔ فلاں فلاں بزرگوں میں سے کون چھوٹا ہے اور کون بڑا؟

---

[1] تخلیق و ہدایت کے متعلق (ابلیس و آدم میں) وحی کے تابع بھی لکھا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ (۲۰/۵۱)

فرعون نے کہا، "پھر ان کا کیا حال ہے جو پچھلے زمانوں میں گذر چکے ہیں؟

یہ سوال ایسا تھا کہ اس کے جواب سے فرقہ واری اور گروہ سازی کی ہزار افتراق انگیز راہیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے فرعونی سیاست کی دسیسہ کاری کا مقصد یہ بھی تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ اس قوم کے اسلاف میں سے کسی کے متعلق بھی یہ کہیں گے کہ وہ گمراہ تھے تو فرعون اپنے اہلِ دربار اور عوام سے کہے گا کہ دیکھو! یہ شخص تمہارے واجب الاحترام بزرگوں کی توہین کرتا ہے۔ اس طرح ان کے جذبات کو بھڑکا کر، انہیں حضرت موسیٰؑ کا مخالف بنا دیا جائے گا اور یوں وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے وہ آئے ہیں، نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے گا۔

ایک اور بصیرت افروز جواب

لیکن جیسا کہ ہم حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے مخالف بادشاہ کے مکالمہ میں (جوئے نور" میں دیکھ چکے ہیں) حضرات انبیائے کرامؑ کا مسلک، مجادلانہ نہیں ہوتا داعیانہ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ بحث و مناظرہ کے لفظی گورکھ دھندے سے بچ کر اس انداز سے حقیقت کشائی کر دیتے ہیں جس سے پوچھنے والا ساکت بھی ہو جائے اور مطمئن بھی۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں فرمایا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ فِىْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسَى ۝ (۲۰/۵۲)

موسیٰ نے کہا، اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے۔

جواب کے ایک ایک لفظ پر غور فرمایئے اور حقائق و معارف کی اس بصیرت افروز دنیا میں جذب ہو جایئے فرمایا کہ اسلاف کا علم، نوشتہ الٰہی میں ہے اور وہ نوشتہ ایسا ہے جس میں کسی قسم کی غلطی اور سہو کا امکان نہیں[1]۔ اس لئے مجھے (یا تمہیں) اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کا حال (ان کے ساتھ) ان کے رب کے علم میں ہے۔ لیکن تمہارے لئے فقط اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل ایسا محکم گیر اور محیطِ کُل ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوتاہی اور غلطی کا امکان نہیں۔ اس لئے فکر اپنی اپنی کرنی چاہیئے۔ ہماری

---

[1] یہ آیہ جلیلہ حیات بعد الممات کے اہم مباحث سے متعلق ایک بنیادی اصول بھی بیان کر رہی ہے۔ لیکن چونکہ وہ نکتہ ایک مبسوط تشریح کا محتاج ہے اس لئے اس کا بیان "کتابِ آخرت" میں آئے گا۔

نجات کے لئے ہم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں بزرگ بڑا ہے یا فلاں اور فلاں کی نجات ہو گی یا نہیں۔
ان کے متعلق ہمارے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ ہم دُعا کریں کہ

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ (۵۹/۱۰)

اے ہمارے ربّ! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ رخصت ہو گئے۔

ان کے اعمال کے متعلق ہم سے باز پُرس نہ ہو گی۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲/۱۴۱)

یہ اُمّت تھی جو گذر چکی۔ اس کے لئے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لئے وہ ہو گا جو تم اپنے عمل سے کماؤ گے۔ تم سے اسکی کچھ پوچھ گچھ نہیں ہو گی کہ ان کے اعمال کیسے تھے؟

اُن کے اعمال اُن کے ساتھ، ہمارے اعمال، ہمارے ساتھ۔ اس لئے اس فکر کی کیا ضرورت ہے کہ ان کا کیا حال ہے؟ فکر یہ کرو کہ ہمارا کیا حال ہو گا؟

آیۂ عبرت! حضرت موسیٰؑ کے اس جواب پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس سے فرعون کی چال کس طرح ناکام بنا کر رکھ دی گئی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ آج مسلمان تشتّت و افتراق کے جس جہنّم میں مبتلا ہیں کیا اس کی سب سے بڑی وجہ یہی نہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اسلاف پرستی کے اس سوال کے جواب میں (جو فرعون نے کیا تھا) وہی طریق اختیار کریں جو زبانِ وحی سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ (۲۰/۵۲) ایک ایک کے متعلق عدالت کی کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور (معاذ اللہ) خدائے احکم الحاکمین کا منصب بھی خود ہی اختیار کر لیتے ہیں؟ اس پر باہمی تکفیر و تفسیق کے دروازے کھل جاتے ہیں اور یوں، ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب کی ماننے والی اُمّتِ واحدہ، سینکڑوں فرقوں میں بٹ کر عملی شرکت کا ثبوت دیتی ہے اور قیامت بالائے قیامت، کہ تحزّب و تشیّع اور فرقہ سازی اور گروہ بندی کی ان تمام مذموم کوششوں کا نام "خدمتِ اسلام" رکھا جاتا ہے! یا للعجب!!

بہر حال، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے اس سوال کا بھی ایسا مسکت جواب دیا کہ اس کے بعد کوئی بات

بن نہ پڑی۔ چونکہ اس جواب میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف اشارہ کیا تھا اس لئے اس کی مزید تفصیل میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا بھی اجمالی تذکرہ کر دیا جس سے قانونِ کائنات کی ہمہ گیری سے قانونِ مجازات پر استدلال کیا جاتا ہے، یعنی مبداء سے معاد کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر آئے گی) آپ نے فرمایا:۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَکَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا ....
وَ مِنْهَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی ○ (۵۳ ـ ۲۰/۵۵)

وہ پروردگار جس نے تمہارے لئے زمین بچھونے کی طرح بچھا دی، نقل و حرکت کے لئے اس میں راہیں نکال دیں، بادلوں سے پانی برسایا، اس کی آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیئے، خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی بھی چراؤ۔ اس بات میں عقل والوں کے لئے کیسی کھلی نشانیاں ہیں؟ اس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں لوٹاتا ہے اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے۔

سورۃ شعراء میں بھی اس مکالمہ کا ذکر ہے۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (۲۶/۲۳) فرعون نے پوچھا کہ رب العٰلمین کون ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ○ (۲۶/۲۴) موسیٰؑ نے کہا کہ وہ پستیوں اور بلندیوں کا اور ان سب کا جو ان کے درمیان ہیں، رب ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو تو۔ ظاہر ہے کہ اس الٰہ حقیقی کا عقیدہ، نہ صرف قوم فرعون کی اصنام پرستی ہی کو جڑ سے اکھیڑ دیتا تھا بلکہ خود فرعون کے مزعومہ دعویٰ ربوبیت کو بھی خاک میں

فرعون کا دعویٰ ربوبیّت

ملا دیتا تھا۔ اس لئے کہ فرعون کا دعویٰ یہ تھا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (۷۹/۲۴) (میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں)! اور حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ایک فرعونِ موسیٰؑ ہی پر کیا موقوف ہے، دنیا میں ہر مستبد قوت، اپنے دبدبہ و اقتدار کو انہی راہوں سے قائم کرتی ہے۔ وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے اور پھر بھوکے انسانوں سے جو جی میں آئے منوا اور کرا لیتی ہے؛ ورنہ انسان اگر اپنی روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو تو کسی کے سامنے جھکے کیوں؟ فرعون کے دعویٰ ربوبیت کی بھی یہی بنیاد تھی۔ اس لئے جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میرا خدا رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہے یعنی

کائنات کی ہر شے کا پروردگا (اور پھر اس دعویٰ کی دلیل میں تفصیل سے بتادیا کہ خدا کس طرح مخلوق کے لئے سامانِ رزق مہیا کرتا ہے (۲۰/۵۵ - ۵۳)۔ تو فرعون نے اپنے حواریوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ "سنتے ہو، یہ کیا کہہ رہا ہے؟" (۲۶/۲۵)۔ فرعون کے اس استفسار میں ایک طرف تضحیک کا پہلو بھی ہے، لیکن دوسری طرف، اپنے اربابِ حکومت کی توجہ اس انقلابی رُوح کی طرف بھی منعطف کرادی گئی ہے جو حضرت موسیٰؑ کے اس دعوائے ایمان میں جھلک رہی تھی۔ جس شخص کا ایمان یہ ہو کہ کائنات کی کسی شے کا پروردگار خدائے بزرگ و برتر کے علاوہ کوئی نہیں، وہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے سامنے بھلا کب جھکنے دے گا۔ فرعون کی نگاہوں نے حضرت موسیٰؑ کے اس سادہ سے جملہ میں انقلابِ آسمانی کی وہ تمام بجلیاں بھانپ لیں جو اس قسم کے ایمان کے سحاب میں بیتاب ہوتی ہیں۔

اور اس دعوے کا ابطال

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی اس استہزاء آمیز تنقید کو اسی حقارت سے ٹھکرادیا جس کی وہ مستحق تھی۔ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر آگے بڑھ گئے اور فرمایا۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ٥ (۲۶/۲۶)۔ "(وہ اللہ) تمہارا رب اور تمہارے آباء و اجداد کا رب ہے"۔ اس ٹکڑے میں درحقیقت ضمناً فرعون کے اس "نشتر" کا بھی جواب تھا کہ تم انسانوں کی ربوبیت کے مدعی ہو، حالانکہ تم اور تمہارے آباء و اجداد (جنہیں تمہاری طرح ہی دعویٰ تھا) سب اپنی پرورش کے لئے بھی اسی بارگاہِ صمدیت کے محتاج تھے (اور ہیں)۔ سو جب تم خود اپنی پرورش کے لئے کسی اور کے محتاج ہو تو تم دوسروں کی پرورش کیا کرسکتے ہو؟ فرعون نے پھر اہلِ دربار کی طرف دیکھا اور کہا کہ سنتے ہو! اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں اور میرے آباء و اجداد (یعنی وہ تمام شہنشاہ جن کی عظمت کے سامنے دنیا کانپتی تھی) اس کے نزدیک سب محتاج ہیں۔ کیا اس قسم کی باتیں کوئی سلیم العقل انسان کرسکتا ہے؟

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ٥ (۲۶/۲۷)

فرعون نے کہا کہ یہ رسول، جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے (سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ) دیوانہ ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی اس جگر پاش تنقید سے پھر اسی بے رُخی کا برتاؤ کیا جس کی درحقیقت وہ سزاوار تھی اور اپنے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ اللہ صرف تمہاری حکومت کے دائرہ میں بسنے والوں ہی کا پروردگار نہیں، بلکہ ساری دنیا میں بسنے والی مخلوق کا رب ہے۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥ (۲۶/۲۸)

موسیٰؑ نے کہا کہ وہ خدا، مشرق و مغرب اور ان کے مابین جو کچھ ہے، سب کا پروردگار ہے۔ اگر تم

(کچھ بھی عقل رکھتے ہو) تو اس حقیقت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں)۔

تخویف کا اوچھا حربہ

فرعون یہ کچھ سنتا جا رہا تھا اور غم و غصہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب جو اس نے دیکھا کہ اس کے دعویٰ ربوبیت کی یوں پے در پے دھجیاں بکھری جا رہی ہیں اور بھی اس کے ارکینِ سلطنت کے سامنے تو کھسیانہ ہو کر، اس حربہ پر اُتر آیا جو مستبد قوتوں کے پاس آخری "دلیل" ہوتا ہے۔ کہا

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ٥ (۲۶/۲۹)

فرعون نے کہا کہ اگر تو میرے سوا کسی اور کو الٰہ (حاکم) تسلیم کرے گا تو قید و بند میں جکڑ دوں گا۔

دیکھئے! سیاستِ فرعونی اور حکمتِ کلیمی کی تمام تفاصیل کس طرح اس مختصر مکالمہ کے اندر جھلمل جھلمل کر رہی ہیں۔ دنیا میں فرعونی قوتیں، انسانوں سے اپنی "معبودیت" تسلیم کرانا چاہتی ہیں اپنے مزعومہ دعوئے "ربوبیت" کی بنا پر اور حکمتِ کلیمی ان کے دعویٰ ربوبیت کی حقیقت کو بے نقاب کر کے ان کی "معبودیت" کے زعمِ باطل کو مٹی میں ملا دیتی ہے۔ شروع سے آج تک دنیا میں یہی کشمکش جاری ہے اور جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سلسلۂ صید و صیّاد

یوں تو دنیا میں ہر شکار میں لذت ہوتی ہے لیکن یہ لذت اپنی انتہا تک اس وقت پہنچتی ہے جب ایک انسان کا شکار دوسرا انسان ہو۔ یہ وہ لہو ہے جو منہ سے لگے نہیں چھوٹتا۔ تاریخِ نوعِ انسانی پر غور کیجئے تو یہ اسی سلسلۂ صید و صیّاد کی ایک خونچکاں داستاں نظر آئے گی۔ قومِ بنی اسرائیل، مصریوں کے پنجۂ آہنی میں ایک بے بس شکار کی طرح تڑپ رہی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ اس کے سوا اور کیا تھا کہ اس مظلوم شکار کو چھوڑ دو اور اجازت دو کہ میں انہیں ساتھ لے کر چلا جاؤں جہاں یہ انسان آزادی کی فضائے بسیط میں اطمینان کا سانس لے سکیں۔ بنظرِ معقولیت (یعنی بنگاہِ انسانیت) دیکھئے تو اس پر اہلِ فرعون کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ لیکن اگر وہ بنی اسرائیل کو ملک سے نکل جانے کی اجازت دے دیتے تو پھر اپنی ہوسِ حکمرانی کی تشنگی کس طرح بجھاتے! مستبد قوتیں صرف اپنے معاملات کی درستی کے لئے ہی اپنی حکومت قائم نہیں کرتیں بلکہ انہیں اپنے جذبۂ حکومت کی

تسکین کے لئے کسی دوسری قوم کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے خون کی رنگینی ان کے قصرِ دولت کی آرائش وزیبائش کے کام آسکے۔ اس لئے اس قسم کی مستبد قوتیں کبھی اجازت نہیں دے سکتیں کہ محکوم قوم ان کے نظامِ حکومت سے نکل کر ... ... اپنا جداگانہ نظام قائم کرلے۔ اس لئے کہ اس سے وہ محکوم قوم برابری کے درجہ پر آجاتی ہیں، محکوم نہیں رہتی اور جیساکہ اوپر لکھا جاچکا ہے، مستبد قوم کی حکومت کے لئے ایک محکوم قوم کا وجود ضروری ہوتا ہے جسے وہ مختلف حیلوں اور حربوں سے دبائے رکھے۔ یہی کچھ فرعون نے کر رکھا تھا۔

فرعون کی حیلہ کاریاں

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَ جَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَ يَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۲۸/۴)

فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ (وہ کرتا یہ تھا کہ) وہاں کے رہنے والوں کی مختلف پارٹیاں بناتا رہتا اور اس طرح ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا۔ (اس غرض کے لئے وہ بنی اسرائیل کے) بیٹوں کو قتل کرادیتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا۔ وہ یقیناً بڑے مفسدین میں سے تھا۔

اس آیۂ جلیلہ کے غوامض پر غور کیجئے۔ مفسد اربابِ حکومت کی دسیسہ کاریوں کی طوالنی فہرست چند لفظوں میں سمٹ کر آگئی ہے۔ گروہ سازی اور پارٹی بندی، وہ بنیادی حربہ ہے جس پر ابلیسی نظام کے قیام کا دارومدار ہوتا ہے۔ (جَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا) اور ان میں سے ایک خاص جماعت کو کمزور رکھنے کی ہر ممکن کوشش، تاکہ وہ اُبھرنے نہ پائے اور ان کی اکثریت نہ ہوجائے (يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ) اور اس طرح جب اُن میں، کاسب افراد کی کمی ہوجائے تو ان کی معاشی حالت بھی کمزور ہوجائے اور یوں رفتہ رفتہ ان کی متاعِ غیرت و حریت اور نقدِ اخلاق و عصمت کو ایک ایک کرکے لوٹ لیا جائے یا ان میں سے جو لوگ ایسے نظر آئیں جن میں جرأت و حریت کے جوہر ہوں انہیں ذلیل و خوار کیا جائے اور جو لوگ ان صفات سے عاری ہوں انہیں معزز و مقرب بنا دیا جائے۔ اس طرح اس محکوم قوم پر احسان بھی رکھا جائے کہ اس سے کس قدر فیاضانہ سلوک کیا جاتا ہے اور انہیں دبائے بھی رکھا جائے۔ یہ ہے وہ فسادِ آدمیت جو فرعونی نظامِ حکومت کا

دسیسہ کاریاں اور گروہ سازیاں

خاصہ ہوتا ہے (اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ) اور اسی فساد کو مٹانے کے لئے ضربِ کلیمی اور حزبِ اللہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ غور کیجئے! کہنے کو تو یہ آج سے تین چار ہزار سال پہلے کی ایک قوم کی داستاں ہے لیکن درحقیقت یہ وہ ابدی حقائق ہیں جو کبھی پرانے نہیں ہوا کرتے۔ یہ حقیقت آج بھی اسی طرح تازہ اور زندہ ہے جس طرح آج سے چار ہزار سال پہلے تھی۔ قرآن، حقائق سے بحث کرتا ہے جو فطرت کے اٹل قوانین کی طرح غیر متبدل ہوتے ہیں۔ طاغوتی سیاست کی جن مہرہ بازیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ کسی خاص قوم، خاص ملک اور خاص زمانہ سے متعلق نہیں ہیں۔ ابلیس شروع سے آدم کے ساتھ ہے اور ساتھ ہی رہے گا۔ وَ فِيْهَا اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔

مطالبات

یہ تھے وہ حالات جن کے ماتحت، حضرت موسیٰؑ نے یہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دے دی جائے۔ یہ مطالبہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ایسا نہیں تھا جسے بآسانی تسلیم کر لیا جاتا۔ اس کی مخالفت میں تو ہر ممکن قوت صرف ہو جانی چاہیئے تھی اور ایسا ہی ہوا۔

پھر حضرت موسیٰؑ کا دوسرا مطالبہ کہ خدائے واحد کی محکومیت اختیار کرو، فرعون کے نزدیک پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جس روش پر آباء و اجداد کے وقت سے چلے آرہے تھے، اس کا چھوڑ دینا! جس حکومت اور "شانِ خداوندی" کو اسلاف سے ورثہ میں حاصل کیا ہے اسے تیاگ دینا!! جس نشۂ قوت و ثروت میں صدیوں سے بدمست چلے آرہے ہیں اسے ترک کر دینا!!! کچھ آسان نہ تھا۔ اس کے لئے بڑی قربانی اور بڑے محکم ایمان کی ضرورت تھی۔ قومِ فرعون بھلا اُسے کس طرح آسانی سے قبول کر لیتی؟ اگر ایسے مطالبات اتنی آسانی سے قبول کر لئے جایا کرتے تو دنیا میں باطل شکن بازوؤں کی ضرورت ہی کیوں پڑتی؟

قومِ فرعون سے ان مطالبات کی مخالفت اور سخت مخالفت غیر متوقع نہ تھی۔ لیکن مشیّت کو یہ منظور تھا کہ جس مظلوم قوم کو اس درجہ کمزور و ناتواں بنا دیا گیا ہے اسے دنیا میں سرفرازی عطا کرے۔ (کیونکہ ان میں ہنوز اس سرفرازی کی صلاحیت باقی تھی)۔

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝ (۲۸/۶-۵)

اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں ملک میں یوں کمزور بنا دیا گیا تھا اور انہیں (قوموں کا) پیشوا بنائیں اور انہیں (قومِ غالب کے تخت و تاج کا) وارث بنائیں اور انہیں ملک میں متمکن کر دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر اس (مآل) کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جس (کے تصور) سے وہ لرزاں تھے۔

خدا کا احسان کیا ہوتا ہے؟

دوسری آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے۔ اہلِ فرعون کو یہی خوف تھا کہ بنی اسرائیل کسی دن اُبھر کر سامنے نہ آجائیں۔ اسی لئے وہ انہیں کچلنے کی مختلف تدابیر اختیار کرتے رہتے تھے۔ لیکن مشیتِ خداوندی نے یہ اعلان کر دیا کہ بالآخر وہی ہو کر رہیگا جس سے وہ یوں لرزاں تھے۔ بنی اسرائیل اُبھرے اور فلسطین اور اس کے گرد و نواح کی زمینوں پر (جو اس زمانہ میں حکومتِ مصر کی باجگذار ریاستیں تھیں) قابض ہو گئے۔ یہ تھا کمزوروں پر اللہ کا احسان۔

لیکن کیا یہ احسان یونہی بیٹھے بٹھائے سایہ فگن ہو گیا تھا؟ اس کے جواب کے لئے ابھی چند صفحات کا اور انتظار کیجئے۔ جب وہ ٹکڑا سامنے آئے گا تو اس وقت معلوم ہوگا کہ یہ احسان کن جاں گداز اور صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد وجہ سرفرازی ہوا تھا۔

دعوتِ مُوسوی کا استقبال

بہرحال، یہ تھا حضرت موسیٰؑ کا وہ مطالبہ اور یہ تھی ان کی وہ دعوت۔ اب دیکھئے کہ اس دعوت کا استقبال کس طرح سے ہوا۔ فرعون نے کہا کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم اللہ کی طرف سے رسول ہو اور اس مقصد کے لئے مامور کئے گئے ہو کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے آزاد کر کے لے جاؤ۔ لیکن اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ تم واقعی مامور من اللہ ہو!

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ٥ (۷/۱۰۶)

فرعون نے کہا کہ اگر تو واقعی کوئی نشانی لے کر آیا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے، تو پیش کر۔

حضرت موسےٰؑ کے پاس نشانات موجود تھے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ٥ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ٥ (۷/۱۰۷-۱۰۸)

اس پر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی، تو اچانک ایسا ہوا کہ ایک نمایاں اژدہا ان کے سامنے تھا!

اور اپنا ہاتھ (جیب سے) باہر نکالا تو اچانک ایسا ہوا کہ دیکھنے والوں کے لئے سفید چمکیلا تھا۔

یہ ترجمہ ان الفاظ کے ظاہراً معنوں کے اعتبار سے ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اگر ان الفاظ کو استعارۃً لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ نے ان قوانین و دلائل کو پیش کیا جس کے سہارے انہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا اور جسے وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان قوانین سے سرکشی کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ یہ دلائل و براہین اپنے زورِ دروں سے اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ ان کی قوت و شدت واضح طور پر سامنے آتی چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ ان براہین کو سامنے لائے جن میں بتایا گیا تھا کہ قوانینِ خداوندی پر عمل کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار و تابناک ہوگا۔ ان دلائل کی درخشندگی و تابناکی ہر دیدۂ بینا کو نظر آتی چلی جا رہی تھی۔

اربابِ حکومت نے جب یہ کچھ دیکھا تو آپس میں کہنے لگے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ (۷/۱۰۹—۱۱۰)

فرعون کی قوم کے سردار (آپس میں) کہنے لگے کہ یہ تو کوئی بڑا سحر کار ہے۔ یہ چاہتا ہے (کہ اپنے زورِ بیان سے کام لے کر لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لے اور) تمہیں ملک سے نکال باہر کرے (اور خود مالک بن بیٹھے)۔

اب بتلاؤ کہ اس بارے میں تمہاری صلاح کیا ہے؟

اس کے بعد فرعون سے کہا۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝ (۷/۱۱۱—۱۱۲)

چنانچہ انہوں نے (باہم مشورہ کے بعد) فرعون سے کہا "موسیٰ اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے کر روک لے اور (اس اثنا میں) نقیب روانہ کر دے کہ (مملکت کے) تمام شہروں سے سحر کار مذہبی علماء کو اکٹھا کر کے تیرے حضور لے آئیں"۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس مقام پر ہم فقط اتنا دیکھیں گے کہ فرعون اور اس کی قوم کی طرف سے اس دعوت کا استقبال کس طرح ہوا۔ قرآنِ کریم مختلف مقامات پر اس گوشہ کے متنوع پہلوؤں کو سامنے لایا ہے۔ سورۂ اعراف کی متعلقہ آیات اوپر گذر چکی ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ (۱۰/۷۶)

پھر جب ہماری جانب سے ان پر سچائی نمودار ہوگئی، تو کہنے لگے، "یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جادو ہے، صریح جادو" (یا کھلا ہوا باطل)۔

اس کا جواب حضرت موسیٰؑ کی طرف سے کیا ملا؟ فرمایا۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ○ (۱۰/۷۷)

موسیٰ نے کہا کہ تم سچائی کے حق میں جب وہ نمودار ہوگئی، ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ سحر ہے؟ حالانکہ سحر کار (یا باطل پرست) کبھی کامیابی حاصل نہیں کرسکتے۔

اسلاف پرستی

اس بصیرت افروز دلیل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن وہ بجائے اس کے کہ حقیقت کو تسلیم کر لیتے، علم و عقل کی راہ چھوڑ کر، فوراً اس روش کی طرف آ گئے، جسے ہم (جوئے نور میں) امم سابقہ کے تذکرہ میں دیکھ آئے ہیں، یعنی اسلاف پرستی کا اندھا جذبہ

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰/۷۸)

انہوں نے (جواب میں) کہا کہ کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لئے سرداری ہو جائے۔

ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں۔"

اسلاف پرستی کی عقیدت اور اپنی قوت و حکومت کا نشہ! انھیں کس طرح چھوڑا جا سکتا تھا؟

سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ○ (۱۷/۱۰۱)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے موسیٰ کو نو آشکارا نشانیاں دی تھیں جب وہ بنی اسرائیل میں ظاہر ہوا تھا۔ تو بنی اسرائیل سے دریافت کرو (کہ کیا ماجرا گذرا تھا)۔ فرعون نے اس سے کہا تھا کہ

اے موسیٰ! میں خیال کرتا ہوں ضرور تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔" (یا تو باطل پرست ہے)۔
(ان نشانوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا) دوسری جگہ ہے۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ (۵۱/۳۹)

سو فرعون نے (دعوتِ کلیمی سے) اپنی قوت (وحکومت کے گھمنڈ پر) روگردانی کرلی اور کہا کہ (یہ) یا تو جادوگر (باطل پرست) ہے اور یا مجنون۔

سچ ہے! قوت کے نشہ میں، عقل و ہوش کی باتیں ایسی ہی نظر آیا کرتی ہیں جیسے رنگین چشمہ میں سے ہر شے رنگدار نظر آتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ (۱۷/۱۰۲)

موسیٰ نے اس پر کہا کہ تو یقیناً جان چکا ہے کہ یہ احکام مجھ پر کسی اور نے نہیں اتارے مگر اُسی نے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے۔ اور ان میں (عبرت و تذکیر کے لئے) سمجھنے بوجھنے کی روشنی ہے۔ اور اے فرعون! میں تو سمجھتا ہوں کہ تُو نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیا ہے۔

کیسی کھری کھری سی بات کہہ دی کہ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی سے نظر آرہا ہے کہ تمہاری ہلاکت کے دن قریب آچکے ہیں۔ غور کیجئے! یہ اس مستبد بادشاہ سے کہا جارہا ہے جس کے نام کی نسبت سے دنیا میں سرکشی و عدوان متعارف ہے، یعنی فرعونیت، رعونت اور تکبر کی شدید ترین صورت کا نام بن چکی ہے، لیکن جو مردِ خدا صرف قوانینِ خداوندی سے ڈرنے والا ہو، اس کے سینے میں کسی اور کا ڈر کیسے آسکتا ہے؟ بقول علامہ اقبالؒ، خوف تو شرک سے پیدا ہوتا ہے۔

ہر کہ رمزِ مصطفےٰؐ فہمیدہ است
خوف را در شرک مضمر دیدہ است

سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے نہایت مسکت دلائل سے واضح کر دیا کہ وہ کس خدا کے فرستادہ ہیں تو فرعون نے کہا۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا

بِسِحۡرِكَ يٰمُوۡسٰى ٥ (۲۰/۵۷)

اس نے کہا " اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ اپنے جادُو کے زور (یا باطل پرستانہ زورِ بیان سے) ہمیں ہمارے ملک سے باہر کردے ؟"

سورۂ مومنین میں، سردارانِ حکومت کی طرف سے ایک ایسا جواب منقول ہوا ہے جو حقائق و معارف کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتا ہے۔

فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا وَ قَوۡمُهُمَا لَـنَا عٰبِدُوۡنَ ٥ (۲۳/۴۷)

وہ (آپس میں) کہنے لگے، کیا ہم اپنی ہی طرح کے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں ؟ حالانکہ ان کی قوم ہماری عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کئے ہوئے ہے۔

رسولوں کی بشریت پر اعتراض

پہلے حصّہ میں ہے کہ کیا ہم ان پر ایمان لے آئیں جو ہماری ہی طرح کے دو انسان ہیں! یہ وہ اعتراض ہے جو اس سے پیشتر بھی ہم سنتے چلے آئے ہیں (اور جس کی تشریح جوئے نور میں گزر چکی ہے) یعنی انسانوں کی اعجوبہ پسند طبیعت اسے پسند کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی کہ انہی جیسا ایک انسان خدا کا رسول ہوسکتا ہے! یہی وجہ ہے کہ تمام اقوام و ملل نے اپنے اپنے " بانیانِ مذاہب " کو انسانیت کے مقام سے اٹھا کر، الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا اور پھر ان کی طرف ایسے ایسے " طلسمِ ہوش ربا " کے سے افسانے منسوب کردیئے جنہیں سُنکر انسان جادو کے جزیروں میں پہنچ جائے۔ یہی اعتراض قومِ فرعون نے کیا۔

محکوم کی بصیرت؟

لیکن اس اعتراض کا دوسرا حصّہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا ہم ان کی بات مان لیں جو اس قوم کے فرد ہیں جو خود ہماری محکوم ہے۔ غور کیجئے، حاکم قوم کی نفسیاتی کیفیت کو چند سادہ الفاظ میں کس قدر وضاحت سے بیان کردیا گیا ہے۔ دنیا میں، حاکم قوم کے نزدیک، محکوم قوم کی کوئی بات درخورِ اعتنا نہیں سمجھی جاتی۔ قومِ غالب کی ہر ادا میں ایک شانِ محبوبیت ہوتی ہے جسے مغلوب قوم بلا سوچے سمجھے اختیار کئے جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہی اس قوم کا تمدن اور وہی اس کی تہذیب بن جاتی ہے۔ حتّٰی کہ اس محکوم قوم کے خیالات، نظریات و معتقدات بھی وہی کچھ

ہوجاتے ہیں جو حاکم قوم کے نزدیک قابلِ ستائش ہوں۔ وہ دیکھتی ہے تو اُن کی آنکھوں سے، سنتی ہے تو اُن کے کانوں سے اور سوچتی ہے تو اُن کے دماغ سے لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ (۷/۱۷۹) دل ہیں لیکن ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ (۷/۱۷۹) "یہ (انسان نہیں) حیوان ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گُم کردہ"۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷/۱۷۹) "یہ لوگ (اپنے آپ سے) بے خبر ہیں"۔

لیکن ان کے برعکس، قوم غالب کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ بات ان کے حیطۂ تصوّر میں بھی نہیں آسکتی کہ محکوم قوم کے ہاں بھی کوئی معقول بات ہوسکتی ہے! اور سچ پوچھئے تو وہ ایسا سمجھنے میں چنداں موردِ الزام بھی قرار نہیں پاسکتے۔ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔" بھوکا اگر یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس دنیا بھر کے افلاس اور محتاجی کا حتمی علاج موجود ہے تو اسے کون ہوشمند صحیح تسلیم کرے گا؟ اس لئے جو قوم عملاً غلام ہو، اس کی بات پر اعتماد کون کرسکتا ہے۔ بقول حکیم الامتؒ۔ ؎

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

آج کا مسلمان آئینہ کے سامنے

آج مسلمان حیران ہے کہ اسلام جب ایک حقیقتِ ثابتہ ہے تو اُسے دنیا بے غل و غش قبول کیوں نہیں کرلیتی۔ لیکن یہ کہتے وقت وہ کبھی نہیں سوچتا کہ دنیا، اسلام کو اس کے پیش کرنے والوں کی حالت سے جانچتی ہے۔ جن پیش کرنے والوں کی حالت یہ ہو (جو ہماری آج ہے) تو ان کی بات سننا کون پسند کرے گا۔ وہ جہاں بھی جائیں گے یہی جواب پائیں گے کہ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (۲۳/۴۷) کیا ان کی بات پر ایمان لے آئیں جو دنیا میں انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں! اگر اس نسخۂ کیمیا میں ایسا ہی حیات بخش اثر ہے جیسا یہ بتاتے ہیں تو ان کی اپنی حالت کیوں ایسی ناگفتہ بہ ہو رہی ہے؟ یہ ایک ایسا اعتراض ہے جس کا کوئی جواب بن نہیں پڑسکتا۔ اسلام کو پیش کرنے کا حق صرف اس قوم کو حاصل ہے جس کی اپنی حالت اسلام کے درخشندہ نتائج کی زندہ دلیل ہو، نہ کہ ان بھکاریوں کا جو اپنی روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے رحم و کرم کے محتاج ہوں۔ انھیں تو اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ منسوب کرنے سے بھی شرم آنی چاہیئے

کہ ان کی وجہ سے دنیا میں اسلام جیسا مہرِ عالمتاب، گہن میں آرہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے سچ کہا ہے کہ

تاندارى از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ او

کس قدر الم انگیز ہے یہ حقیقت جسے زبان وقلم کے بجائے خون کے آنسوؤں ہی سے بیان کیا جاسکتا ہے؟

احسانات کی یاددہانی

پھر لوٹیئے اصل قصہ کی طرف! سورۂ شعراء میں اس واقعہ کے ضمن میں ایک اور ایسی بات آگئی ہے جو دنیا میں سیاستِ فرعونی کی اہم حقیقت اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی جائے، تو فرعون نے کہا کہ "موسیٰ! تُو اور اس قسم کی بغاوت کی باتیں! حالانکہ تجھے یاد ہونا چاہیئے کہ ہم نے کس نازو نعمت سے تیری پرورش کی اور پھر تُو یہاں سے کتنا بڑا جرم کر کے بھاگا تھا۔ اور اس پر بھی ہم نے تجھ سے کوئی مواخذہ نہیں کیا۔ تُو بڑا ہی احسان فراموش واقع ہُوا ہے؟"

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۙ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲۶/۱۹-۱۸)

فرعون نے کہا کیا ہم نے بچپن سے تیری پرورش نہیں کی؟ اور پھر تُو ہمارے ہاں اپنی عمر کے کتنے ہی برس رہا (کیا یہ احسان بھی بھلا دیا؟) اور پھر تُو نے وہ (جرم) کیا جو تجھ سے سرزد ہُوا تھا (اس پر بھی ہم نے مواخذہ نہیں کیا) اور تُو (فی الواقعہ بڑا ہی) ناشکر گزار ہے۔

فرعون کے طعن کا دوسرا حصہ چونکہ ایک جرم کو آپ کی طرف منسوب کر رہا تھا اس لئے آپ نے پہلے اسی کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۗ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۲۶/۲۱-۲۰)

(موسیٰ نے) کہا کہ وہ واقعہ تو مجھ سے نادانستہ ہوگیا اور بھاگا تھا (یوں کہ مقتول چونکہ تمہاری

ؔ ضآلین کی تشریح بعد میں آئے گی۔

قوم کا فرد تھا اس لئے) مجھے ڈر تھا کہ تم انصاف نہیں کرو گے اور مجھے قتل بالعمد کا مجرم قرار دے کر موت کی سزا دیدو گے۔ اس کے بعد اللہ نے مجھے حکم عطا فرمایا اور اپنے رسولوں میں سے بنا دیا (اور میں تیری طرف آگیا)۔

"ہاں! میں بھاگ گیا تھا! اس لئے نہیں کہ میں واقعی قتلِ عمد کا مرتکب تھا اور اپنے آپ کو اس جرم کا مجرم سمجھتا تھا، بلکہ اس لئے کہ تیرے ظلم وستم اور تیرے اربابِ حکومت کی سازش سے ڈرتا تھا کہ ان کے اثر کے ماتحت، فیصلہ حق وانصاف کی رُو سے نہیں بلکہ دوسرے رجحانات ومقتضیات کے مطابق ہونا تھا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ مجھے اللہ کی طرف سے عطا ہوا اس سے وہ تمام خوف دُور ہوگیا۔ باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تمہارے خاندان نے میری پرورش کی، تو اس کے جواب میں، میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ

وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ (۲۶/۲۲)

اور یہ ہے تمہاری وہ نعمت جس کا احسان تُو مجھ پر جتاتا ہے کہ تُو نے (تمام) بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے؟

غور فرمایئے! حضرت موسیٰؑ نے کیسی حقیقت کُشا بات کہی ہے؟ مستبد حکومت کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کے چند ایک ممتاز افراد کو نوازتی ہے تاکہ وہ اس کے خلاف لب کشائی نہ کرسکیں اور پھر ان کی ساری کی ساری قوم کو محکومی کے شکنجے میں کسے رکھتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ جس احسان کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ تم نے قومِ بنی اسرائیل کے ایک فرد کی پرورش کی اور اس کی قیمت اتنی وصول کر رہے ہو کہ ساری کی ساری قوم کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے؟ کیا اسی کا نام احسان ہے؟

فرعون نے جب یہ تمام باتیں سنیں تو بھانپ گیا کہ حضرت موسیٰؑ انقلابات کی کتنی دنیائیں لپنے ساتھ لائے ہیں، کہا کہ میں نے یہ سب کچھ سُن لیا! یاد رکھو۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ٥

(۲۶/۲۹)

اگر تم میرے سوا کسی اور کو سزاوارِ حکومت سمجھو گے تو یقیناً تمہیں قید کر دوں گا۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اگر میرے پاس، میرے دعوے کے ثبوت میں کھلی کھلی دلیلیں موجود ہوں تو کیا تو پھر بھی اسی طرح اپنی ضد پر قائم رہے گا؟

قَالَ اَوَ لَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۲۶/۳۰)

(موسیٰ نے کہا) کہ بھلا اگر میں تیرے سامنے کوئی کھلی ہوئی (دلیل) لے آؤں تو؟

فرعون نے کہا۔

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۶/۳۱)

کہا کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو لے آ (جو کچھ تجھے لے آنا ہے)۔

اس پر۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ (۲۶/۳۲-۳۳)

(موسیٰ نے) اپنا عصا ڈالا تو (دیکھو) وہ ایک صاف صاف اژدھا تھا اور اپنا ہاتھ نکالا، تو وہ ناظرین کے لئے (بالکل) سفید تھا۔

ان الفاظ کو اگر استعارہ کے رنگ میں لیا جائے تو ان کا جو مفہوم ہوگا اسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے (اُسے ہر مقام پر دُہرانے کی ضرورت نہیں)۔

اس پر فرعون نے اراکینِ سلطنت سے کہا۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ (۲۶/۳۴-۳۵)

(فرعون نے) اپنے گردو پیش کے سرداروں سے کہا کہ (یقیناً) یہ ایک بہت بڑا باطل پرست ہے۔ اور اس کے ارادے یہ ہیں کہ اپنے باطل کے زور پر تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کرے۔ سو (کہو) کہ تمہارا کیا فیصلہ (یا حکم) ہے۔

انہوں نے کہا۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ ابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ۝ (۲۶/۳۶-۳۷)

انہوں نے کہا کہ اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دیدے اور شہروں میں نقیب بھیجدے کہ وہ ہر ایک مذہبی عالم کو تیرے پاس لے آئیں۔

اس سلسلہ میں سورۂ اعراف کی جو آیات پہلے گذرچکی ہیں ان میں کہا گیا تھا کہ اربابِ حکومت نے باہمی مشورہ کیا اور پھر فرعون سے کہا کہ پیشواؤں کو جمع کراؤ۔ یہاں فرمایا ہے کہ اراکین سلطنت سے پوچھا تو انہوں نے ایسا مشورہ دیا۔ بات ایک ہی ہے۔ فرعون نے ان سے پوچھا، انہوں نے باہمی مشورہ کیا اور فرعون کے سامنے اپنی تجویز پیش کردی۔ سورۂ نمل میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ قومِ فرعون کے لوگ حضرت موسیٰؑ کی صداقت وحقانیت کے دل سے قائل ہوچکے تھے۔ لیکن اپنی ضد اور قوت وحکومت کے نشہ کی بدمستی کی بنا پر انکار کئے جارہے تھے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۷/۱۳-۱۴)

سو جب ان کے پاس ہماری بصیرت افروز دلیلیں آئیں تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا سحر ہے اور (محض) ظلم اور تکبر کی بنا پر ان سے انکار کردیا' حالانکہ ان کے دلوں نے ان (کی صداقت) کا یقین کرلیا تھا۔ تو دیکھو! (ایسے) مفسدین کا انجام کیا ہوا؟

استہزاء

نشہ کسی قسم کا ہو چونکہ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان عقل وہوش کھو بیٹھتا ہے، اس لئے وہ سطحِ انسانیت سے گر جاتا ہے اور پھر ہر سنجیدہ اور متین بات کا مذاق اڑاتا ہے۔ یہ اس کی بربادی کی آخری علامت ہوتی ہے۔ قوت کا نشہ دوسرے نشوں سے کچھ کم فاتر العقل نہیں ہوتا۔ اس لئے جب فرعون اور اس کے اربابِ دولت سے حضرت موسیٰؑ کے دلائل باہرہ کا کوئی معقول جواب بن نہ پڑا تو آپ کا مذاق اڑانے لگے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ۝ (۴۳/۴۶-۴۷)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے موسےٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف

بھیجا۔ سو اس نے کہا کہ میں خدائے رب العٰلمین کی طرف سے رسول ہوں۔ سو جب وہ ہمارے احکام لے کر ان کے پاس گیا تو وہ ان کا مذاق اڑانے لگے۔

سورۂ قصص میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۝ (۲۸/۳۶)

سو جب موسےٰ ہمارے واضح احکام کے ساتھ ان کے پاس آیا، تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ایک ایسا جھوٹ ہے جو وضع کیا گیا ہے اور ہم نے اپنے آباء و اجداد میں ایسا کہیں نہیں سُنا۔

یعنی قوم فرعون نے کہا کہ ربّ العرش اور اس کی طرف سے مرسلین و مامورین! یہ ایک افسانہ ہے جسے (حضرت) موسیٰؑ نے یونہی وضع کرلیا ہے۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَن جَآءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِندِهِ وَمَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝ (۲۸/۳۷)

اور موسےٰ نے کہا، میرا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور جس کا انجام نہایت اچھا ہونے والا ہے۔ یقیناً ظالم لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس کے جواب میں فرعون نے اراکینِ سلطنت سے کہا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَل لِّي صَرْحًا لَّعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ (۲۸/۳۸؛ نیز ۳۶-۴۰/۳۷)

اور فرعون نے کہا، اے سردارو! میں اپنے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں سمجھتا سو! اے ہامان! میرے لئے مٹی پر آگ جلاؤ (یعنی پزاوہ میں اینٹیں پکاؤ) پھر ایک محل تیار کراؤ تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) موسےٰ کے خدا کو (آسمان پر) جھانک لوں اور اس طرح اس کی خبر پالوں۔ میں یقیناً اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔

لیکن فرعون اور اس کے اربابِ حکومت کا یہ مزاج خود اپنے آپ سے تھا۔ وہ بزعمِ خویش حضرت موسےٰؑ سے مذاق کر رہے تھے لیکن تقدیر، ان کے اعمال کے نتائج دیکھ کر، ان پر ہنس رہی تھی۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ٥ (۲/۱۵)

(حالانکہ) حقیقت یہ ہے کہ انہی کے ساتھ تمسخر ہو رہا ہے کہ اللہ (کے قانونِ جزا و سزا) نے رسّی ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے اور وہ سرکشی (کے طوفان) میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

بہرحال، فرعون نے سب کچھ دیکھنے سمجھنے کے باوجود، حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کی اور ان اصولوں سے سرکشی برتی جن کی طرف آپ دعوت دے رہے تھے۔ سورۂ نازعات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے ارشاد فرمایا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور

فَقُلْ هَلْ لَّكَ إِلٰٓى أَنْ تَزَكّٰى ٥ وَأَهْدِيَكَ إِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ٥

(۱۸ــ ۱۹ /۷۹)

اس سے کہو کیا تو چاہتا ہے کہ تیری تطہیرِ فکر اور تزکیۂ نفس ہو جائے اور میں تجھے تیرے رب کی طرف راہ دکھاؤں اور تُو اس طرح (اپنے موجودہ طرزِ عمل کے عواقب سے) ڈرے۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ اس کی طرف گئے اور فَأَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ٥ صلے (۷۹/۲۰) "فرعون کو ایک بہت بڑی نشانی دکھائی" لیکن فرعون نے اس کی تکذیب کی اور حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ انقلاب سے سرکشی اختیار کی۔ فَكَذَّبَ وَعَصٰى صلے (۷۹/۲۱) اور منہ پھیر کر چل دیا۔ ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعٰى ٥ صلے (۷۹/۲۲) اور اپنی رعایا کو جمع کیا اور منادی کرا دی۔ فَحَشَرَ فَنَادٰى ٥ صلے (۷۹/۲۳)۔ کیا منادی کرائی؟ یہ کہ یاد رکھو! میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں۔ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى ٥ (۷۹/۲۴)۔ سو یاد رکھو میرے سوا کسی اور کی کوئی بات نہ ماننا۔

سورۂ زخرف میں اس "منادی" کی مزید تفصیل دے دی گئی ہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ .... إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ٥

(۵۱ــ۵۴/۴۳)

اور فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کر دیا کہ اے میری قوم! کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں؟ اور کیا یہ نہریں، جو میرے زیرِ اقتدار بہہ رہی ہیں (میری ملکیت میں نہیں؟) کیا تم یہ چیزیں دیکھتے نہیں ہو؟ بلکہ میں اس (دعوتِ انقلاب کو لے کر آنے والے) سے (کہیں) بہتر ہوں۔ یہ تو کمزور سا انسان ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا۔ (اگر یہ اتنا بڑا انسان تھا تو)

اس پر سونے کے کڑے کیوں نہ اتارے گئے یا اس کے جلو میں فرشتے کیوں نہ آئے۔

چنانچہ وہ اس قسم کے پراپیگنڈہ سے اپنی قوم کو فریب میں رکھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ وہ عقل و فکر سے کام نہ لے لیں اور آنکھیں بند کر کے اس کی اطاعت کرتے رہیں۔ اور اصل تو یہ ہے کہ وہ خود ہی فاسق رہنا چاہتے تھے اور وہ نافرمان لوگ تھے۔

ان آیات پر غور کیجئے اور پھر تصور میں لائیے ان جذبات کو جن سے متأثر ہو کر اُس نے یہ اعلان کیا ہوگا۔ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ (۴۳/۵۱)؟ کیا یہ مملکتِ مصر (اور اس کی حکومت) میری نہیں؟ کیا اس کے دریا اور نہریں میرے قبضہ میں نہیں؟ کیا تم یہ کچھ نہیں دیکھ رہے؟ قوت و شوکت کے سب سامان ایک طرف اور دوسری طرف (نقلِ کفر، کفر نباشد) یہ ذلیل و کمزور سا انسان، جو اچھی طرح (مہذب انسانوں کی طرح) بات بھی نہیں کر سکتا! جس کے پاس ایک پیسہ تک نہیں اور دعوےٰ یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر یہ سچا ہے تو اس کے جلو میں آسمان کے فرشتوں کے پرے کیوں نہیں؟ یہ سب جھوٹ ہے۔ کوئی اس کی بات نہ سنے! قوم کی کیا مجال تھی جو اس فرعونی حکم سے سرتابی برتتی (حالانکہ، جیساکہ اوپر لکھا جا چکا ہے، وہ دل سے حضرت موسےٰؑ کی صداقت کے معترف تھے) اس قوم نے اپنے بادشاہ ہی کی اطاعت کی۔ اس لئے کہ قوم بھی تو ویسی ہی تھی جیسا خود فرعون۔ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝ (۴۳/۵۴)

پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت موسےٰؑ نے کس قدر گہرا خطرہ پیدا کر دیا تھا جس کے پیشِ نظر فرعون کو ایسے اعلانات کی ضرورت پڑی۔ غور فرمایا آپ نے کہ ایک داعیٔ انقلاب، رسولِ برحق کی آواز میں کس قدر زلزلہ انگیز کڑک ہوتی ہے کہ وہ دلوں کی بستیوں کو ہلا دیتی ہے۔ دنیا میں علمبردارانِ حق و صداقت کا مسلک ہی یہ ہے کہ وہ غیر خدائی نظام ہائے زندگی میں ایسا تزلزل پیدا کر دیں کہ ہر طاغوتی قوت بلبلا اُٹھے!

پھر اس نکتہ کی طرف بھی آپ نے توجہ کی کہ فرعون نے کہا کہ اگر یہ شخص صاحبِ حشمت و دولت ہوتا تو بھی اس کی بات سُن لی جاتی! لیکن یہ "غیر مہذب" سا مفلس و نادار انسان اور دعوےٰ اس قدر بلند آہنگ! یعنی اسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جسے ہم قومِ نوحؑ کے زمانہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔

فرعون نے اپنی بوکھلاہٹ میں یہ سب کچھ کہا لیکن، بایں ہمہ، اسے خطرہ تھا کہ حضرت موسےٰؑ کی

قوتِ کلیمی دل کش تعلیم اور اس کی تائید میں ایسے واضح دلائل کہیں اس کی قوم کو متاثر نہ کر دیں۔ اس لئے اس نے اس کا علاج یہی سوچا کہ اپنی قوم کے پیشوایانِ مذہب کے ساتھ اس کا مناظرہ کرایا جائے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ باوجود اپنی (بظاہر) بے سروسامانی کے، حضرت موسیٰؑ اپنے اندر کتنی بڑی قوت رکھتے تھے کہ فرعون کو یہ جرأت ہی نہیں پڑی کہ انہیں پکڑ کر قتل کرا دے یا قید کر دے۔ سیرت بلند کی قوت بڑی بے پناہ ہوتی ہے۔ محکوم قوم ہی کیوں نہ ہو، بس ایک کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر سرکشی و استبداد سب قوتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

مردِ حُر محکم ز وردِ لاتخف　　ما بمیداں سر بجیب او سر بکف
بادشاہاں در قباہائے حریر　　زرد رُو از سہمِ آں عُریاں فقیر

بہرحال، فرعون نے حکم دیا کہ ملک کے ساحرین کو اکٹھا کیا جائے۔ اب حق و باطل کی کشمکش کا ایک نیا میدان سامنے آیا۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ (۷/۱۱۳)

چنانچہ ساحرین فرعون کے حضور آئے۔ انہوں نے کہا "اگر ہم موسیٰ پر غالب آئے تو ہمیں اس خدمت کے صلے میں انعام ملنا چاہیئے۔

مقابلہ واقعی اہم تھا اس لئے انعام کا مطالبہ بے جا نہ تھا۔ فرعون نے کہا۔

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ (۷/۱۱۴)

فرعون نے کہا" ضرور ملے گا اور تم سب میرے مقربوں کی صف میں داخل ہو جاؤ گے۔"

ساحرین سے مقابلہ اس سے بڑا انعام اور کیا حاصل ہو سکتا تھا کہ بادشاہ کا تقرّب حاصل ہو جائے۔ تذکرہ حضرت موسیٰؑ میں ساحرینِ قومِ فرعون کے مقابلہ کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے سامنے آنے سے پہلے تمہیداً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اگر عصا اور یدِ بیضا کے متعلق قرآنِ کریم کے الفاظ کے ظاہری معنی لئے جائیں تو یوں نظر آئے گا کہ حضرت موسیٰؑ کا یہ مقابلہ قومِ فرعون کے جادوگروں سے تھا۔ انہوں نے میدان میں جادو کے

زور پر رسیوں کو سانپ بنا کر دوڑتا ہوا دکھایا اور حضرت موسیٰؑ کے عصا نے اژدھا بن کر ان رسیوں کو نگل لیا۔ لیکن اگر قرآنی الفاظ کو استعارات پر محمول کیا جائے تو پھر بات یوں ہوگی کہ وہ مقابلہ قوم فرعون کے مذہبی علماء سے تھا۔ انہوں نے اپنے باطل مذہب کی تائید میں دلائل پیش کئے اور اپنے زورِ بیان سے انہیں بڑا خوشنما بنا کر دکھایا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے دعاوی، خداوندی قانون اور ان کی تائید میں دلائل "منیرہ" کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ بلکہ وہ پیشوایان مذہب حضرت موسیٰؑ کی صداقت کے معترف ہو کر آپ پر ایمان لے آئے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) میں ان الفاظ کے مجازی مفہوم کو ترجیح دیتا ہوں اس لئے میں نے ان آیات کا مفہوم اسی انداز سے پیش کیا ہے۔ جو حضرات ان الفاظ کے ظاہری معنی لینا چاہیں، وہ متعلقہ آیات کا ترجمہ قرآن کریم کے کسی نسخے سے دیکھ لیں۔ مجھے اس پر اصرار نہیں کہ آپ ضرور ان کا مجازی مفہوم لیں۔

اب تمہید کے بعد آگے بڑھئے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ اس معرکہ کے لئے جشن کا دن مقرر کیا گیا تھا اور ذرا دن چڑھے کا وقت تاکہ لوگ ضروریات سے فارغ ہوں اور مجمع زیادہ رہے۔

فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنتَ مَكَانًا سُوًى ۝ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَن يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝ (۲۰/۵۸ - ۵۹)

اچھا ہم بھی اسی طرح تیری سحر طرازیوں کا جواب سحر طرازیوں سے دیں گے۔ ہمارے اور اپنے درمیان ایک دن (مقابلہ کا) مقرر کر دے۔ نہ تو ہم اس سے پھریں نہ تُو۔ دونوں کی پوزیشن برابر ہوگی"۔ موسیٰؑ نے کہا۔
"جشن کا دن تمہارے لئے مقرر ہوا۔ دن چڑھے لوگ اکٹھے ہو جائیں"۔

چنانچہ معاملہ طے کر کے، فرعون ان سے الگ ہوا اور اب اپنی تدابیر کی تکمیل کی فکر کرنے لگا۔

فَتَوَلَّىٰ فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهُ ثُمَّ أَتَىٰ ۝ (۲۰/۶۰)

پھر فرعون نے اُن سے رُخ پھیرا، اپنی تمام تدابیر کو مجتمع کیا، پھر (وقت مقررہ پر مقابلے کے لئے) نمودار ہوا۔

جب مقابلہ کا دن آیا تو حضرت موسیٰؑ نے مجمع کو (یا ان کے مذہبی پیشواؤں کو) مخاطب کر کے کہا۔

قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُم

بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ○ (۲۰/۶۱)

موسیٰ نے (ان سے) کہا کہ افسوس تم پر (تم کیا کر رہے ہو) دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑ اکھاڑ دے۔ جس کسی نے جھوٹی بات بنائی وہ ضرور نامراد ہوا۔

اس تقریر کا یہ اثر ہوا اور وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

فَتَنَازَعُوٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ○ (۲۰/۶۲)

یہ سُن کر وہ آپس میں ردّ و کد کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔

اربابِ حل و عقد نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ تو مقابلے سے پہلے ہی میدان مارے جا رہے ہیں تو مجمع (یا مذہبی پیشواؤں) سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ یہ دونوں بھائی کیا کیا منصوبے باندھ رہے ہیں۔ گوشِ ہوش سے سُنو۔

قَالُوٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ○ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ○ (۶۳-۶۴/۲۰)

پھر (درباری) بولے کہ یہ دونوں بھائی باطل مذہب کے پیشوا ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اپنی فریب کاریوں کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کریں اور پھر تمہارے شرف و عظمت کے مالک ہو جائیں پس اپنے سارے داؤ جمع کرو اور پرا باندھ کر ڈٹ جاؤ۔ جو آج بازی لے گیا، وہی کامیاب ہوگا۔

دیکھئے! کس طرح ان کے جذبات کو مشتعل کیا جا رہا ہے تاکہ حضرت موسیٰؑ کی موعظت نے جو اثر پیدا کیا تھا اسے زائل کر دیا جائے اور انہیں ہر شخص اپنے ملک اور تہذیب و تمدن کا دشمن خیال کرنے لگ جائے۔ "یہ نہ صرف تمہارا ملک ہی چھیننے کی فکر میں ہیں بلکہ اس بلند و بالا تہذیب و تمدن کے مٹا ڈالنے کی بھی تدبیریں سوچ رہے ہیں جس کے تم وارث ہو۔ آنکھیں کھولو! کس سوچ میں ہو!! دیکھو کہ یہ دونوں بھائی کس انقلاب کی ٹھانے بیٹھے ہیں!!"

سورۂ شعراء میں ہے۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ (۲۶/۳۸)

سو جادوگر وعدہ کے مطابق، مقررہ دن پر جمع ہو گئے۔

جادوگروں کے علاوہ عوام کو بھی دعوتِ شمولیت دی گئی تھی۔

وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۙ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ○ (٢٦/٣٩-٤٠)

اور لوگوں سے کہا گیا کہ کیا تم لوگ جمع (نہ) ہوگے۔ اگر ہمارے مذہبی پیشوا غالب آگئے تو ہم انکا جلوس نکالیں گے (اور یوں دھوم سے ان کی عزت افزائی کی جائے گی)۔

اس کے بعد ان کے مذہبی پیشواؤں کی اس درخواست کا ذکر ہے جسے ہم سورۂ اعراف کی متذکرہ صدر آیات میں دیکھ آئے ہیں۔ (دیکھئے (۴۱-۴۲)؛ (۷/۱۱۴)۔

مقابلہ

اب مقابلہ شروع ہوا۔

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ○ (٧/١١٦)

موسیٰ نے ان سے کہا کہ ابتدا تم ہی کرو۔ سو جب انہوں نے اپنے مسلک کو پیش کیا، تو ان کی سحر بیانی کی چمک نے لوگوں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر تم نے فرعون کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس طرح انہوں نے بڑے مکر و فریب کا جال بچھا دیا۔

(تشریح ان امور کی اخیر میں ملے گی) اس کے بعد۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ○

(٧/١١٧)

اور (اُس وقت) ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ تم اپنی تدبیرات کو پوری قوت اور شدت کے ساتھ پیش کرو۔ جب انہوں نے انہیں بیان کیا تو مخالفین کا فریبِ باطل ملیامیٹ ہو کر رہ گیا۔

"عصائے موسوی" باطل کی نظر فریب "رسیوں" کو نگل گیا اور اس طرح

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۚ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۚ (٧/١١٨-١١٩)

اس طرح سچائی ثابت ہوگئی اور ان کا کیا کرایا سب غارت ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرعون اور اس کے درباریوں کو

اس مقابلہ میں مغلوب ہونا پڑا اور (فتح مند ہونے کی جگہ) اُلٹے ذلیل ہوئے۔

قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں بھی اس مناظرہ کا ذکر (قریب قریب) انہی الفاظ میں آیا ہے، دیکھئے ۷۹_۸۲/۱۰؛ ۶۵ _ ۶۹/۲۰؛ ۴۳ _ ۴۵/۲۶)۔آیت (۲۰/۶۶) میں ہے کہ فرعون کے مذہبی پیشواؤں کا اندازِ بیان اس قدر سحر آفریں تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کے دلائل (محض لفاظی کے زور پر) اثر انداز نہ ہوجائیں اور اس طرح وہ کامیاب ہوجائیں. لیکن خدا نے انہیں اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا. تمہارے دلائل ان اثرات کو زائل کردیں گے۔

ساحرین کی نگاہیں

تماشائیوں کی نگاہوں نے تو فقط اتنا ہی دیکھا کہ "ساحرین کے چھوٹے چھوٹے سانپوں کو حضرت موسیٰؑ کا اژدھا نگل گیا" لیکن ساحرین کی آنکھوں نے اس سے کچھ زیادہ دیکھا. انہوں نے جب اپنے مذہب کا موازنہ حضرت موسیٰؑ کے دلائل سے کیا تو انہوں نے علی وجہ البصیرت دیکھ لیا کہ موسیٰؑ کا پیش کردہ دین حق پر مبنی ہے. جب انہوں نے اس طرح حقیقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھ لیا تو حق و باطل الگ الگ نکھر کر سامنے آگئے. تجلیاتِ طور کی ایک ایسی بجلی کوندی کہ جہالت و ضلالت کے ظلمت انگیز پردے یک لخت اُٹھ گئے. ان کی نگہِ بصیرت نے خالقِ ارض و سمٰوٰت کی نشانیوں کو بلا حجاب و نقاب دیکھ لیا اور والہانہ انداز میں سجدہ میں جُھک گئے۔

وَ اُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ (۷/۱۲۰)

اور پھر ایسا ہوا کہ (موسیٰ کی سچائی دیکھ کر) باطل پیشوا بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔

اور سجدہ

یہ وہ سجدہ تھا جس سے زمین و آسمان رقص میں آجائے، جس سے باطل کے "ہر خدا" کی اصلیت آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہوجائے، وہ سجدہ جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

مسلمانیم و آزاد از مکانیم ۔۔۔ بروں از حلقۂ نہ آسمانیم

بما آموختند آں سجدہ کزوے ۔۔۔ بہائے ہر خداوندے بدانیم

سجدہ سے اُٹھے اور کہا۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۝

(۷/۱۲۱–۱۲۲ ؛ ۲۰/۷۰ ؛ ۲۶/۴۷–۴۸)

انہوں نے کہا کہ "ہم اس پر ایمان لائے جو جملہ کائنات کا پروردگار ہے۔ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

کیا درخشندہ تھا طالع ان بیدار بخت مذہبی پیشواؤں کا جس پر ساری کائنات کی عظمتیں اور ثروتیں قربان کر دی جائیں۔ وہ سجدہ نصیب ہوا جس سے ان کی خاک آلود پیشانیوں میں رفعتوں کے ہزار عرش جگمگا اُٹھے۔ یہی تھا وہ سجدہ جس کے لئے مردانِ حق آگاہ کی آہِ سحرگاہی ان التجاؤں اور تمناؤں کے ساتھ بابِ رحمت پر دستک دیتی ہے کہ

خواہم ایں جہاں وآں جہاں را مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش بوجد آرم زمین و آسماں را

یہی وہ سجدہ تھا جس نے انہیں وہ جرأت عطا کر دی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹ کے سامنے سے سرفرازانہ آگے بڑھ جائیں۔ ہم غلامانہ ذہنیت کے خوگر اس سجدے کی لذت کو کیا جانیں ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

فرعون کی شعلہ باری

ہم ساحرین کے تحیّر انگیز جذبۂ ایمان کے کیف بار و نشاط آور منظر میں کچھ اس طرح جذب ہو گئے کہ یہ بھول ہی گئے کہ فرعون کی قلبی کیفیت کا بھی جائزہ لے لیں کہ اس پر اس غیر متوقع انقلاب سے کیا گزری؟ اس میدانِ مبارزت میں ساحرین کے سحر کی ناکامی ہی کچھ کم الم انگیز نہ تھی۔ اس پر جب دیکھا کہ خود ساحرین "موسےٰ کے خدا" پر ایمان لے آئے ہیں (یعنی بزعمِ فرعون، دشمن سے جا ملے ہیں) تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کے دل و دماغ کی حالت کیا ہو گئی ہو گی! ذلت اور ایسی کھلی ہوئی ذلت! شکست اور ایسی رُسوا کن شکست!! وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کف بردہاں سیلاب کی طرح اُمڈا کہ ہیں! میری موجودگی میں ایسی کھلی ہوئی بغاوت!

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ (۷/۱۲۳)

فرعون نے (غضبناک ہوکر) کہا کہ مجھ سے اجازت لئے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ ایک خفیہ سازش ہے جو تم نے (مل جُل کر) دارالسلطنت میں کی ہے تاکہ اس کے باشندوں کو اس سے نکال باہر کرو۔ اچھا، تھوڑی دیر میں تمہیں (اس کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا۔

کسی مسلک کو صحیح جان کر اس پر ایمان لے آنا انسان کے اپنے دل کے فیصلہ پر موقوف ہونا چاہیئے۔ لیکن استبداد بھلا اس کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ وہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ کی عقل و بصیرت اور قلب و دماغ کا فیصلہ کچھ ہو، کرنا وہ ہو گا جس کا حکم دیا جائے گا۔ اسی لئے فرعون نے کہا کہ "میری اجازت کے بغیر ایمان لے آئے؟" پھر جیسا کہ مستبد حکومتوں کا قاعدہ ہے، ساحرین کے اس عمل کو خود ایک سازش قرار دے دیا تاکہ انہیں بغاوت کے الزام میں ماخوذ کر لیا جائے۔ ساحرین کا ایمان علیٰ وجہ البصیرت تھا۔ لیکن چونکہ اس سے قصرِ حکومت میں تزلزل واقع ہوتا تھا اس لئے اسے سازش قرار دے دیا گیا، جس کی سزا فرعون کی "عدالت" میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ (۷/۱۲۴)

میں ضرور ایسا کروں گا کہ پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں، پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں۔

سورۂ طٰہٰ میں فرعون کے قول کا دوسرا حصہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ ساحرین کے اس فعل سے عوام پر بے حد بُرا اثر پڑا ہے تو معاملہ کو مشتبہ بنانے کے لئے یہ مشہور کر دیا کہ یہ ساحر (درحقیقت) حضرت موسیٰؑ کے شاگرد ہیں اور اس لئے ان کی آپس میں ملی بھگت ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ○ (۲۰/۷۱ نیز ۲۶/۴۹)

فرعون نے کہا کہ "تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس سے

تم نے سحر کی تعلیم حاصل کی ہے ۔ اچھا، دیکھو، میں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹواؤں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے اور کس کا عذاب دیرپا ہے۔

ساحرین کا ایمان

جوروِ استبداد کی ان قہرمانی بجلیوں کو آپ نے دیکھ لیا! اب ساحرین کے کوہ تمثال عزم و ایمان کی تجلیات کا تابناک منظر بھی دیکھئے۔ اب ساحرین بھی وہ نہیں تھے جن کا اندازہ فرعون نے کیا تھا۔ وہ اب خدائے حیّ و قیّوم پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لا چکے تھے اور یہ وہ ایمان ہے جسے پھر دنیا کی کوئی طاقت اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا!

دنیا میں ساری قوتوں کا راز، ایمان میں مضمر ہے۔ جس قدر آپ کا یقین محکم ہے، اسی قدر ناقابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں۔ شکست و کامرانی کا بنیادی مدار قاطبۃً ساز و سامان پر نہیں، یقین و عدمِ یقین پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہو گا وہی دنیا میں کامیاب و شادکام ہوں گے۔ یہی شکست و فتح کا اٹل پیمانہ ہے۔ اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔ جب یقین، ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے اور ایمان ہو، اَللّٰہُ وَاحِدُ الْقَھَّار پر، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلا سکتی۔ لہٰذا، فرعون کی دھمکی، ایمان و ایقان کے ان آہنی پیکروں پر کیا اثر کر سکتی تھی۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

فرعون نے اپنے انتہائی غضب و جلال میں کہا کہ "تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا۔ تمہاری تکا بوٹی کر دوں گا۔ ڈرو میرے غضب سے! خوف کھاؤ میرے انتقام سے!!" لیکن اس سے ان استقلال و استقامت کے مجسموں پر کیا اثر ہوا؟ انہوں نے ایک خفیف سی ہنسی سے فرعون کی طرف نگہِ حقارت سے دیکھا اور کہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ جن حقائق کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، کیا تمہارے ڈر سے ان کی تکذیب کر دیں؟

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا... (۲۰/۷۲)

انہوں نے کہا کہ جس خدا نے ہمیں پیدا کیا اور جو کچھ دلائل و بصیرت کی بنا پر ہمارے سامنے

آ گیا، اس پر ہم (اب، تجھے کبھی ترجیح نہیں دے سکتے۔
" فرعون"! تو کیا جانے کہ ہماری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے؟ تجھے کیا معلوم کہ خدا پر ایمان کی لذت کیسی ہوتی ہے؟ یہ تیری دھمکیاں اور تخویف و ترہیب کی شعلہ باریاں، ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ (۲۰/۷۲) جو کچھ فیصلہ تُو کرنا چاہتا ہے، کر ڈال، جو تیرے جی میں آئے، کر گزر۔ تیرے آہنی ہاتھ زیادہ سے زیادہ اسی طبیعی زندگی تک ہی گلوگیر ہو سکتے ہیں۔ اس سے آگے تو کر ہی کیا سکتا ہے؟ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ (۲۰/۷۲)۔ تو صرف اسی دنیا کی زندگی تک ہی حکم دے سکتا ہے۔ ہم اپنے اللہ پر ایمان لا چکے ہیں، اب اس ایمان سے ہمیں کوئی پھیر نہیں سکتا۔"

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ
وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ۝ (۲۰/۷۳)

ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے کہ وہ ہماری سابقہ لغزشوں کے اثرات سے ہمیں محفوظ رکھے بالخصوص سحر آفرینی کی اس خطا کوشی سے تُو نے مجبور کیا تھا (ہمارے لئے) اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔

ساحرین، فرعون کو یہ جواب دے رہے تھے اور آسمان کے فرشتے محوِ تحیر، بارگہِ ایزدی میں عرض کر رہے تھے کہ اے الٰہ العالمین! تیرا ارشاد بجا تھا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۳۰)۔ اسی آدم کی ذریت میں جسے ابلیس نے بہکانے اور پھسلانے کا یوں دعویٰ کیا تھا، ایمان اور ایقان کے ایسے فولادی پیکر بھی موجود ہیں، جن کی کیفیت یہ ہے کہ

چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

سورۂ اعراف کی آیات (۱۲۵ ـ ۷/۱۲۱) اور سورۂ شعراء کی آیات (۵۰ ـ ۲۶/۵۱) میں بھی اسی واقعہ کو دہرایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مذہبی پیشواؤں نے فرعون کی دھمکیوں کا جواب کس قدر حقارت کی ہنسی سے دیا۔

ایک ایمان یہ تھا اور ایک ایمان اس انداز کا کہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰی وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ۝ (۲۲/۱۱)

اور (دیکھو) کچھ لوگ ایسے ہیں جو لوگ اللہ کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) تو اختیار کرتے ہیں
مگر دل کے جماؤ سے نہیں۔ اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچ گیا، تو مطمئن ہو گئے۔ اگر کوئی آزمائش آگئی،
تو اُلٹے پاؤں اپنی (بے یقینی) کی حالت کی طرف لوٹ گئے۔ وہ دنیا میں بھی نامراد ہوئے اور آخرت
میں بھی۔ اور یہی ہے جو آشکارا نامرادی ہے!

علیٰ وجہ البصیرت ایمان اور "پیدائشی مسلمان" کے ایمان میں یہی فرق ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

ما بمیداں سر بجیب، اُو سر بکف

دارد اندر سینہ تکبیرِ اُمم ۔ در جبینِ اوست تقدیرِ اُمم
قبلۂ ما گہ کلیسا، گاہ دیر ۔ او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر
صبح و شام ما بفکرِ ساز و برگ ۔ آخرِ ما چیست؟ تلخیہائے مرگ
در جہانِ بے ثبات او را ثبات ۔ مرگ اُو را از مقاماتِ حیات
اہلِ دل از صحبتِ ما مضمحل ۔ گِل ز فیضِ صحبتش دارائے دل
کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن ۔ اُو ہمہ کردار و کم گوید سخن
ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست ۔ فقرِ اُو از لآاِلٰہ تیغے بدست
ما بہ پرِ کاہے اسیرِ گرد و باد ۔ ضربتش از کوہِ گراں جوئے کشاد

محرمِ اُو شو، ز ما بیگانہ شو
خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

ایسے کھُلے ہوئے فیصلے کے بعد، ہونا یہ چاہیئے تھا کہ تمام قوم حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آتی لیکن
اسلاف پرستی کی اندھی عقیدت، حکومت کا ڈر، محکوم قوم کے فرد کی طرف سے دعوت، پھر فرعون کا
خوف، یہ ایسے موانع تھے جو حق و صداقت کی قبولیت میں حائل تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کے بعد بھی
فرعون کے حکم ہی کا اتباع کیا۔ (۱۱/۹۶-۹۸)

بنی اسرائیل کی تنظیم و تربیت

لیکن حضرت موسیٰؑ کے سامنے، قوم فرعون کی تنذیر ہی نہ تھی، بلکہ اس سے بڑا مقصد، خود بنی اسرائیل کی تنظیم و تعلیم تھی۔

قوم فرعون کے ساتھ جو معاملہ درپیش تھا وہ تو اس عظیم سکیم کا تخریبی پہلو تھا جس کے لئے حضرت موسیٰؑ مامور ہوئے تھے۔ تعمیری پہلو خود بنی اسرائیل کی تربیت تھی اور حضرت موسیٰؑ اس سے غافل نہیں تھے۔ حکومتِ خداوندی کے قیام کے لئے صرف استبدادی قوتوں کی ہلاکت و بربادی ہی ضروری نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان قلوب واذہان کی تعمیر وتطہیر بھی ضروری ہے جن کے ہاتھوں، اس کہنہ عمارت کی شکست و ریخت کے بعد، آسمانی حکومت کا قصرِ مشید تعمیر ہوتا ہے۔ اگر ساری زندگی، طاغوتی قوتوں کی تخریب میں ہی صرف کر دی جائے تو یہ فقط حصہ لَآ اِلٰہ ہوگا، اِلَّا اللّٰہ کا پہلو سامنے نہ آئے گا۔ اس کے لئے ساتھ ہی ساتھ قوم کی تعلیم وتربیت بھی نہایت ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل صدیوں سے غلامی کے شکنجہ میں جکڑے چلے آرہے تھے۔ اس لئے ان میں عزم واستقلال کے جوہر بہت کم رہ گئے تھے۔ محکومی سے تن آسانی، عافیت کوشی اور سہل انگاری کی افسردگی ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکی تھی اور وہ اس نہج زندگی کے اس درجہ خوگر ہو چکے تھے کہ ان پر

قفس ہوا تھا حلال اور آشیانہ حرام

وہ ہر انقلاب آفریں تدبیر میں مصائب ومشکلات کے طوفان پوشیدہ دیکھتے تھے۔ تبدیلیٔ احوال کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ کے سامنے، یہ مرحلہ، پہلے مرحلہ سے بھی زیادہ دشوار گزار اور صبر آزما تھا۔ (تفصیل ان امور کی خروجِ مصر کے بعد کی داستان میں ملے گی) اس لئے وہ انہیں باربار تاکید کرتے تھے کہ ذرا عزم و استقلال سے کام لو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی تائید ونصرت کس طرح تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ راستہ کی مشکلات کو استقامت سے برداشت کر جاؤ۔ انجام کار میدان تمہارے ہی ہاتھ رہے گا۔

غلاموں کی ذہنیت

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ ۟ۙ یُوْرِثُہَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ ؕ وَ الْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ (۷/۱۲۸)

تب موسیٰ نے اپنی قوم کو (نصیحت کرتے ہوئے) کہا " خدا سے مدد مانگو اور (اس راہ میں) جمے رہو۔ بلاشبہ زمین (کی بادشاہت صرف) خدا ہی کے لئے ہے۔ یہ اس قوم کو ملتی ہے جو اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق اسے لینا چاہے (کشمکش خواہ کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو)۔ مآلِ کار کامیابی انہی کی ہوتی ہے جو اس کے قوانین کی نگہداشت کریں۔

لیکن ان بیکرانِ آب و گل کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑانا آسان نہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ انہیں عزم و استقلال کے لئے اُبھارتے اور شکوہ سنج ہوتے کہ "تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں رہے اور اب تمہارے آنے کے بعد ان میں اور اضافہ ہو گیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اب آرام سے گزرے گی۔ لیکن اب تو مشکلات اور بھی بڑھ گئیں۔ تم اچھے چارہ ساز بن کر آئے!" حضرت موسیٰؑ ارشاد فرماتے کہ کیوں گھبراتے ہو، ذرا حوصلہ سے کام لو، تھوڑی سی استقامت دکھاؤ، پھر دیکھو کیسا انقلاب آتا ہے؟ (۷/۱۲۹)۔

نوجوانوں کی طرف سے لبیک

لیکن جن لوگوں کی ہڈیوں کے گودے کے اندر غلامی کے جراثیم پیوست ہو چکے ہوں، جن کے نہ سینے میں دل ہو، نہ دل میں زندہ آرزوئیں، جو خوئے غلامی میں پختہ تر ہو چکے ہوں، ان پر بھلا ان حیات آور خطبات و پیغامات کا کیا اثر ہو؟ قوم کے بڑے بوڑھے اپنے دماغوں میں انقلابی تصور شاذ ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ کی تعمیر اسی آب و گل سے ہوتی ہے جو غلامی کے عناصر سے مرکب ہوتے ہیں۔ البتہ (اگر ان کے جوہرِ انسانیت بھی بالکل کچلے نہ جا چکے ہوں تو) نوجوانوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ انہیں زندگی بخش قالب میں ڈھال لیا جائے۔ قوموں کی زندگی میں انقلاب ہمیشہ نوجوانوں کی قوتِ بازو کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ کے پیغامِ حیات آور پر لبیک انہی نوجوانوں کی طرف سے ہوا۔ بڑے بوڑھے سب فرعون کے خوف سے لرزاں و ترساں رہے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ (۱۰/۸۳)

اور موسیٰؑ پر کوئی ایمان نہیں لایا مگر صرف ایک گروہ، جو اس کی قوم کے نوجوانوں کا تھا اور ان کا ایمان نہ لانا، فرعون اور اس کے سرداروں کے خوف کی وجہ سے تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ وہ انہیں کسی مصیبت میں مبتلا کر دیں اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش (بادشاہ) تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ (ظلم و استبداد میں) بالکل چھوٹ تھا۔

یہی وہ حلقۂ نوجوانانِ آہن گداز تھا جو حضرت موسیٰؑ کے پیغامِ انقلاب انگیز کا مخاطب تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا

اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ○ (۱۰/۸۴)

اور موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کی فرمانبرداری کرنی چاہتے ہو، تو چاہیئے کہ صرف اسی پر بھروسہ کرو اور فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو۔

اور یہی تھا وہ گروہ جس کی طرف سے اس خطاب کا جواب ان الفاظ میں آیا تھا۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ (۸۵–۱۰/۸۶)

انہوں نے کہا "ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا (ہم دُعا کرتے ہیں کہ) پروردگار! ہمیں اس ظالم گروہ کے لئے آزمائشوں کا موجب نہ بنایئے (کہ اس کے ظلم وستم کے مقابلہ میں کمزوری دکھائیں) اور اپنی رحمت سے ایسا کریں کہ ہم اس کافر گروہ سے نجات پا جائیں۔

تدریجی تبدیلیاں

(تفصیل ان امور کی چند صفحات آگے چل کر ملے گی)، یہ بھی یاد رہے کہ منزلِ محکومیت سے محلِ آزادی تک پہنچنے میں، راستہ میں سینکڑوں مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی جست میں پورے کا پورا مرحلۂ انقلاب طے ہو جائے۔ اس لئے کسی انقلابی تحریک کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ پہلے ہی قدم میں آخری منزل تک جا پہنچے گی، غلط ہے۔ تبدیلی ہمیشہ آہستہ آہستہ رونما ہوا کرتی ہے (اگرچہ حضرات انبیائے کرامؑ کے باب میں یہ تدریج بھی ایسی برق رفتار ہوتی ہے کہ عام حالات میں جو تبدیلی برسوں میں پیدا ہو، وہ ان کے زیرِ تربیت، دنوں میں رونما ہو جاتی ہے۔ لیکن بایں ہمہ، قلب ونگاہ میں تبدیلی ہوتی ہے بتدریج)۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰/۸۷)

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون پر وحی کی کہ سرِدست اپنی قوم کی سکونت مصر ہی میں رہنے دیں اور ان کے گھروں ہی کو تربیت گاہ بنا لیں اور اس طرح نظامِ صلوٰۃ کے قیام کی ابتداء یہیں سے کر دیں اور جو ایمان لائے ہیں انہیں کامیابی کی بشارت دیں۔

ظاہر ہے کہ استخلاف فی الارض کی آخری منزل تو یہ ہوگی کہ "ساری زمین مسجد" ہو جائے۔ لیکن اس کی

ابتدا یہ ہے کہ اپنے گھروں ہی کو تربیتی مراکز بنا لیا جائے اور وہیں اقامتِ صلوٰۃ کی بنیاد رکھ دی جائے یعنی اس آنے والے انقلاب کے لئے اپنے گھروں سے تیاریاں شروع کر دی جائیں. پہلے اپنے اپنے گھر کی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے مطابق بنایا جائے. پھر رفتہ رفتہ اس دائرہ کو وسیع کرتے چلے جائیں تا آنکہ یہ سارے معاشرہ کو محیط ہو جائے. اس طرح تدریجاً تحریکِ انقلاب، اپنے نقطۂ آخریں تک پہنچ جائیگی. لیکن یہ بھی واضح رہے کہ تدریجی تبدیلیوں سے یہ مفہوم نہیں کہ آپ ایک مقام پر آ کر رُک گئے اور وہیں قناعت سے بیٹھ گئے. رُک جانا تو موت کے مرادف ہے. ندی اس وقت تک ندی ہے جب تک رواں ہے. جونہی کسی مقام پر ٹھہر گئی، جوہڑ بن گئی. اگر نصب العین نگاہوں کے سامنے ہو اور قدم اسی منزل کی طرف بڑھتے جائیں تو ابتداءً اپنے گھروں کو قبلہ بنا لینا بھی سلسلۂ انقلاب کی ایک کڑی ہے. دلوں اور نگاہوں میں انقلاب درحقیقت اس وقت سے بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے جب سطح بین نگاہیں منظرِ عام پر انقلاب کے آثار محسوس کرتی ہیں.

انقلاب اور صلوٰۃ

پھر غور کیجئے کہ اس انقلابِ عظیم کے لئے سب سے پہلے اقامتِ صلوٰۃ کا ارشاد ہوا ہے. یہ موقع تفصیل کا نہیں. (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) لیکن حقیقت یہی ہے کہ زمین پر آسمان کی بادشاہت قائم کرنے کی بنیاد، اقامتِ صلوٰۃ ہی سے شروع ہوتی ہے. اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود "نماز پڑھنا" ہی نہیں، بلکہ صلوٰۃ کی INSTITUTION کو قائم کرنا ہے جس کے اندر ایمان باللہ، وحدتِ مقصد، للہیت، مرکزیت، وحدتِ ملت، اجتماعیت، قیامِ امارت، اطاعتِ امیر، یک نگہی و ہمرنگی، غرضکہ فکر و نظر کی تطہیر اور ایمان و عمل کی وحدت کے سب سامان موجود ہوتے ہیں. صلوٰۃ دراصل مظاہرہ ہے اس عظیم حقیقت کا کہ ہمارے قلوب و جوارح کی ہر حرکت قانونِ خداوندی کے تابع رہے گی اور یوں اس تعبّد و تذلّل سے دنیا بھر کی سرفرازیاں اور سربلندیاں حاصل ہو جائیں گی. اسی لئے حکومتِ الٰہیہ کے قیام و بقا کے لئے اقامتِ صلوٰۃ مرکزی حیثیت لئے ہوئے ہے. وہ صلوٰۃ جس کے قائم کرنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

دو گیتی را صلاۃ از قراتِ اوست ۔ مسلماں لا یموت از رکعتِ اوست

ندانند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز ۔ قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست

حکومت کے مشورے لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی اس قسم کی تنظیم و تربیت، فرعون اور اس کے ارکینِ سلطنت کی آنکھوں میں کس طرح کھٹک رہی ہوگی!

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ (۷/۱۲۷)۔

اور قوم فرعون کے ارکین نے کہا کہ کیا تو موسےٰ اور اس کی قوم کو اسی طرح چھوڑ رکھے گا کہ وہ (یوں) ملک میں فساد برپا کرتے رہیں اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں!

دیکھئے! اس "مشورہ" کو نفسیاتی طور پر کس درجہ موثر بنایا گیا ہے. مذہبی عقیدت اور ذاتی وقار، قلبِ انسانی کے نازک ترین گوشے ہیں. اس مشورہ میں انہوں نے ان دونوں گوشوں کی چٹکی لی ہے اور یوں اس خطرہ کو سخت بھیانک بنا کر دکھایا گیا ہے۔ فرعون نے کہا کہ بنی اسرائیل سے اس قدر ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں یہ تو ہماری محکوم قوم ہے. ہم قوت کے آہنی پنجوں سے ان کا گلا گھونٹ دیں گے.

قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ ○ (۷/۱۲۷)

اُس نے کہا کہ ہم ان کے ابناء کو ذبح کر دیں گے اور ان کی نساء کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان کے اوپر غالب ہیں.

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ، جیسا پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت قتلِ ابناء کا جو قانون نافذ تھا وہ یا تو بعد میں معطل کر دیا گیا تھا یا اس کی تنفیذ میں کچھ زیادہ سختی نہیں برتی جاتی تھی۔ فرعون نے کہا کہ زیادہ خطرہ بنی اسرائیل کی کثرت سے ہے. سو اس کا علاج ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے، یعنی وہی قتلِ ابناء والا قانون. بڑے بوڑھوں سے تو کوئی خطرہ نہیں، خطرہ ہوتا ہے اُبھرنے والی نسلوں سے. سو ان کا یوں خاتمہ کرایا جا سکتا ہے.

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَ مَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ○ (۴۰/۲۵)

سو جب (موسےٰ) ہماری طرف سے حق لے کر ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ ان لوگوں کے

بیٹوں کو قتل کر دو جو اس پر ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دو (انہوں نے یہ تدبیر کی لیکن یاد رکھو ان نہ ماننے والوں کی تدبیر بے نتیجہ رہنے والی تھی۔

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ "قتلِ ابناء" اور "استحیاء نساء" سے مفہوم یہ بھی ہے کہ قوم کے ان افراد کو ذلیل و خوار کیا جائے جو اپنے اندر جوہرِ مردانگی رکھتے ہوں اور انہیں آگے بڑھایا جائے جو عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر بیٹھے رہنے والے ہوں۔ ان معانی کی رُو سے آیاتِ بالا کا دوسرا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ حکومت، فرعون کی اس تدبیر سے مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے اس پر زور دیا کہ اگرچہ قتلِ ابناء بھی ضروری ہے لیکن اس کا نتیجہ تو بہت دیر میں جا کر برآمد ہوگا۔ آج جو عظیم الشان خطرہ سامنے ہے، وہ تو (حضرت) موسیٰؑ کی وجہ سے ہے۔ اس خطرہ کا بھی تو کوئی علاج کرنا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فرعون کو آمادہ کر لیا کہ حضرت موسیٰؑ کو قتل کر دیا جائے۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَ لْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ (۴۰/۲۶)

فرعون نے کہا کہ (بہت اچھا یونہی سہی) مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں۔ (اب) اسے چاہیئے کہ اپنے ربّ کو بلائے (کہ وہ اسے بچا لے!) میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں تمہارے آئین و نظام کو نہ بدل دے اور یا یہ کہ ملک میں فساد برپا کر دے۔

دیکھئے! قومِ فرعون کے نزدیک انسانیت کی اصلاح کا نام کس طرح "فساد" رکھا جاتا ہے؟ ان کے نزدیک اصلاح اور امن پسندی تو اسی کا نام ہو سکتا تھا کہ یہ قومِ مغلوب ان کے نظام و آئین کو قبول کر کے سب کچھ خاموشی سے برداشت کئے جاتی۔ اس دھمکی کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے فرمایا:

وَ قَالَ مُوْسٰۤی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ۝ع (۴۰/۲۷)

میں ہر اس متکبّر (کے پنجۂ استبداد) سے جو خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں رکھتا اپنے اور تمہارے لئے ربّ کی پناہ مانگتا ہوں۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی صداقت کا اثر عام طور پر ہو چکا تھا لیکن قومِ فرعون اپنے مصالح کی بنا پر اس کا زبان سے اعتراف نہیں کرتی تھی۔ خود ارکینِ سلطنت میں ایسے لوگ موجود تھے جو دل

سے حضرت موسیٰؑ کے حق بجانب ہونے کے قائل تھے لیکن اس کیفیتِ قلبی کو چھپائے ہوئے تھے۔ جب حضرت موسیٰؑ کا معاملہ دربار میں پیش ہوا اور فرعون نے اس پر اظہارِ رضامندی کر دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے تو انہی میں سے ایک مردِ مومن سے نہ رہا گیا۔ وہ اُٹھا اور اس تجویز کے خلاف ایسی معرکہ آرا تقریر کی جسے قرآنِ کریم نے اپنے اوراق میں محفوظ کر کے اسے حیاتِ جاوید عطا کر دی ہے۔ تقریر کیا ہے؟ حرارتِ ایمانی کا زندہ مظاہرہ اور حقائق و معارف کا اُبلتا ہوا سرچشمہ ہے۔ یہ تقریر، سورۃ المومن کے چوتھے اور پانچویں رکوع میں مسلسل دی گئی ہے۔ وہاں دیکھ لیں، یعنی (۲۸ — ۴۰/۴۵) میں۔

دربارِ فرعون کا ایک مردِ مومن

جوں جوں حضرت موسیٰؑ کی دعوت و تبلیغ کا حلقۂ اثر و نفوذ وسیع ہوتا جاتا تھا، فرعون کی ضد اور سرکشی بڑھتی چلی جاتی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی انقلاب آفریں دعوتِ حق و صداقت اتنا گہرا اثر پیدا کر چکی تھی کہ باوجود فیصلہ کر لینے کے، فرعونی حکومت آپ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکی۔ بایں ہمہ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ انہوں نے انقلاب کی اس بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے کے لئے کون کون سے استبدادی حربے استعمال نہ کئے ہوں گے۔

ابتدائی تباہیاں

اس مقام پر اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ کشمکش، حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کسی ذاتی مخاصمت کا نتیجہ نہیں تھی۔ نہ ہی سوال حضرت موسیٰؑ کی اپنی قوم اور غیر قوم کی آویزش کا تھا۔ باطل نظام انسانیت کے لئے تباہ کُن ہوتا ہے اور آسمانی انقلاب کے داعیان کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو اس (غلط) نظام کی تباہ کاریوں سے بچائیں۔ اس سلسلہ میں ان کی پہلی کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ خود اس نظام کی جگہ حق پر مبنی نظام قائم ہو جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو جس قدر انسانوں کو اس نظام کے چنگل سے چھڑایا جا سکے، چھڑا لیا جائے۔

باطل نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ عدل و انصاف کی جگہ ظلم و استبداد، قانون کی حکمرانی کی جگہ دھاندلی، امن و سکون کی جگہ خوف و ہراس، احترامِ آدمیت کے بجائے نسلی اور قومی تعصبات لے لیتے ہیں۔ معاشرہ کا نظم و نسق بگڑ جاتا ہے۔ 'corruption' عام ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں، جن کا حسنِ تدبیر سے نہایت آسانی سے

ازالہ ہو سکتا تھا ــــ بلکہ حفظِ ماتقدّم کے ذریعے انہیں پیدا ہونے سے روکا جا سکتا تھا، وہ عام ہوتی چلی جاتی ہیں اور سخت نقصانات کا موجب بن جاتی ہیں. قرآنِ کریم "انہیں" عذابِ الٰہی" کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ یہ قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی اور مستقل اقدار سے سرکشی کا نتیجہ ہوتی ہیں. اسی قسم کی خرابیاں فرعونی معاشرہ میں رونما ہونی شروع ہو گئی تھیں اور وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ (حضرت) موسیٰؑ کی" بددعاؤں" کا نتیجہ ہے چنانچہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب کوئی ایک قسم کی خرابی نمودار ہوتی تو حضرت موسیٰؑ سے درخواستیں اور التجائیں کرنے لگ جاتے کہ ہم اپنی روش سے باز آتے ہیں لیکن اس کے بعد پھر اسی روشِ کہن پر گامزن ہو جاتے اور، دنیا میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے. خود اپنے زمانہ کے کوائف و احوال پر غور کیجئے. جب ایک غلط نظام کے اثرات و نتائج، عذابِ خداوندی کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں تو لوگ ایک "نظامِ جدید" کے لئے پکار اٹھتے ہیں جو صاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف ہوتا ہے کہ ہمارا موجودہ نظام غلط خطوط پر متشکل ہے لیکن اس آفت سے نجات مل جانے کے بعد ساری عقل و دانش اس کوشش میں صرف کر دی جاتی ہے کہ پہلے نظام کے حلقوں میں جہاں جہاں کچھ ڈھیل اور کمزوری رہ گئی تھی انہیں اچھی طرح سے کس دیا جائے. یہی کچھ قومِ فرعون نے کیا.

وَ لَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّکَّرُوْنَ ۝ ..... فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۷/۱۳۰ــ۱۳۲)

اور ہم نے فرعون کی قوم کو خشک سالی کی تباہی اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تھا، تاکہ وہ متنبہ ہوں. تو جب کبھی ایسا ہوتا کہ خوشحالی آتی، تو کہتے' یہ ہمارے حُسنِ تدبّر کی وجہ سے ہے. اور اگر ایسا ہوتا کہ سختی پیش آجاتی' تو کہتے' یہ موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے. حالانکہ یہ نحوست ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی جس کے مطابق اچھے اور بُرے نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں. اور فرعون کی قوم نے کہا کہ (اے موسیٰؑ!) تو اپنا جادو چلانے کے لئے کتنی ہی نشانیاں لائے' مگر ہم ماننے والے نہیں".

یہ تباہیاں مختلف شکلوں میں نمودار ہوئیں.

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ قف فَاسْتَکْبَرُوْا وَ کَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ۝ (۷/۱۳۳)

پس ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیوں کے دَل اور فصلوں کو تباہ کرنے والے کیڑے اور مینڈکوں

کی کثرت اور فسادِ خون کی بیماریاں یہ سب اس امر کی علامات تھیں کہ ان کے تمدن کی بنیاد میں خرابی واقع ہو گئی ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ قوانینِ خداوندی کی دعوت سے کشی کرتے رہے۔ وہ درحقیقت تھا ہی مجرموں کا گروہ۔

جب مصیبت آتی تو حالت یہ ہو جاتی کہ

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۚ (۷/۱۳۴)

جب ان پر عذاب کی سختی واقع ہوتی تو کہنے لگے "اے موسیٰ! تیرے پروردگار نے تجھ سے (نبوت کا) جو عہد کیا ہے تو اس کی بنا پر ہمارے لئے دعا کر۔ اگر تیری دعا سے عذاب ٹل گیا تو ضرور ہم تیرے معتقد ہو جائیں گے اور بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے کہ تیرے ساتھ چلے جائیں"

اور جب ٹل جاتی تو پھر ویسے کے ویسے ہوتے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰٓ أَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ۝ (۱۳۵)

سو جب ہم، کچھ وقت کے لئے، ان سے اس سختی کو دور کر دیتے، جس تک انہوں نے بالآخر اپنی غلط روش کی وجہ سے پہنچ کر رہنا تھا، تو وہ اپنے عہد کو توڑ ڈالتے۔

آیات (۱۰۱ — ۱۷/۱۰۲)؛ (۴۶ — ۴۳/۵۰) میں بھی یہی حقائق مذکور ہیں۔ بہرحال، انہوں نے اللہ کے قانونِ مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا حتیٰ کہ ان کے جرائم کے سب سے بڑے نتیجہ (ہلاکت و بربادی) کے ظہور کا وقت آگیا۔

ہجرت

اب حضرت موسیٰؑ سے ارشاد ہوا کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے کر مصر سے ہجرت کر جائیں۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ ۝ (۲۰/۷۷ نیز ۲۶/۵۲)۔

اور (پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لے جا اور انہیں سمندر کے اس حصے سے پار لے جا جہاں پانی خشک ہو چکا ہے۔ اس طرح

تجھے نہ تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا نہ کسی اور طرح کا خطرہ[1]۔

واضح رہے کہ یہ ہجرت، کشمکشِ زندگی سے گریز نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ (جوئے نور میں) حضرت ابراہیمؑ کے تذکرۂ جلیلہ میں لکھا جاچکا ہے، باطل سے کنارہ کشی کرکے حق کی طرف رُخ پھیر لینا ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ میدانِ جہاد میں پینترا بدلنا ہوتا ہے۔ مومن کے لئے ماحول وہی ہے جس میں وہ انسانی غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہوکر اللہ کی محکومیت میں زندگی بسر کرسکے۔ اس کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ جس ماحول میں پیدا ہوا ہے اس کے ذرّات کو ترتیبِ نو دے کر، ایک ایسی فضا پیدا کردے جو اس مقصد کے لئے سازگار ہو لیکن اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو پھر بجائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو اس غلط ماحول سے مانوس کرکے دہیں کا ہو رہے اسے کسی ایسی فضا کی طرف گامزن ہوجانا چاہیئے جو اس کے مقصد کے لئے سازگار ہو یا جسے سازگار بنانے کے امکانات قریب تر ہوں۔ مچھلی کے لئے جہانِ آب ہی مطابقِ فطرت ہے۔ جہاں پانی خشک ہونے لگتا ہے وہ فوراً اس مقام کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کا رُخ کر لیتی ہے جہاں پانی کی فراوانی ہو۔ اگر وہ ماحول کی موانست کے جذبہ کے ماتحت قیدِ مقامی اختیار کرے تو یہ اس کے لئے موت کے مرادف ہے۔ غیر مساعد ماحول سے سازگار فضا کی طرف منتقل ہوجانا، یہ ہے ہجرت[2]۔

سورۂ ابراہیم میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ (۱۴/۵)

اور دیکھو یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اپنے احکام کے ساتھ موسےٰ کو بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لے آئے اور انہیں ان تاریخی سرگذشتوں کی یاد دلائے جن میں قانونِ خداوندی کو تسلط حاصل ہوا تھا۔ ان سرگذشتوں میں ان لوگوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں

---

[1] سمندر کیسے پار کیا گیا تھا اُس کی تفصیل آگے چل کر سامنے لائی جائے گی۔

[2] مشیّت کے پروگرام کے ماتحت ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ہجرت کے بعد حالات موافق ہوجائیں تو پھر باطل کی شکست کے لئے اسی مقام کی طرف لوٹا جائے جہاں سے ہجرت کی گئی تھی۔

جو مستقل مزاجی سے کام لیتے ہیں اور خدا کی عطا کردہ قوتوں کی قدر کرتے ہیں.

نُور و ظلمت کے معنی انسانی غلامی کی تاریکیوں سے نکل کر حکومتِ خداوندی کی تابناک تجلیوں کی طرف منتقل ہو جانا، یہی ہجرت ہے. ظلمات سے نور کی طرف جادہ پیما ہو جانے کا یہ مفہوم، دوسرے مقامات سے بھی واضح ہو جاتا ہے. سورۃ بقرہ میں ہے.

.....فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۲/۲۵۶)

پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کرے (یعنی سرکشی و فساد کی قوتوں سے بیزار ہو جائے) اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے (فلاح و سعادت کی) مضبوط شاخ پکڑ لی. یہ شاخ ٹوٹنے والی نہیں (جس کے ہاتھ آگئی وہ گرنے سے محفوظ ہو گیا) اور یاد رکھو' اللہ سب کچھ سننے والا' جاننے والا ہے.

یہاں اصولی طور پر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ہر غیر خدائی نظامِ زندگی سے مُنہ موڑ کر صرف نظامِ خداوندی اختیار کرنا' یہ ہے محکم راہِ عمل' اس سے آگے ہے.

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۥ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲/۲۵۷)

اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں. وہ انہیں تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے. مگر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے' تو ان کے مددگار سرکش اور مفسد ہیں. وہ انہیں روشنی سے نکالتے اور تاریکیوں میں لے جاتے ہیں. سو یہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی ہے' ہمیشہ عذاب میں رہنے والا!

یہاں واضح ہے کہ ظلمات سے نور کی طرف انتقال کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ یہ ہے پیغامِ خداوندی کا مقصودِ حقیقی. قرآنِ کریم اسی نورانی منزل کی طرف راہ نمائی کرنے کے لئے نازل ہوا ہے. قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ (۵/۱۵). "تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور یعنی واضح کتاب آچکی ہے" جس کا مقصد یہ ہے کہ

يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ

مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (۵/۱۶)

خدا اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو (ہوائے نفس کی جگہ) احکامِ خداوندی کے تابع ہوں سلامتی کی راہ کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے (یعنی اپنے مقررہ قانون کے بموجب) انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا اور (کامیابی و سعادت کی) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے!

خود سورۂ ابراہیم (جس میں حضرت موسےٰؑ کے ظلمات سے نور کی طرف منتقل ہو جانے کا ذکر اوپر آ چکا ہے) کی ابتدا اس آیۂ جلیلہ سے ہوتی ہے۔

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ (۱۴/۱ نیز ۵۷/۹ ؛ ۶۵/۱۱)

الف۔ لام۔ را

یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اتاری ہے تاکہ لوگوں کو ان کے پروردگار کے قانون کے مطابق، تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے کہ یہی غالب اور ستودہ خدا کی راہ ہے۔

درود کا مفہوم

جو مومن، اس مقصدِ عظیم کے حصول کی خاطر جدّوجُہد کرتے ہیں، اللہ اور ملائکہ کی تائید و نصرت ان کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ اس کا نام دُرود (صلوٰۃ) ہے۔ (ملائکہ کا مفہوم "ابلیس و آدم" میں دیکھئے)۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ○ (۳۳/۴۳)

اللہ وہ ہے جو خود اور اس کے ملائکہ تم پر (درود) صلوٰۃ بھیجتے ہیں تاکہ تمہیں ظلمات سے نور کی طرف نکال کر لے جائیں اور اللہ مومنین پر رحمت کرنے والا ہے۔

یہی تائید و نصرت، جس سے مقصد ظلمات (طاغوتی نظام) سے نور (نظامِ خداوندی) کی طرف لے جانا ہے، نبی اکرمؐ کو حاصل تھی جنہوں نے اپنے بے پناہ عمل سے یہ بتایا کہ اس صفحۂ ارض پر اللہ کی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ (۳۳/۵۶) "یقیناً اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں"۔ اسی تائید و نصرت کی تاکید جماعتِ مومنین سے کی گئی، یعنی حضورؐ کے اس مقصدِ جلیلہ کے حصول اور اس کے بعد اس کے استحکام کے لئے عملی جدّوجُہد،

تاکہ انسانیت بر طاغوتی نظام سے نجات حاصل کر کے، خدائی حکومت کے تابع زندگی بسر کر سکے اور یوں طاغوتی نظام کی تاریکیوں سے نظامِ الٰہی کی درخشندہ روشنی میں آجائے جس سے ہر شے اپنے صحیح مقام پر ٹھیک ٹھیک دکھائی دے۔ اسی کا حکم حضرت موسیٰؑ کو دیا گیا کہ "ہمارے بندوں کو زمینِ مصر کی (انسانی غلامی کی) تاریکیوں سے نکال کر فلسطین کی ارضِ مقدس کی طرف لے چلو جہاں خدائی نظام کے قیام کے امکانات موجود ہیں۔ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ (۱۴/۵)

لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، فرعون کی حاکم قوم اس کی کب اجازت دے سکتی تھی کہ وہ محکوم قوم جو صدیوں سے ان کی ہوس کاریوں، کام جوئیوں اور چیرہ دستیوں کی تسکین کا ذریعہ تھی، ان کے ہاتھوں سے نکل جائے؟ اِدھر بنی اسرائیل نے یہاں سے نکلنے کی تیاریاں شروع کیں، اُدھر قوم فرعون انہیں روکنے کی تدابیر سوچنے لگی۔ سورۂ شعراء میں، جہاں حضرت موسیٰؑ سے فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کو لے کر شبا شب مصر سے نکل جاؤ، یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان کا تعاقب بھی کیا جائے گا۔

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ (۲۶/۵۲)

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے جا (اور سمجھ رکھو کہ) تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔

اس کے لئے فرعون نے پہلے ہی سے احکام نافذ کر رکھے تھے۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ۝ وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ۝ وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ۝

(۲۶/۵۶-۵۳)

پس فرعون نے شہروں میں نقیب دوڑا دیئے (یہ پیغام دے کر) کہ یہ ایک چھوٹی سی اور ذلیل سی جماعت ہے جو ہمیں (اپنی سرکشی سے) برافروختہ کرنے (کے درپے) ہے اور ہم ایک محتاط جماعت ہیں (سو ہمیں ابھی سے ان کی فکر کر چھوڑنی چاہیئے) ہمارے پاس بڑے بڑے لشکر ہیں۔

لیکن اِدھر، فرعون کی طرف سے یہ ڈھونڈی پٹ رہی تھی اور اُدھر خدا کا قانونِ مکافات اعلان کر رہا تھا کہ سب سننے والے سن لیں کہ۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۙ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ كَذٰلِكَ ۭ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝ (۲۶/۵۹ ـ ۵۷)

اور ہم نے (قومِ فرعون کو) باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور عزت والے مقامات سے نکال دیا اور ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔

بنی اسرائیل کا تعاقب

بنی اسرائیل راتوں رات نکلے لیکن قوم فرعون نے ان کا تعاقب کیا۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۝ (۲۶/۶۰)

سو انہوں نے سورج نکلتے ان کا پیچھا کیا۔

ایسے میں بنی اسرائیل کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سمندر ہے۔ ذرا اندازہ لگایئے اس حالت کا کہ پیچھے فرعون اور اس کا لشکرِ جرار، تباہیوں کا ایک ہجوم اپنے ساتھ لئے اُمڈے چلا آرہا ہے، سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور ان کے درمیان بنی اسرائیل کی قوم!

قوم گھبرا اٹھی اور کہنے لگی کہ بس اب نجات کی کوئی راہ نہیں۔

فَلَمَّا تَرَاۗءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ (۲۶/۶۱)

سو جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسےٰ کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم یقیناً پکڑے گئے۔

لیکن حضرت موسیٰؑ کے دل پر گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت پر ان کا محکم ایمان تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایمان کے مظاہرے کے مقامات بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ (۲۶/۶۲)

کہا کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا (کہ ہم گھر جائیں) میرا رب میرے ساتھ ہے سو وہ (یقیناً) مجھے (سلامتی کی) راہ دکھائے گا۔

غور کیجئے! صبر و استقلال، سکون و طمانیت، اعتماد علی اللہ کے کیسے محکم قلعے ہیں جن کے اندر حضرت موسیٰؑ اپنے آپ کو محفوظ و مصئون پاتے ہیں۔ قوموں کی قیادت کے لئے انہی جوہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ سے ارشاد ہوا کہ اور آگے بڑھ جاؤ۔ وہ بڑھ گئے اور صحیح و سلامت دوسرے کنارے تک

جنودِ فرعون کی غرقابی

جا پہنچے۔ فرعون اپنے جنود و عساکر کے ساتھ پیچھے لپکا۔ لیکن عذابِ الٰہی کے تلاطم نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ سب کے سب غرق ہو گئے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۚ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۚ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ (۲۶/۶۳ — ۶۶)

چنانچہ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی جماعت کو لے کر (فلاں سمت سے) سمندر کی طرف چلو اور وہاں سے انہیں، اس راستے سے پار لے جاؤ جو خشک ہو چکا ہے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ کہ بنی اسرائیل، ایک عظیم تودے کی طرح پانی کے اس طرف ہیں، اور فرعون کا لشکر اسی قسم کے تودے کی طرح اس طرف۔

لیکن فرعون کی قوم بنی اسرائیل کی دیکھا دیکھی آگے بڑھ گئی اور وہ سب غرق ہو گئے۔

(اس مقام پر ہم نے مجازی معنی کی رو سے آیات کا مفہوم بیان کر دیا ہے۔ جو صاحب ان کے لغوی معنی لینا چاہیں وہ قرآنِ کریم کے کسی ترجمہ کو دیکھ لیں)۔ اس سلسلہ میں آیات (۱۷/۱۰۳)؛ (۲۰/۷۸ — ۷۹) — (۲۸/۴۰ — ۴۱)؛ (۵۱/۴۰) بھی دیکھ لیجئے۔

سورۂ دخان میں فرمایا۔

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ۝ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝ ...... فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ (۴۴/۲۲ — ۲۹)

اور موسیٰ نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ مجرم لوگ ہیں۔ (ہم نے کہا) تو میرے بندوں کو رات کے وقت نکال کر لے جا، تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ جب تم سمندر کے کنارے پہنچو گے تو اس کا پانی (مدّوجزر کی وجہ سے) پیچھے ہٹا ہوگا۔ تم ساکن سمندر کے خشک حصے سے پار چلے جانا۔

فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تو دیکھو! قوم فرعون نے کتنے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور عزت کے مقامات چھوڑے اور وہ آسائشیں جن میں وہ شاداں اور فرحاں تھے۔ اور اس طرح ہم نے ان چیزوں کا وارث دوسری قوم (بنی اسرائیل) کو بنا دیا۔ اور قوم فرعون (کی ہلاکت) پر نہ آسمان رویا نہ زمین اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی۔

آخری آیت کے الفاظ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے اندر کس قدر بلیغ حقیقت پوشیدہ ہے۔ ایک ظالم و مستبد انسان، یا انسانوں کی جابر قوم جو دوسرے انسانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ کر رکھنے کی کوشش کرتی ہے، وہ جسدِ کائنات میں ایک زہر آلود انگلی کی طرح ہے جس کا کٹ جانا، باقی جسم کی سلامتی کا موجب ہے۔

مرگِ اُو اہلِ جہاں را زندگی است

اس لئے اس کی موت اور بربادی نوعِ انسانی کے لئے وجۂ شادمانی ہوگی نہ کہ باعثِ تاسّف۔ لہٰذا اس کی تباہی پر کس کی آنکھیں نمناک ہو سکتی ہیں!

فرعون کا ایمان قرآن کریم میں ہے کہ جب فرعون نے دیکھا کہ موت سامنے کھڑی ہے تو اس نے ڈوبتے ڈوبتے حضرت موسیٰؑ کو پکارا اور کہا کہ میں تمہارے رب پر ایمان لاتا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ ایمان جس کا اعلان موت سے بچنے کے لئے کیا جائے، میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتا ہے؟ ایمان خودی کے استحکام کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایمان جو ترہیب یا ترغیب (خوف یا لالچ) سے اختیار کیا جائے، ضعفِ خودی کی دلیل ہے۔ اس لئے اسے ایمان کہنا، ایمان کے مفہوم سے بیگانگی کا ثبوت ہے۔ ایسے ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُۥ
بَغْيًا وَعَدْوًا ۖ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنتُ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ
إِلَّا الَّذِيٓ آمَنَتْ بِهِۦ بَنُوٓا إِسْرَآءِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (۱۰/۹۰)

اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے لشکر

نے پیچھا کیا۔ مقصود یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں۔ لیکن جب فرعون نے دیکھا کہ وہ غرق ہونے لگا ہے، تو پکار اُٹھا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ اس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور میں بھی اسی کے فرمانبرداروں میں ہوں۔

جواب ملا۔

اَلْئٰنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ کُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ (۱۰/۹۱)

(ہم نے کہا) "ہاں اب تو ایمان لایا، حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد تھا۔

فرعون کے مقابلہ میں اس کے ساحرین کے ایمان پر نگاہ ڈالئے، زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ یہ بدبخت تو اپنے کفر میں بھی پختہ نہ نکلا۔ اس کی خودی بڑی خام تھی۔ وہ درحقیقت خودی تھی ہی نہیں، محض سلطنت و قوت کی بنیاد پر تجبّر اور غرور تھا۔ خودی، ساحرین کے اندر تھی۔ جب وہ بحالتِ کفر تھے تو اپنے کفر کو بزعمِ خویش درست سمجھتے تھے، اس لئے دنیا کا کوئی خوف یا لالچ انہیں اس روش سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ جب ان کی نگاہوں نے دیکھا کہ حقیقت دوسری طرف ہے تو وہ علیٰ وجہ البصیرت ایمان لے آئے اور ان کی خودی اس کوہ تمثال استقلال کی صورت میں جلوہ پیرا ہوئی جس کا مظاہرہ ان کی طرف سے فرعون کی دھمکی کے جواب میں ہوا۔ قیمت درحقیقت خودی کی ہے۔ بحالتِ کفر، خودی غلط قالب میں ڈھلی ہوتی ہے۔ اسلام اس خودی کو قوانینِ الٰہیہ کے تابع لاکر اس میں مزید استحکام و عروج کے سامان پیدا کرتا ہے۔ انجن وہی ہوتا ہے، اسے صحیح پٹڑی پر ڈال دیا جاتا ہے اور اس کی حرارت اور قوت کو اور جِلا دے دی جاتی ہے۔ اسی کو 'بالفاظِ دیگر' یوں کہا گیا ہے کہ "مومن اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیتا ہے۔" (ان امور سے متعلق کچھ اشارات "ابلیس و آدم" میں ابلیس اور شیطان کے عنوان میں گذر چکے ہیں، باقی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)۔ سو فرعون کو اس کی آخری آواز کا وہی جواب ملا جس کا وہ درحقیقت مستحق تھا۔ جب موت سامنے آجائے تو، توبہ بے معنی ہو جاتی ہے۔

لہ یاد رہے کہ یہ جواب (بزبانِ حضرت موسیٰؑ) اس خدا کی طرف سے ملا تھا جو دلوں کے بھید سے واقف ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس ایمان کا محرک جذبہ کیا ہے۔

وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۴/۱۸)

لیکن ان لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو (ساری عمر تو) برائیاں کرتے رہے، لیکن جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہوئی، تو کہنے لگا "اب میں توبہ کرتا ہوں" (ظاہر ہے کہ ایسی توبہ، سچی توبہ نہ ہوئی)۔ اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں۔ ان تمام لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے (جو انہیں پاداشِ عمل میں پیش آئے گا!)۔

فرعون کی لاش

فرعون کی غرقابی کے واقعہ کے ضمن میں قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝ (۱۰/۹۲)

پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، ایک نشانی ہو اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے یک قلم غافل ہیں!

اس آیت کا صحیح مفہوم ایک عرصہ تک مرکزِ بحث و نظر بنا رہا اس لئے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ فرعون کی لاش کو آنے والوں کے لئے کس طرح محفوظ رکھا گیا تھا۔ چونکہ حقیقت سمجھ میں نہیں آتی تھی اس لئے اس سلسلہ میں عجیب و غریب افسانے وجود میں آگئے۔ تاآنکہ اٹھارویں صدی میں مصر کے تہ خانوں سے ان کے قدیم بادشاہوں کی حنوط (ممی شدہ) لاشیں برآمد ہونی شروع ہوئیں جن میں سے ایک کے متعلق علمائے مصریات کی تحقیق ہے کہ وہ فرعونِ موسیٰؑ (ریمیسس ثانی) کی لاش ہے (دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)۔ اب اس آیہ جلیلہ کا صحیح مفہوم سامنے آگیا۔ قرآنِ کریم کے حقائق و غوامض کا وہ حصہ جس کا تعلق مختلف علوم سے ہے علم و تحقیق کی روشنی میں ہی صحیح طور پر سمجھ میں آسکتا ہے۔ زمانہ من حیث الکل علمی تحقیقات کی رُو سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ جوں جوں ان تحقیقات میں اضافہ ہوتا جائیگا

اور وہ قیاس سے یقین کے درجہ تک پہنچتی جائیں گی۔ قرآنِ کریم کے معارف رموزِ فطرت کی طرح بے نقاب ہوتے جائیں گے اور اس طرح وہ آیات، جو پہلے متشابہات میں داخل تھیں رفتہ رفتہ محکمات کے ذیل میں آتی جائیں گی حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ (۴۱/۵۳) یہاں تک کہ یہ حقیقت مسلّمہ طور پر سامنے آجائے گی کہ قرآنِ کریم کا ایک ایک حرف حق ہے۔

بہرحال، اس طرح بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں، اہلِ مصر کے عذاب سے نجات ملی اور فرعون مع اپنے جنود و عساکر کے غرقِ دریا ہو گیا۔ بنی اسرائیل اس کے بعد، سینا کی وادیوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم ان کی داستان کا یہ نیا ورق اُلٹیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے جو اس وقت آپ کے

سمندر کیسے پھٹ گیا تھا؟

دل میں رہ رہ کر اُٹھ رہا ہے، یعنی یہ کہ بنی اسرائیل نے پاپیادہ سمندر کو کس طرح پار کر لیا، اس سمندر کو جس میں فرعون اپنے ساز و یراق اور لاؤ لشکر سمیت غرق ہو گیا۔

فرقِ بحر کے متعلق قرآنِ کریم میں حسبِ ذیل مقامات پر ذکر آیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

وَ اِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَیۡنٰكُمۡ وَ اَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ۝ (۲/۵۰)

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

اور پھر وہ وقت یاد کرو، جب (تم مصر سے نکلے تھے اور فرعون تمہارا تعاقب کر رہا تھا) ہم نے سمندر کا پانی اس طرح الگ الگ کر دیا کہ تم بچ نکلے اور فرعون کا گروہ غرق ہو گیا اور تم (کنارہ پر کھڑے) دیکھ رہے تھے۔

آیات (۷/۱۳۸) ؛ (۱۰/۹۰) میں وَجٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ آیا ہے، یعنی ہم بنی اسرائیل کو سمندر کے اس پار سے لے آئے۔

اور سورۃ شعراء میں ہے:۔

فَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡبَحۡرَ ؕ فَانۡفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرۡقٍ كَالطَّوۡدِ الۡعَظِیۡمِ ۝ (۲۶/۶۳)

اس کا لفظی ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنے "عصا سے سمندر کو مار" پس وہ پھٹ گیا اور ہر ایک حصہ ایک بڑے تودے کی طرح تھا۔

اس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے (بحکمِ وحی) سمندر کو "اپنے عصا سے مارا" اور سمندر پھٹ گیا۔ بنی اسرائیل پار اُتر گئے اور جب فرعون ان کے تعاقب میں سمندر کے اندر پہنچا تو پھر پانی چڑھ آیا اور وہ (مع اپنے لشکر کے) غرق ہو گیا۔ لیکن قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں یہ آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا تھا کہ اپنی قوم کو سمندر کے ایک خشک راستہ سے نکال کر لے جائیں۔ اس سے "اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ" کا دوسرا مفہوم بھی سامنے آ جاتا ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰىٓ ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ (۲۰/۷۷)

اور (پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لیجا اور انہیں سمندر کے اس حصے سے پار لے جا جہاں پانی خشک ہو چکا ہے۔ اس طرح تمہیں نہ تو تعاقب کرنے والوں سے کوئی خدشہ ہوگا اور نہ ہی غرق ہو جانے کا ڈر[1]۔

یہ آیت، مفہوم پیشِ نظر کو زیادہ وضاحت سے بیان کر رہی ہے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کو پہلے ہی بذریعہ وحی ارشاد ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں اور پھر "انہیں سمندر میں خشک راستہ سے لے چلیں" (فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا) یہاں سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سمندر میں کسی مقام پر خشک راستہ نکلنے کا بھی امکان تھا۔ لیکن یہ امکان (یا اس راستہ کا سراغ) حضرت موسیٰؑ پر بذریعہ وحی منکشف ہوا تھا۔ یہ راستہ کس طرح نکل سکتا تھا؟ اس کے متعلق سورۃ دخان میں ایک اشارہ ہے جہاں فرمایا:۔

---

[1] اس کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کا یہ اطمینان بخش جواب بھی ملا کر پڑھئے جو اس گھبراہٹ کے وقت انہوں نے اپنی قوم کو دیا تھا کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (۲۶/۶۲) یعنی میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے یقیناً بہت جلد صحیح راہ دکھا دیگا۔ (سَيَهْدِيْنِ) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے آپ کو اس خشکی کی راہ کا سراغ دیدیا۔

وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝ (۴۴/۲۴)

اور سمندر کو اُترا ہوا چھوڑ دو۔ یہ ایک لشکر ہے جو غرق کیا جائے گا۔

اس آیت میں رَهْوًا کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اس کے ایک معنی ہوتے ہیں پُرسکون، یعنی جب سمندر کا جوش باقی نہ رہے اور وہ پُرسکون ہو جائے۔ اور دوسرے معنی ہیں، وہ جگہ جہاں سے سمندر پیچھے ہٹ جائے اور اس طرح وہ حصّہ خشک ہو جائے۔ یہ دونوں شکلیں سمندر میں مدّ و جزر کے سلسلہ میں، جزر (پانی کے پیچھے ہٹ جانے) کے وقت ہوتی ہیں۔ آیت (۲۰/۷۷) میں یَبَسًا کا مفہوم بھی اس سے واضح ہو جاتا ہے، یعنی سمندر کی وہ جگہ جو خشک ہو چکی ہو۔ ان آیات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا تھا کہ تم "سمندر کے اس مقام سے جس کا تمہیں سراغ دیا گیا ہے ایسے وقت میں گذرو جب پانی اُترا ہوا ہو۔ پھر جب تمہارے تعاقب میں لشکرِ فرعون آئے گا تو اس وقت پانی کے چڑھاؤ کا وقت ہوگا۔" یہاں سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اس پایابی کی کیا صورت پیدا ہوئی ہوگی۔ ذرا نقشہ پر نگاہ ڈال لیجئے۔ بحرِ احمر (RED SEA) بحرِ ہند سے الگ ہو کر، عرب اور مصر کو دو قطعوں میں تقسیم کرتا ہوا، بحرِ روم کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اخیر میں پہنچ کر یہ دو چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ بائیں طرف کی شاخ، جو ذرا بڑی ہے، اب نہر سویز کے ذریعہ بحرِ روم سے ملا دی گئی ہے۔ لیکن حضرت موسےٰؑ کے زمانہ میں نہر سویز موجود نہ تھی۔ ان دونوں شاخوں کے درمیان مثلث قطعہ میں سینا کی وادیاں ہیں جہاں بنی اسرائیل کو پہنچنا تھا۔ بحرِ احمر کا یہ حصّہ، آج ایک بحرِ عمیق ہے۔ لیکن دنیا میں، مرورِ زمانہ سے، جو جغرافیائی تغیّر و تبدّل پیدا ہو رہے ہیں وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ خشکیاں، پانی میں اور پانی خشکی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ابتدائی ادوار میں یہ تبدیلیاں بہت زیادہ واقع ہوا کرتی تھیں۔ بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق بحرِ احمر زمانۂ قدیم میں متعدد جزیروں سے پٹا ہوا تھا اور قیاس ہے کہ اس کا آخری حصّہ اتنا گہرا نہیں ہوگا جتنا آجکل ہے۔ اس لئے مدّ و جزر یا ہواؤں کے رُخ سے اس حصّہ کا پانی ایک طرف ہٹ کر اس حصّہ کو پایاب بنا دیتا ہوگا۔ چنانچہ تورات میں ہے؛

اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک بنا دیا اور پانی دو حصّے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ سے خشک زمین پر چل نکلے۔

(خروج ۲۱ — ۱۴/۲۲)

ان تصریحات سے قرآنِ کریم کے ان اشارات کی طرف سمجھ کی راہ نکلتی ہے جو سورۂ طٰہٰ اور سورۂ دخان کے

مندرجہ صدر آیات میں ملتے ہیں اور انہی آیات کے مفہوم کی وضاحت کے لئے ہم نے یہ کچھ لکھا ہے۔ ان تصریحات کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ کا مطلب کیا ہے؟ سو عربی زبان میں عصا کے معنی لاٹھی ہی کے نہیں بلکہ جماعت کے بھی ہیں۔ عصا (لاٹھی) کو عصا اس لئے کہتے ہیں کہ اسے انگلیاں مجتمع کرکے مضبوطی سے پکڑا جاتا ہے اور ضَرَبَ کے معنی چلنا یا سفر کرنا بھی آتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی جماعت کو لے کر سمندر کی طرف جاؤ اور جس مقام کا تمہیں سراغ دیا جاتا ہے اس سے اس وقت جب سمندر اُتر چکا ہو، بنی اسرائیل کو لے کر خشکی کے دوسرے کنارے پہنچ جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب فرعون کا لشکر ان کے تعاقب میں اس کنارے پر پہنچا ہے تو وہ دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ تھے وہ "طَوْدِ الْعَظِيْمِ" جن کا ذکر (۲۶/۶۳) میں آیا ہے۔

ہم نے اوپر تورات کا بیان نقل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آندھی کے زور سے پانی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ لیکن یہودیوں کی طرف سے تورات کا جو ترجمہ (۱۹۶۲ء میں) شائع ہوا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ دورِ حاضرہ کی تحقیق کی رُو سے معلوم ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحیرۂ قلزم کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو اس مقام سے پار لے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا اور جہاں سرکنڈا اُگ رہا تھا۔ اسی نسبت سے اُسے 'SEA OF REEDS' کہتے تھے۔ یہ مقام موجودہ نہر سویز کے قریب واقع ہوا تھا۔ یہ اعلان، امریکہ کی جیوش پبلیکیشنز سوسائٹی کے ایگزیکٹو ڈائرکٹر مسٹر 'LISSER ZÜSSMAN' کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس تحقیق کی رُو سے قرآن کی بیان کردہ تفصیل اور بھی زیادہ قابلِ فہم ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں، جوں جوں تاریخی تحقیقات یقین کے درجے تک پہنچتی جائیں گی، قرآن کے بیانات حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتے جائیں گے۔

باب دوم

فرعون تباہ ہو گیا اور بنی اسرائیل اس کے پنجۂ استبداد و قہرمانیت کی آہنی گرفت سے رستگاری حاصل کرکے سینا کی وادیوں میں جا پہنچے۔ اب یہاں سے ان کی زندگی کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔

یہ پہلا مرحلہ لا کا مقام تھا، یعنی غلامی و محکومی کی شکست و ریخت۔ اب اِلّا کی منزل سامنے آئی، یعنی اپنی ملّی تنظیم و تعمیر اور استخلاف فی الارض کی عملی تشکیل۔ ہرچند اس کی ابتدا، بھی قیامِ مصر کے زمانہ میں ہی ہو چکی تھی، لیکن اس کے حقیقی نشوو ارتقا کا زمانہ اب آیا تھا۔ پہلا مرحلہ تو حضرت موسیٰؑ کی ضربِ کلیمی کے تصدق آسانی سے طے ہو گیا۔ لیکن اس دوسرے مرحلہ میں چونکہ عزم و استقلال، مسلسل جدّوجہد پیہم سعی و عمل، سپاہیانہ زندگی، سیرت کی پختگی اور ارادوں کی بلندی نہایت ضروری تھی، اس لئے یہ مرحلہ بنی اسرائیل کے لئے بڑا صبر آزما تھا۔ اس مرحلہ میں اس داستان کے ایسے ٹکڑے سامنے آتے ہیں جو ہر اس قوم کے لئے جو اپنی تشکیل جدید اور بازآفرینی کی تڑپ رکھتی ہو، عبرت و موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، صدیوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کے جوہرِ انسانیت قریب قریب مُردہ ہو چکے تھے۔ نہ ان کے سینہ میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیل تھی نہ ان کی نگاہوں میں بلند مقصد کی عالمتاب درخشندگی۔

غلامی کی لعنت

غلامی دنیا میں ہزار لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک نحوست ہوتی ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و نقائص، جنہیں جسدِ انسانیت کے لئے جذام کہنا چاہیئے، اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کُن جراثیم کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے۔ غلامی میں انسان، زندگی کے حقائق سے مقابلہ سے جی چراتا ہے اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح عافیت کوشی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس سے ذاتی سیرت کی خوبیاں اور اجتماعی کیریکٹر کے محاسن ایک ایک کر کے چھن جاتے ہیں۔ بقول علّامہ اقبالؒ۔

از غلامی دل بمیرد در بدن	از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی بزمِ ملّت فرد فرد	ایں و آں با ایں و آں اندر نبرد
آں یکے اندر سجود ایں در قیام	کاروبارش چوں صلوٰۃِ بے امام
کیشِ اُو تقلید و کارش آزری ست	ندرت اندر مذہبِ او کافری ست
تازہ کیہا و ہم دشک افزایدش	کہنۂ و فرسودہ خوش می آیدش
کاروانِ شوق بے ذوقِ رحیل	بے یقین و بے سبیل و بے دلیل
دین و دانش را غلام ارزاں دہد	تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

یہ تھی بنی اسرائیل کی وہ قوم جو مصر سے نکل کر سینا کی وادیوں میں پہنچی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے جو اسباب مہیا فرمائے، ذرا ان پر غور کیجئے۔ ایک چھوڑ، دو دو اولوالعزم پیغمبر راہنمائی کے لئے، (بلکہ ایک خیال کے مطابق تو حضرت شعیبؑ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے) فرعون کے دستِ تظلم سے نجات، اپنی آنکھوں کے سامنے اتنے بڑے دشمن کی ایسی تباہی و بربادی، سینا کے وسیع و عریض میدان رہنے کے لئے، کھلی فضا، صاف آب و ہوا، فراخ زمین، من و سلویٰ کھانے کو، سر پر بادلوں کا سایہ، پیچھے طور کی سنگین دیوار حفاظت کے لئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا چاہیئے؟ لیکن جو قوم آزادی و حریت کی لذت سے بے گانہ ہو چکی ہو اس کے لئے اس زندگی میں کیا جاذبیت ہو سکتی ہے؟ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جب ایک تیتر کو کچھ عرصہ تک، قفس کی تن آسانی کا خوگر بنا دیا جائے تو یہ زندگی اس کے لئے ایسی محبوب بن جاتی ہے کہ اس کا مالک اسے ہر روز صبح پنجرہ سے نکال کر باہر چھوڑ دیتا ہے۔ خالی پنجرہ ہاتھ میں لئے آگے آگے چلتا ہے اور یہ تیتر اِدھر اُدھر پھلانگنے دوڑنے اور اڑ جانے کے بجائے پنجرہ کے پیچھے لپکتا ہے۔ حالانکہ عین اس وقت، جنگل سے آزاد تیتروں کے نغماتِ حریت و آزادی، اسے پکار پکار کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ تیری زندگی کھلی فضاؤں میں اڑنے کی ہے۔ قفس کی زندگی لعنت ہے۔ لیکن اس کی فطرت کچھ ایسی مسخ ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ ان آوازوں پر کان نہیں دھرتا اور آزاد فضا کو چھوڑ کر قفس کی زندگی کو عین راحت سمجھتا ہے اور آزادی کی فضائے بسیط میں اڑنے والوں کی آواز کے جواب میں، ایک خفیف سی مسکراہٹ سے کہہ دیتا ہے کہ وہ تمہیں مبارک! یہاں تو ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے (غالب)

یہی حالت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ اور ایک بنی اسرائیل پر ہی کیا موقوف، ہر اس قوم کی ہو جاتی ہے جسے کچھ عرصہ تک غلامی کے قفس میں محبوس رکھا جائے۔ وہ اس زندگی کو عین مطابقِ فطرت سمجھ لیتی ہے اور آزادی کی جنت انہیں جہنم دکھائی دیتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ انہیں جس نکبت و زبوں حالی کی زندگی سے نکال کر لائے تھے اگر ان کا احساس زندہ اور شعور بیدار ہوتا، تو قدم قدم پر خدا کی بارگاہ میں سجدۂ تشکر و امتنان بجا لاتے۔ لیکن وہ اُسے اُلٹا مصیبت سمجھ رہے تھے اور ہر مقام پر یوں بگڑ کر بیٹھ جاتے

تھے گویا کہیں بے گار میں پکڑے جا رہے ہیں. جب حضرت موسےؑ، فرعون کی قہرمانیت سے دست و گریباں ہو رہے تھے تو اپنی قوم کی حالت یہ تھی کہ مُنہ بسور کر بیٹھ گئی کہ تم ہمیں عجیب مصیبت میں کھینچے لئے جا رہے ہو!

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ (۷/۱۲۹)

انہوں نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی مصیبتیں بھگت رہے ہیں.

جب حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے نکال کر لے چلے ہیں تو سمندر کے کنارے پہنچ کر انہوں نے پھر چلانا شروع کر دیا کہ ہمیں کس موت کی طرف دھکیل کر لے آئے ہو؟

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۚ (۲۶/۶۱)

جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم یقیناً قابو آ گئے!

تورات میں ہے؛

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا وہ شدت سے ڈرے. تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسےؑ سے کہا کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؟ کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا. (خروج ۱۰-۱۲/۱۴)

ہم غلام ہی اچھے تھے

غور کیجئے! غلام کی نفسیاتی کیفیت کیسی چھلک کر باہر آ رہی ہے کہ "مصریوں کی خدمت گذاری اس سے کہیں بہتر تھی". اس سے بڑی بدبختی اور کس کی ہو گی جو قفس کو آشیانہ سے بہتر سمجھے؟ پھر یہی نہیں کہ کہیں کسی ایک مقام پر گھبرا کر ایسا کہہ دیا ہو. وہ ہر مقام پر ایسا ہی کہتے تھے جس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں واقعی دلی افسوس تھا کہ مصر کی محکومیت کی زندگی سے کیوں نکل آئے؟ انہیں رہ رہ کر شہری زندگی کے نگاہ فریب "تہذیب و تمدن"

کے خواب آور لمحات یاد آتے تھے۔

پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمینِ مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرھویں دن سین کے بیابان میں جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس بیابان میں موسےٰ اور ہارون پر جھنجلائی اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش! ہم خداوند کے ہاتھ سے زمینِ مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے، مارے جاتے۔ کیونکہ تم ہم کو اس بیابان میں نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔ (خروج ۱۶/۳-۱)

اس پر مبدارِ فیض کی طرف سے منّ و سلویٰ کی نعمت ملی۔ (چند روز کے بعد وہ اس سے بھی بگڑ گئے) ایک میدان میں پہنچے، جہاں ذرا پانی کی قلت تھی، تو پھر وہی واویلا مچانا شروع کر دیا کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے؟

تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور رفیدیم میں ڈیرا ڈالا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا سو لوگ موسےٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پئیں۔ موسےٰ نے انہیں کہا تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو؟ اور خداوند کا کیوں امتحان کرتے ہو؟ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسیٰ پر جھنجلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور ہماری مواشی کو پیاس سے ہلاک کرے۔ (خروج ۱۷/۳-۱)

غرضیکہ وہ قدم قدم پر رُوٹھ جاتے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے ہو؟

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسےٰ پہاڑ سے اُترنے میں دیری کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اسے کہا کہ اُٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلے، کیونکہ یہ مرد موسےٰ جو ہمیں مصر سے نکال لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا؟ (خروج ۳۲/۱)

یہ کیا تھا؟ وہی غلامی کا جذام اور خودی کا ضعف جس سے ؎

تفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

وہی، محکومی کی تن آسانی اور سہل انگاری کی زندگی جو "دیدۂ شاہیں میں نگہ نخّاس" رکھ دیتی ہے۔

وہ زندگی جو جہنم میں شجرۃ الزقوم کو ثمرِ بہشت بنا کر دکھاتی ہے۔ غور فرمایئے! یہ مرحلہ، حضرت موسیٰؑ کے لئے کس قدر دشوار گزار اور صبر آزما تھا؟ قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کی اس داستانِ زندگی کے مختلف اوراق کو محفوظ کر دیا ہے تاکہ وہ ہر دیدۂ بینا کے لئے عبرت آموز ہو۔

انعامات سب سے بڑا انعام، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، فرعون کے دستِ تظلّم سے رستگاری تھا۔
وَ اِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (۲/۴۹)

اور (اپنی تاریخِ حیات کا) وہ وقت یاد کرو، جب ہم نے تمہیں خاندانِ فرعون (کی غلامی) سے جنہوں نے تمہیں نہایت سخت عذاب میں ڈال رکھا تھا، نجات دی تھی۔

سینا کے میدانوں میں بادل ان کے سر پر سایہ فگن رہتے تھے۔ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ (۲/۵۷) نیز (۷/۱۶۰) پیچھے حفاظت کے لئے حصارِ طور وَ رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (۲/۶۳) نیز (۲/۹۳، ۴/۱۵۴)۔ کھانے کے لئے منّ و سلویٰ جیسا سامانِ تسکین جو بلا مزد و معاوضہ ملے۔ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی (۲/۵۷ نیز ۸۰-۸۱/۲۰ و ۷/۱۶۰)۔ پانی کا یہ اہتمام کہ ایک چھوڑ، بارہ بارہ چشمے (کہ ہر ایک قبیلہ اپنے اپنے چشمہ سے سیراب ہو)۔

وَ اِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝ (۲/۶۰) نیز (۷/۱۶۰)

اور پھر (وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تھا اور ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی جماعت کو لے کر پہاڑ کی طرف جاؤ۔ (تم دیکھو گے کہ پانی تمہارے لئے موجود ہے۔ موسیٰؑ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ چٹان پر سے مٹی کرید کر ہٹائی تو اس سے ایک چھوڑ) بارہ چشمے[1] پھوٹ نکلے اور تمام لوگوں نے اپنے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی (اس وقت

---

[1] تورات میں ہے کہ یہ چشمے ایلیم کے مقام پر واقع تھے (خروج ۲۷/۱۵) لیکن دوسرے مقامات میں ان چشموں کے متعلق فیدیم اور قادِس کا بھی ذکر آیا ہے (خروج ۳-۷/۲) (گنتی ۱-۴/۲۰) سیل کے بیان کے مطابق یہ چشمے پندرہویں صدی عیسوی تک موجود تھے اور سٹینلے نے لکھا ہے کہ ان کا آج بھی سراغ ملتا ہے۔

تم سے کہا گیا تھا اس بے آب وگیاہ بیابان میں تمہارے لئے تمام ضرورتیں مہیا ہوگئی ہیں (بس
کھاؤ پیو، خدا کی بخشائش سے فائدہ اٹھاؤ اور ایسا نہ کرو کہ ملک میں فتنہ وفساد پھیلاؤ (یعنی
ضروریاتِ معیشت کے لئے لڑائی جھگڑا کرو یا ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرو)۔

خوئے غلامی کی پختگی

یہ تو تھیں دامانِ رحمت کی گہرافشانیاں. لیکن اس کے برعکس اس قوم کی حالت عجیب وغریب تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی حقیقت کشا
تعلیم اور بے پناہ عمل سے اس قوم کی، انسانوں اور حیوانوں کے سامنے جھکی ہوئی گردنوں کو اوپر اٹھا کر
شرفِ انسانیت سے ہمکنار کرایا تھا لیکن انہیں ذلت وپستی کچھ اس درجہ مرغوب تھی کہ وہ رہ رہ کر اپنی
اٹھی ہوئی پیشانیوں کو اپنے خود ساختہ معبودوں کے حضور جھکائے چلے جاتے تھے۔ سینا کی وادیوں سے
گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بُت کے سامنے سجدہ ریز ہیں. پرانی عادتیں جو ان کے مغز
استخواں تک میں پیوست ہو چکی تھیں، پھر سے بیدار ہوگئیں. حضرت موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ حضور!
ہمیں بھی ایک ایسا ہی بُت بنوا دیجئے!!!

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ٱلْبَحْرَ فَأَتَوْا۟ عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰٓ أَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوا۟ يَٰمُوسَى ٱجْعَل لَّنَآ إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ ءَالِهَةٌ ۚ (۷/۱۳۸)

اور جب بنی اسرائیل سمندر پار اُتر گئے تو وہاں ان کا گذر ایک گروہ پر ہوا جو اپنے بتوں پر
مجاور بنا بیٹھا تھا. بنی اسرائیل نے کہا کہ "اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایسا ہی ایک معبود
بنادے جیسا ان لوگوں کے لئے ہے۔

اس درخواست پر حضرت موسیٰؑ کے دل پر جو گذری ہوگی اس کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں. لیکن ایسی
قوم سے سوائے اس کے اور کیا کہا جاتا کہ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ۝ (۷/۱۳۸) " واقعہ یہ ہے
کہ تم بڑی جاہل قوم ہو." کم بختو! تمہیں ابھی تک یہ بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس
کی حقیقت کیا ہے؟

إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَٰطِلٌ مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ۝ (۷/۱۳۹)

یہ لوگ جس طریقہ پر چل رہے ہیں وہ تو تباہ ہونے والا طریقہ ہے اور انہوں نے جو عمل اختیار
کیا ہے وہ یکسر باطل ہے۔

اللہ تعالیٰ تمہیں اقوامِ عالم پر فضیلت عطا فرمانا چاہتا ہے اور تم ہو کہ انسان تو ایک طرف، پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکنے کی آرزو دل میں لئے بیٹھے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۷/۱۴۰)

(نیز) موسیٰ نے کہا "کیا تم چاہتے ہو کہ خُدا کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں، حالانکہ اس نے تمہیں دنیا کی قوموں پر فضیلت دی ہے۔

وہ خدا جس نے تمہیں فرعون جیسے مستبد و قہرمان فرماں روا کے سامنے جبیں سائی سے نجات دلائی، اُسے چھوڑ کر مٹی اور پتھروں کے سامنے زمین بوس ہونا چاہتے ہو؟ (۷/۱۴۱)۔ "تُف ہے تم پر اور تمہاری ذہنیت پر"! لیکن غلامی سے مسخ شدہ ذہنیت سے اس کے سوائے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی؟

بخود کے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے
ہزاراں سال منزل در مقامِ آزری کردہ

اور آگے بڑھیے۔ حضرت موسیٰؑ کچھ وقت کے لئے طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے اور حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لئے چھوڑ گئے۔ مصر سے نکلتے وقت کچھ غیر اسرائیلی بھی ساتھ ہو گئے تھے جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لا چکے تھے۔ ان میں سمیری قوم کا ایک آدمی بھی تھا۔ (اس مقام پر ہمیں اس قوم کی تاریخی تحقیق مقصود نہیں۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ یہ قوم عراق سے نکلی تھی اور مصر تک ان کے تعلقات تھے)، یہ شخص حضرت موسیٰؑ پر ایمان تو لے آیا، لیکن آپ کی اتباع میں صرف چند قدم ہی چل سکا۔ اسلئے کہ اسکے دل میں چور تھا۔

گؤسالۂ سامری

مصری گؤسالہ پرست تھے۔ ان کے دیوتا حورس کا چہرہ گائے جیسا ہوتا تھا۔ (یہ عقیدہ بھی وہیں سے پیدا ہوا کہ کرۂ ارض ایک بیل کی پشت پر قائم ہے)۔ سمیری بھی گائے کی پرستش کرتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی نے سامری کے قلب کی گہرائیوں میں کروٹیں لینے والے جذبات کو اُبھارا۔ اس نے بنی اسرائیل سے سونے چاندی کے زیورات لئے جو وہ مصر سے اپنے ساتھ لاتے تھے اور جواب، اس صحرائی تمدن کی زندگی میں ان کے لئے وبالِ سر اور بارِ گوش ہو رہے تھے۔ اس نے ان زیورات کو گلا کر ایک بچھڑا سا بنایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصری مندروں کی شعبدہ بازیوں سے واقف تھا۔ اس بچھڑے کے خالی پیٹ میں کوئی ایسی کل بٹھا دی کہ ہوا کے نفوذ و خروج سے اس سے آواز نکلتی تھی۔ بس اب کیا تھا؟ بنی اسرائیل جوق در جوق لپکے اور اس اعجوبہ کی پرستش شروع کر دی، یعنی خدا کے

وہ جلیل القدر پیغمبروں نے جس توہّم پرستی کو مدت العمر کی محنتِ شاقہ سے ان کے قلب و دماغ سے نکالا تھا، سامری کی ایک فسوں سازی اُسے پھر سے واپس لے آئی۔ یہ ہے غلامی و محکومی کی زندگی میں پرورش پانے والی قوم کے ایمان کی پختگی! اسچ ہے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی!

قرآنِ کریم نے دو مقامات پر اس حسرت انگیز واقعہ کی تفاصیل بیان فرمائی ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ طور پر تشریف لے گئے تو ندائے ربانی نے فرمایا،۔

وَ مَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ٥ (۲۰/۸۳)

اور (جب موسیٰ طور پر حاضر ہوا، تو ہم نے پوچھا) کہ اے موسیٰ! کس بات نے تجھے جلدی پر ابھارا اور تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا؟

عرض کیا۔

قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ٥ (۲۰/۸۴)

موسیٰ نے عرض کیا وہ میرے پیچھے میرے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔ میں اس لئے جلدی چلا آیا کہ تجھ سے مزید احکام حاصل کر کے ان کے مطابق عمل پیرا ہوں۔

ارشاد ہوا،

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ٥ (۲۰/۸۵)

فرمایا کہ (تو نے تو یہ اندازہ کیا لیکن ہوا یہ ہے کہ) تیری عدم موجودگی میں قوم ایک عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ سامری نے اسے گمراہ کر دیا ہے۔

اس کے بعد

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۜ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ ٥ (۲۰/۸۶)

پس موسیٰ خشمناک اور افسوس کرتا ہوا قوم کی طرف لوٹا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو!

(یہ تم نے کیا کیا؟) کیا تم سے تمہارے پروردگار نے ایک عظیم خوشگواری کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ پھر کیا ایسا ہوا ہے کہ بڑی مدت گذر گئی (اور تم اسے یاد نہ رکھ سکے؟) یا یہ بات ہے کہ تم نے چاہا، تمہارے پروردگار کا غضب تم پر آنازل ہو اور اس لئے تم نے مجھ سے ٹھہرائی ہوئی بات توڑ ڈالی؟"

قوم نے جواب دیا

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا (۲۰/۸۷)

انہوں نے کہا ہم نے اپنی خواہش سے عہد شکنی نہیں کی، بلکہ (ایک دوسرا ہی معاملہ پیش آیا مصری) قوم کی زیب و زینت کی چیزوں کا بوجھ ہم پر پڑا تھا۔ (یعنی بھاری بھاری زیوروں کا جو مصر میں پہنے جاتے تھے ہم اس بوجھ کے رکھنے کے خواہشمند نہ تھے) وہ ہم نے پھینک دیا" (بس ہمارا اتنا ہی قصور ہے)۔

پھر کیا ہوا؟

فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۙ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۙ فَنَسِيَ ؕ (۲۰/۸۸-۸۷)

چنانچہ اس طرح (جب سونا فراہم ہوگیا تو) سامری نے اُسے (آگ میں ڈالا) اور ان کے لئے ایک (سنہرا) بچھڑا (بنا کر) نکال لایا۔ محض ایک بے جان دھڑ، جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ یہ دیکھ کر بول اٹھے، یہ ہے ہمارا معبود اور موسیٰ کا بھی۔ مگر وہ سامری اس بات کو بھول گیا (کہ موسیٰ آکر کیا کہے گا)۔

" وہ سامری بھی بھول گیا اور قوم بھی" حالانکہ بات ایسی واضح تھی کہ ذرا بھی عقل و شعور سے کام لیتے تو اس بچھڑے کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی۔

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۧ (۲۰/۸۹)

(افسوس ان کی سمجھ پر) کیا انہیں یہ (موٹی سی) بات بھی دکھائی نہ دی کہ بچھڑا آواز تو نکالتا ہے

مگر) ان کی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ انہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان؟

اور پھر حضرت ہارونؑ نے انہیں متنبہ بھی کر دیا تھا۔

وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ﴿۲۰/۹۰﴾

اور ہارون نے انہیں اس سے پہلے (صاف صاف) جتا دیا تھا "بھائیو! یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ شخص تمہیں سخت تباہی میں ڈال رہا ہے۔ تمہارا پروردگار تو خدائے رحمان ہے۔ دیکھو میری پیروی کرو اور میرے کہے سے باہر نہ ہو۔

لیکن اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ﴿۲۰/۹۱﴾

مگر انہوں نے جواب دیا تھا کہ جب تک موسیٰ ہمارے پاس نہ آجائے ہم اس کی پرستش پر جمے ہی رہیں گے۔

حضرت موسےٰ نے اپنے بھائی سے کہا۔

قَالَ یٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَیْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ۙ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ ﴿۲۰/۹۲-۹۳﴾

موسیٰ نے ہارون سے کہا" اے ہارون! جب تو نے دیکھا، یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں، تو کیا بات ہوئی کہ انہیں روکا نہیں؟ کیا تو نے پسند کیا کہ مجھ سے سرکشی برتے؟

حضرت ہارونؑ نے جواب دیا۔

قَالَ یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَ لَا بِرَاْسِیْ ۚ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ﴿۲۰/۹۴﴾

ہارون بولا، اے میرے عزیز بھائی! تو مجھ پر اس طرح خفا نہ ہو اور نہ ہی مجھے یوں ہدف ملامت بنا۔ (میں نے اگر سختی میں کمی کی تو صرف اس خیال سے کہ) میں ڈرا۔ کہیں تم یہ نہ کہو، تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا کچھ پاس نہ کیا۔

ذرا اس جواب پر غور فرمائیے! قوم میں تشتت و افتراق اتنا بڑا جرم ہے کہ اس سے بچانے کی خاطر اس

عارضی شرک تک کو روا رکھ لیا گیا!! واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے گوسالہ پرستی بھی شرک ہے اور تفرقہ بھی شرک (۳۰ – ۳۱/۳۰)۔ لیکن ان کی گوسالہ پرستی، جہالت کا نتیجہ تھا جس کا ازالہ بآسانی ہو سکتا تھا لیکن قوم میں تفرقہ فساد کا موجب بن جاتا اور اس کمی کی وجہ سے جو نقصان ہوتا اس کی تلافی نہ ہو سکتی۔ اس لئے حضرت ہارونؑ نے بڑے نقصان کے مقابلہ میں، کم نقصان والے شرک کو گوارا کر لیا۔ لیکن ہمارے ہاں حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں مسلمانوں میں مستقل فرقے موجود ہیں اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان فرقوں کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جاتا ہے اور اسے جہادِ عظیم قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جزئیاتی اختلاف (مثلاً نماز میں ہاتھ زیرِ ناف باندھنے چاہئیں یا سینہ پر) کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ان کی بنا پر کفر کے فتاویٰ صادر کر دیئے جاتے ہیں۔

بہرحال، قصۂ سامری کی طرف لوٹئے۔ حضرت موسیٰؑ نے سامری سے پوچھا کہ تمہارا اِس حرکت سے کیا مقصد تھا؟

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ ○ (۲۰/۹۵)

تب موسیٰ نے (سامری سے کہا" سامری! یہ تیرا کیا حال ہوا؟

اُس نے کہا۔

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ○ (۲۰/۹۶)

اس نے کہا کہ جب میں اس طرف آیا ہوں تو میں نے وہ کچھ بھانپ لیا تھا جو تمہاری قوم کے حیطۂ تصور میں بھی نہ تھا۔ میں نے تمہارے پیغامِ رسالت کو پورے طور اختیار نہیں کیا تھا، اس سے محض تھوڑا سا حصہ لیا تھا۔ جب میں نے مناسب موقع دیکھا تو اس حصہ کو بھی الگ کر دیا۔ میری مفاد پرستیوں نے یہ بات مجھے خوش آئند بنا کر دکھائی۔

ارشاد ہوا۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ○ (۲۰/۹۷)

موسیٰ نے کہا،" اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا۔ تیری سزا ہے کہ تو اچھوت بن کر رہے۔

اس کے بعد (آخرت میں عذاب کا) ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں! اور دیکھ تیرے (گھڑے ہوئے) معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے جس کی پوجا پر جما بیٹھا تھا۔ ہم اسے جلا کر راکھ کردیں گے اور راکھ سمندر میں بہادیں گے۔

پھر حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ یاد رکھو۔

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ○ (۲۰/۹۸)

معبود تمہارا بس اللہ ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ وہی ہے جو ہر چیز پر اپنے علم سے چھایا ہوا ہے۔

قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں اس واقعہ کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً

(۱۴۸، ۱۵۲/۷)؛ (۵۴، ۹۲/۲)؛ (۱۵۳/۴)

واقعۂ سامری اور تورات

یہ واقعہ تورات میں بھی مذکور ہے۔ لیکن قرآنِ کریم اور تورات کی بیان کردہ تفاصیل میں وہی فرق ہے جو ایک خارجی اثرات سے منزہ آسمانی کتاب اور ذہنِ انسانی کی آمیزش میں ہوتا ہے۔ زیورات کے متعلق تورات میں ہے کہ خروجِ مصر سے پہلے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے ایما پر اہلِ مصر سے انہیں عاریتًا لیا اور اس طرح مصریوں کو لوٹ کر مصر سے چلتے بنے۔

اور بنی اسرائیل نے موسٰے کے کہنے کے موافق کیا اور انہوں نے مصریوں سے سونے چاندی کے زیورات اور کپڑے عاریتًا لئے۔ اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ انہوں نے جو کچھ مانگا انہیں دے دیا اور انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔ (خروج ۳۵ — ۱۲/۳۶)

پھر باب صفحہ ۳۲ میں مذکور ہے کہ یہ بچھڑا خود حضرت ہارونؑ نے بنایا تھا اور انہی نے اس کی پرستش کرائی تھی۔ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ)۔

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسٰے پہاڑی سے اُترنے میں دیری کرتا ہے تو وہ ہارون کے

پاس جمع ہوئے اور اسے کہا کہ اُٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلے۔ کیونکہ یہ مرد موسےٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا، ہم اسے نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے انہیں کہا کہ سونے کے زیور جو تمہاری جوروؤں اور تمہارے بیٹوں اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کے مجھ پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ سونے کے زیور جو اُن کے کانوں میں تھے توڑ توڑ کے ہارون کے پاس لائے اور اُس نے ان کے ہاتھوں سے لیا اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکے ہتھیار سے درست کی اور انہوں نے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا! اور جب ہارون نے یہ دیکھا تو اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور ہارون نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے اور وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گذرانیں اور لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے۔ (خروج ۱-۶/۳۲)

ایک اور فرمائش اور آگے بڑھیئے۔ جب منّ وسلویٰ کھانے کو ملا تو شہری زندگی کے چٹپٹے مسالوں کی یاد ستانے لگی۔ چند روز کے بعد مُنہ بسور کر بیٹھ گئے کہ ہم سے روز روز ایک ہی چیز نہیں کھائی جاتی۔ دسترخوان پر تنوّع ہونا چاہیئے۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ (۲/۶۱)

پھر تم نے موسیٰ سے کہا کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی طرح کے کھانے پر قناعت کرلیں۔ (یعنی صرف منّ وسلویٰ پر قناعت کرلیں۔ . . . . پس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے وہ چیزیں طلب کرو جو زمین کی پیداوار ہیں، سبزی، ترکاری، گیہوں، دال، پیاز، لہسن وغیرہ جو مصر میں ہم کھایا کرتے تھے) موسےٰ نے یہ سُن کر کہا (افسوس تمہاری جہالت پر!) کیا تم چاہتے ہو، ایک ادنیٰ سی بات کے لئے (یعنی غذا کی لذت کے

لیے) اُس (مقصدِ عظیم) سے دست بردار ہو جاؤ جس میں (بڑی ہی) خیر و برکت ہے؟ (یعنی اس جفاکشی کی زندگی کی تربیت چھوڑ دو جس کے نتیجہ میں تمہیں اس سرزمین کی فرمانروائی حاصل ہونے والی ہے۔ بہرحال، اگر تم یہی پسند کرتے ہو تو) چلو کسی بستی کی طرف چلے چلو۔ وہاں یہ تمام چیزیں مل جائیں گی جن کے لئے ترس رہے ہو۔

یعنی اس دشت و صحرا میں تمہیں اس لئے لایا گیا تھا کہ تم شہری تمدن کی تن آسانی کی زندگی کی جگہ سپاہیانہ زندگی کے خوگر بن جاؤ تاکہ وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے تمہیں تیار کیا جا رہا ہے، حاصل ہو سکے۔ لیکن اگر تم ذلت و نامرادی ہی چاہتے ہو تو جاؤ۔ پھر شہری تمدن کی زندگی اختیار کر لو۔ ان سے پہلی آیات میں ان سے کہا گیا تھا کہ "ہماری تجویز یہ تھی کہ تم فلسطین کی سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے رہو (۵/۲۱) اور اس طرح اپنے اختیار و ارادہ سے، جیسے اور جب جی چاہے، سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاؤ، فقط ایک شرط کے ساتھ کہ تم ہمارے قوانین کے سامنے اپنا سر جھکائے رکھو۔ اس طرح تمہاری صحرانوردی کی زندگی بھی ختم ہو جاتی اور تم سے جو غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں ان کے مضر اثرات سے تمہیں سامانِ حفاظت بھی مل جاتا اور اگر تم اس کے بعد بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے تو ان فتوحات کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھتا چلا جاتا۔ لیکن تم نے سپاہیانہ زندگی کے مقابلہ میں آرام طلبی اور تساہل انگیزی کی زندگی کو ترجیح دی (۲/۶۱) اور اس طرح ہمارے تجویز کردہ راستے کو چھوڑ کر الگ راہ اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق تم میں کمزوری آتی چلی گئی اور تم میں جرأت و بیباکی باقی نہ رہی۔ (۵/۲۴—۲۲)"۔

خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے

اور آگے بڑھئے! حضرت موسیٰؑ نے جب کہا کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دیئے ہیں، تو اڑ کر بیٹھ گئے کہ ہم جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، اس پر ایمان کیسے لے آئیں اور یہ کس طرح مان لیں کہ یہ احکام فی الواقع خدا کی طرف سے ہیں؟

لے اِهْبِطُوْا مِصْرًا کے معنی ہیں کہ "بستی کی طرف چلے جاؤ" نہ کہ ملکِ مصر کی طرف، جیسا کہ بعض مستشرقین نے غلطی سے اعتراض کیا ہے۔"

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (۲/۵۵)

اور پھر (وہ واقعہ یاد کرو) جب تم نے کہا تھا اے موسیٰ! ہم کبھی تمہاری بات ماننے والے نہیں جب تک کہ کھلے طور پر اللہ کو نہ دیکھ لیں۔

ذرا اس فرمائش پر غور کیجئے اور پھر اس قوم کی نفسیاتی کیفیت پر جو اس قسم کے سوال کرے۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ خدا کو اس دنیا میں دیکھ کون سکتا ہے؟ البتہ اس کے جلال کا تماشا دیکھنا ہو تو چلو اور اپنے خس و خاشاک کو اس برقِ تپاں کے سامنے لے جا کر اپنی آزمائش کر لو۔ لاکھوں کی جمعیت کو تو ساتھ کیا لے جانا تھا اُن میں سے ستر نمائندے چُن لئے اور انہیں ساتھ لے کر طور کی طرف تشریف لے گئے۔ طور کی چوٹی پر پہنچے تو یہ آتش فشاں پہاڑ زلزلے سے کانپ رہا تھا۔ آسمان پر بادل گھرا ہوا تھا، نیچے زلزلہ، اوپر بجلی کی کڑک، ایسی دہشت طاری ہوئی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، یعنی اپنے حوصلہ کا یہ عالم کہ زلزلہ، گرج چمک کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے اور طلب کی یہ کیفیت کہ خدا کو بے نقاب دیکھنے کے لئے مچل پڑے! (دیکھئے ۵۵-۲/۵۶؛ ۷/۱۵۵)۔

ایمان کا تقابل

آگے بڑھنے سے پیشتر ذرا پیچھے مڑ کر نگہ بازگشت ڈال لیے ان صفحات پر جن میں ساحرینِ دربارِ فرعون کا واقعہ درج ہے۔ بنی اسرائیل کے اندر دو اولوالعزم پیغمبر موجود ہیں جو ایک عرصہ سے انہیں ایمان باللہ کی حقیقت سے آگاہ کر رہے ہیں لیکن اس قوم کی حالت یہ ہے کہ کبھی حضرت موسیٰؑ سے بُت تراشی کی درخواست کرتے ہیں، کبھی گوسالہ پرستی پر پل پڑتے ہیں، کبھی اَڑ بیٹھتے ہیں کہ جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ محکوم قوم کے افراد کے ایمان و ایقان کی حالت ہے۔ دوسری طرف ایک آزاد قوم کے افراد ہیں کہ ایک عمر کفر میں بسر کی ہے کسی سے خاص طور پر توحید کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن جب ان کی نگاہ دیکھتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے تو ایک ثانیہ کے تأمّل کے بغیر ایمان کا اعلان کر دیتے ہیں اور پھر اس ایمان پر اس طرح جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ فرعون کی سخت سے سخت دھمکی اور بڑے سے بڑا خوف ان کے پائے استقامت میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ اس کی دھمکیوں کا جواب، استخفاف کی ہنسی سے دیتے ہیں اور موت کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے ہیں، لیکن اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہٹتے۔ یہ کیا ہے؟ وہی فرق جس کی طرف

ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ آزاد قوم کے افراد کے اندر (بالعموم) جرأت و بسالت ہوتی ہے۔ صرف اُس کا رُخ (channel) غلط ہوتا ہے ذرا رُخ صحیح کر دیجئے، ان کا کفر پختہ ایمان میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس کے برعکس محکوم قوم کا سینہ (بالعموم) خوف و تنگ نظری کا نشیمن ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا دعوئے ایمان حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔ وہ قدم قدم پر رُکتے اور ہر سانس پر ٹھہرتے ہیں۔ ذرا سی تکلیف ان کے ایمان میں تزلزل و تذبذب پیدا کر دیتی ہے۔ چھوٹی سی آزمایش ان کے سامنے بہانہ جوئیوں اور حیلہ سازیوں کے دفتر کھول دیتی ہے۔ یہ ہے فرق ایک آزاد اور محکوم کے ایمان میں۔ بقول علاّمہ اقبالؒ۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال　　　کس درجہ گراں سَیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت　　　محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر　　　محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونے دیجئے کہ محکومی سے آزادی کی طرف بڑھنے سے انسان میں بلندی پیدا ہوتی جاتی ہے اور قرآن کی رُو سے صحیح آزادی یہ ہے کہ انسان دنیا میں صرف قوانینِ خداوندی کا محکوم ہو۔ لہٰذا، صحیح شرفِ انسانیت بھی اسی آزادی میں جاکر نصیب ہوگا۔

.....بہانۂ بسیار ایک اور واقعہ سنئے۔ جب محکوم قوم کے قوائے عملیہ مضمحل اور اُن کے جوہرِ مردانگی مصلوب ہو جاتے ہیں تو ان کے پاس فقط باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ کسی قوم کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے وہ ؏

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

کی زندہ داستان نظر آئے گی۔ عملی دور میں دیکھئے تو کیفیت یہ ہوگی کہ اِدھر کوئی حکم ملا اور اُدھر اس پر عمل ہو گیا۔ نہ کوئی حجت نہ بہانہ، نہ بحث، نہ جدل۔ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

لیکن جب دورِ عمل ختم ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کے ہر شعبے میں "شاعری" شروع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ قوم، عمل کے بجائے اس قسم کے نظری مسائل میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے کہ ؎

ابنِ مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے　　　ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے　　یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم　　امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

مسلمانوں کے اس دورِ عمل پر نظر ڈالئے جب ان کی نگاہوں سے قوموں کی "تقدیریں" بدل جایا کرتی تھیں۔ آپ کو کہیں اس قسم کے نظری مباحث دکھائی نہیں دیں گے۔ لیکن اس دور کے بعد دیکھئے۔ ان کی تمام قوتیں انہی منطقی موشگافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آرائیوں میں صرف ہو رہی ہیں[1] اور الفاظ کے گورکھ دھندوں میں اس انداز سے اُلجھے ہیں کہ عمل کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھتا اور پھر اس "مقدس شاعری" کو اہمیت دی جاتی ہے کہ یہ عین خدمتِ دین اور جہاد فی سبیل اللہ بن کر دکھائی دیتی ہے۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مصریوں کی دیکھا دیکھی گائے کی عقیدت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ (۲/۹۳) اس باطل پرستی کے جذبہ کے استیصال کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ ان کے "معبود" کو خود ان کے ہاتھوں ذبح کرایا جائے تاکہ اس کی عظمت و تقدس کے باطل تصور کے گلے پر چھری پھر جائے۔ اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ ایک گائے کی قربانی کرو۔[2]

ذبحِ بقر

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ (۲/۶۷)

اور پھر (وہ معاملہ یاد کرو) جب موسٰے نے اپنی قوم سے یہ (سیدھی سادی) بات کہی تھی کہ خدا کا حکم ہے، ایک گائے ذبح کر دو (بجائے اس کے کہ سیدھی طرح اس پر عمل کرتے، لگے طرح طرح کی کٹ حجتیاں کرنے۔ پہلے) کہا (بھلا کیونکر ممکن ہے کہ خدا نے ایسی بات کا حکم دیا ہو؟)

---

[1] اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ ہم علمی تحقیقات کے مخالف ہیں۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جن بحثوں کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں ان میں اور صحیح علمی تحقیقات میں بین فرق ہے۔ اور پھر سب سے مقدم چیز تو صحیح عمل ہے۔ علمی تحقیقات بھی عمل کے لئے ممد و معاون ہونی چاہئیں۔ عمل سے ہٹ کر ان کی کوئی قیمت نہیں ـــــ جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا۔

[2] اس سے گائے اور سانڈ دونوں مراد لئے جا سکتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے، تم ہمارے ساتھ تمسخر کرتے ہو. موسیٰ نے کہا، نعوذ باللہ اگر میں (احکام الٰہی کی تبلیغ میں تمسخر کروں اور) جاہلوں کا شیوہ اختیار کروں.

کس قدر صاف حکم تھا. ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ گائے سے کیا مراد ہے اور ذبح کرنا کسے کہتے ہیں. لیکن انہوں نے اب بہانہ سازیاں شروع کر دیں اور موشگافیوں میں اُلجھنے لگے.

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ ۖ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ۝ (۲/۶۸)

انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے کہو کہ وہ ہمارے لئے اس کی وضاحت فرما دے. موسیٰ نے کہا کہ پروردگار کا ارشاد ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہو جو نہ بوڑھی ہو نہ بچہ، پوری جوانی تک پہنچی ہوئی ہو اور ہر طرح سے اعتدال پر. پس جو کچھ تم سے کہا گیا ہے اس کے مطابق عمل کرو.

لیکن وہ اتنے پر کس طرح آمادۂ عمل ہو جاتے.

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ۝ (۲/۶۹)

کہنے لگے، اپنے پروردگار سے درخواست کرو، وہ یہ بھی بتلا دے کہ گائے کا رنگ کیسا ہونا چاہیے؟ موسیٰ نے کہا کہ حکمِ الٰہی یہ ہے کہ اس کا رنگ زرد ہو، خوب گہرا زرد، ایسا کہ دیکھنے والوں کا جی دیکھ کر خوش ہو جائے.

اب ایک اور استفسار!

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا ۖ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۝ (۲/۷۰)

(جب رنگ کی خصوصیت بھی متعین ہو چکی تو انہوں نے ایک اور اُلجھاؤ پیدا کر دیا) کہنے لگے (ان ساری باتوں کے بعد بھی) ہمارے لئے (مطلوبہ جانور کی پہچان مشکل ہے) اپنے پروردگار سے کہو کہ (اور زیادہ وضاحت کے ساتھ) بتلا دے کہ جانور کیسا ہونا چاہیے. انشاء اللہ ہم ضرور پتہ لگا لیں گے.

دیکھئے کیسی سیدھی سی بات تھی جسے اس قدر الجھاؤ میں ڈالتے جا رہے ہیں۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِى الْحَرْثَۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَاؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّؕ (۲/۷۱)

اس پر موسےؑ نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے، ایسی گائے ہو جو نہ تو کبھی ہل میں جوتی گئی ہو، نہ کبھی آبپاشی کے لئے کام میں لائی گئی ہو، پوری طرح صحیح وسالم، داغ دھبہ سے پاک و صاف (جب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا، تو پھر مجبور ہو کر بولے۔ ہاں، اب تم نے ٹھیک ٹھیک بات بتلادی۔

اب چاروں طرف سے گھر گئے اور دماغ مزید سوالات سے جواب دے چکا تو مجبوراً گائے کو ذبح کیا ورنہ ان کی نیت ایسا کرنے کی نہ تھی۔ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ع (۲/۷۱)۔ قرآن کریم کی اس آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے کہ "وہ کرنا نہیں چاہتے تھے"۔ یہ تھی لِمّ ان تمام سوالات کی۔ یہ نہیں کہ حکم سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ سچ ہے۔ ؎

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

خوف و ہراس کے چھلاوے

اور آگے بڑھئے۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لانے سے مقصود یہ تھا کہ انہیں فلسطین کی سرزمین کا حاکم بنا دیا جائے جہاں وہ اللہ کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ صحرائے سینا تو فقط ستانے کا مقام (یا تربیت گاہ) تھا۔ منزل اس سے آگے تھی۔ حضرت موسےؑ نے ان سے کہا کہ فلسطین کی ارضِ مبارک اللہ تعالےٰ نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔ اٹھو اور جا کر اس پر قبضہ کر لو۔ غور کیجئے، اللہ کا ایک اولوالعزم پیغمبر یہ بشارت دے رہا ہے کہ وہ ملک تمہارے نام لکھا جا چکا ہے۔ بس اُٹھ کر قبضہ کر لینے کی دیر ہے (۵/۲۱)۔ لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعفِ خودی سے ان پر خوف طاری تھا۔ ایک مدت کی غلامی نے جرأت و جسارت اور ہمت و حوصلہ کے تمام جوہر سلب کر لئے تھے۔ فریق مقابل کے لوگ انہیں دیو نظر آتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّ فِیْھَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ق صلے وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَھَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْھَا ج فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْھَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ٥ (۵/۲۲)

انہوں نے (اس کے جواب میں) کہا" اے موسیٰ! اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بڑے ہی زبردست ہیں. جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں، ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے. ہاں اگر وہ لوگ وہاں سے خود ہی نکل گئے تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے.

ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ دشمن پہلے نکال دیجئے، ہم پھر آگے بڑھیں گے. اس پر اللہ کے ان دو بندوں (موسیٰؑ اور ہارونؑ) نے ان سے کہا.

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْھِمُ الْبَابَ ج فَاِذَا دَخَلْتُمُوْہُ فَاِنَّکُمْ غٰلِبُوْنَ ج وَ عَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ٥ (۵/۲۳)

انہیں ڈرنے والوں میں دو آدمی ایسے بھی تھے جنہیں اللہ نے (ایمان و یقین) کی نعمت عطا فرمائی تھی. انہوں نے ان سے کہا کہ (اس قدر بے طاقت اور بزدل کیوں ہو رہے ہو) ہمت کر کے ان لوگوں پر جا پڑو اور (شہر کے) دروازہ میں داخل ہو جاؤ. اگر تم (ایک مرتبہ) داخل ہو گئے تو پھر غلبہ تمہارے ہی لئے ہے اور اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو چاہیئے کہ اللہ پر بھروسہ کرو!

لیکن ان پر اس نصیحت کا کیا اثر ہوتا! کہنے لگے.

قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَھَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْھَا فَاذْھَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ ٥ (۵/۲۴)

وہ بولے" اے موسیٰ، جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں. (اور اگر تم وہاں جانے پر ایسے ہی تُل گئے ہو تو) تم اور تمہارا بڑا بھائی (ہارون) دونوں جاؤ. ہم یہاں بیٹھے رہیں گے. (تم دونوں وہاں لڑتے رہنا).

ہمتوں کی پستی

لیجئے! جواب مل گیا کہ اگر ہماری بہبود کی اتنی تڑپ ہے تو جا لیجئے، ان لوگوں سے لڑیئے اور جب آپ دشمنوں کو مغلوب کریں تو ہمیں آواز دیدینا

ہم فوراً آجائیں گے۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں، کہیں بھاگ نہیں جاتے!!

اللہ اکبر! کیا ذہنیت ہے؟ حضرت موسیٰؑ نے بدرگاہِ ربّ العزت عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (۵/۲۵)

(یہ حالت دیکھ کر) موسیٰ نے کہا کہ خدایا! میں اپنے آپ کے سوا اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا۔ پس تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں (اپنے حکم سے) فیصلہ کردے!

اس بارگاہ سے، جہاں قوموں کے اعمال کا ذرہ ذرہ میزانِ مکافات میں رکھ کر نتائج مرتب ہوتے ہیں، جواب ملا کہ بے شک یہ سرزمین اس قوم کے مقدر میں لکھی جاچکی ہے لیکن یہ مخاطب جماعت اس کی اہل نہیں۔ ان پر یہ ارضِ مقدس چالیس سال تک حرام کردی گئی ہے۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ (جب ان لوگوں کی حالت یہ ہے، تو) اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کردی گئی (یعنی چالیس برس تک اس سے محروم کردیئے گئے) یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔ سو (اے موسیٰ!) تم نافرمان لوگوں کی حالت پر غمگین نہ ہو (وہ اپنی بدعملیوں سے اسی محرومی کے مستحق ہیں)۔

تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر آئے گی۔

ستانے والی قوم

آپ نے دیکھا کہ یہ قوم، حضرت موسیٰؑ کو کس طرح ستاتی تھی۔ ان کی یہی روش تھی جس سے دل برداشتہ ہوکر حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا،

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (۶۱/۵)

اور جب موسےٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم مجھے (اس طرح) ستاتے کیوں ہو؟ حالانکہ تم اچھی طرح) جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ (لیکن وہ اس پر بھی نہ سمجھے) سو جب وہ (یوں) ٹیڑھے چلے، تو اللہ (کے قانونِ مکافات) نے (ان کی اس روش کے نتیجہ میں) ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے اور اللہ فاسقین کی قوم کو (سعادت کی) راہ نہیں دکھایا کرتا۔

بنی اسرائیل کی ان تاسف انگیز اور عبرت خیز حرکات کو سامنے لاکر، مسلمانوں سے کہا گیا کہ یاد رکھو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۝ (۳۳/۶۹)

اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسےٰ کو (اس طرح) ایذا دی تھی۔ سو اللہ نے اسے ان تمام باتوں سے جو وہ اس کے خلاف کہتے تھے، الگ رکھا اور وہ اللہ کے نزدیک بڑے مرتبہ والا تھا۔

دوسری جگہ ہے۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ (۲/۱۰۸)

پھر کیا تم چاہتے ہو، اپنے رسول سے بھی ویسے ہی سوالات کرو، جیسے سوالات اب سے پہلے موسےٰ سے کئے جا چکے ہیں۔ (یاد رکھو) جو کوئی بھی ایمان کی نعمت پاکر، پھر اسے کفر سے بدل دے گا تو وہ یقیناً سیدھے راستہ سے بھٹک گیا اور فلاح و کامیابی کی راہ اس پر گم ہو گئی۔

توراتُ کا افسانہ اس قوم نے حضرت موسےٰؑ کو کس کس انداز سے ستایا تھا اور وہ کس کس قسم کے بیہودہ سوالات کیا کرتی تھی، اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔ لیکن محرّف تورات میں ذہنِ انسانی نے اس کے لئے بھی ایک عجیب افسانہ تراشا ہے۔ گنتی باب ۱۲ میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بھائی (حضرت ہارونؑ) اور ان کی بہن (مریم) نے ایک کوشی عورت کے سلسلہ میں حضرت موسےٰؑ سے شکوہ کیا تھا۔

اور مریم اور ہارون نے موسیٰ کا شکوہ اس کوشی عورت کی بابت کہ اس نے بیاہ لی تھی کیا. کیونکہ اس نے ایک کوشی عورت لی تھی. اور بولے کیا خداوند نے فقط موسیٰ ہی سے باتیں کیں ہیں؟ کیا اس نے ہم سے بھی باتیں نہیں کیں. چنانچہ خداوند نے یہ سنا. (گنتی ۱-۲/۱۲)

حالانکہ، جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے، خود تورات میں متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ قومِ موسےؑ قدم قدم پر شکایت کرتی تھی کہ انہیں مصر سے کیوں باہر نکال لائے. خود اسی کتاب (گنتی) میں اس بات کا ذکر موجود ہے.

تب ساری جماعت چلاّ کے روئی اور لوگ اس رات بھر رویا کئے. پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون پر کڑکڑائے اور ساری جماعت نے انہیں کہا اے کاش کہ ہم مصر میں مر جاتے!

یا کاش کہ ہم اسی بیابان میں فنا ہوتے. (گنتی ۱-۲/۱۴)

اس سے آگے ہے.

بعد اس کے بنی اسرائیل کی ساری جماعت پہلے مہینہ میں دشتِ صین کو آئی اور قادس میں رہنے لگی. مریم وہاں مری اور وہیں گاڑی گئی. وہاں جماعت کے لئے پانی نہ تھا. سو وہ جمع ہو کے موسیٰ اور ہارون کے خلاف ہوئے اور ان لوگوں نے موسیٰ سے جھگڑا کیا اور کہا اے کاش کہ جب ہمارے بھائی خداوند کے آگے مر گئے ہم بھی مر جاتے. تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لائے کہ ہم اور ہمارے جانور یہاں مر جائیں؟ اور تم ہمیں مصر سے اس بُرے مقام پر پہنچانے کے واسطے کیوں نکال لائے؟ یہاں تو بونے کی جگہ نہیں اور نہ انجیروں کی اور نہ انگوروں کی اور نہ اناروں کی ہے. یہاں تو پینے کو پانی بھی نہیں.

(گنتی ۱-۵/۲۰)

اور تیسرے مقام پر.

اور لوگوں نے خدا اور موسےٰ سے بگڑ کے یوں کہا کہ تم ہم کو مصر سے نکال لائے کہ ہم بیابان میں مریں؟ یہاں تو نہ روٹی ہے نہ پانی. ہمارے جی کو اس ہلکی روٹی سے کراہیت آتی ہے.

(گنتی ۵/۲۱)

لیکن ذہنِ انسانی کو جو لذّت افسانوں میں ملتی وہ حقیقت میں کہاں؟ اسی لئے تورات میں اس کھُلی

ہوئی حقیقت کو چھوڑ کر افسانہ طرازی کی طرف رُخ کر لیا گیا. لیکن افسوس ہے کہ خود ہمارا لٹریچر بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا. قرآنِ کریم نے جس شرح وبسط سے ان واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جو حضرت موسیٰؑ کے لئے وجہِ اذیت ہوئے تھے اور جن سے تنگ آکر آپ نے بحضورِ ربّ العزت یہاں تک عرض کر دیا تھا کہ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِيْنَ ٥ (۵/۲۵)۔ ان کی روشنی میں کسی مزید اضافہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی. لیکن بخاری شریف میں آیت (۳۳/۶۹) (جو اوپر گذر چکی ہے) کی تفسیر میں حسبِ ذیل روایت مذکور ہے۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان موسٰى كان رجلا حييا ستيرا لا يرى من جلده شيئ استحياء منه فاذاه من اذاه من بنى اسرائيل فقالوا ما يستتر هذا التستر الا من عيب. بجلده اما برص واما أدرة واما آفة وان الله اراد ان يبرئه مما قالوا لموسٰى فخلا يومًا وحده فوضع ثيابه على الحجر ثم اغتسل فلما فرغ اقبل الى ثيابه ليأخذها وان الحجر عدا بثوبه فاخذ موسٰى عصاه وطلب الحجر فجعل يقول ثوبي حجر ثوبي حجر حتى انتهى الى ملأ من بنی اسرائيل فرأوه عريانا احسن ما خلق الله وأبرأه مما يقولون وقام الحجر فاخذ ثوبه فلبسه وطفق بالحجر ضربا بعصاه فوالله ان بالحجر لندبا من أثر ضربه ثلاثا او اربعا او خمسا فذلك قوله يا ايها الذين امنوا لا تكونوا كالذين اذوا موسٰى فبرأه الله مما قالوا وكان عند الله وجيها.

(بخاری شریف جلد دوم، صـ ۱۵۳)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ موسٰےؑ نہایت باحیا اور ستر کو چھپانے والے تھے چونکہ ان کے مزاج میں شرم تھی اس لئے کوئی ان کے حصّۂ بدن کو نہ دیکھ سکتا تھا لیکن بعض موذی بنی اسرائیل نے ان کو ایذا پہنچائی اور کہنے لگے یہ اس قدر پردہ صرف اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے، برص ہے یا باد خایہ ہے یا کوئی اور مرض ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ موسٰیؑ کو بنی اسرائیل کی افترابندی سے بری کر دے چنانچہ

ایک روز حضرت موسیٰ تنہائی میں غسل کرنے کھڑے ہوئے، کپڑے اتار کر پتھر پر رکھے اور خود غسل کرنے لگے۔ غسل سے فارغ ہو کر جب کپڑے لینے کے لئے بڑھے تو پتھر کپڑے لے کر بھاگا۔ موسےٰ لاٹھی لے کر (برہنہ) پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے، او پتھر میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت تک پہنچ گئے۔ لوگوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور معائنہ کر لیا کہ بہت عمدہ ساخت کے آدمی ہیں۔ خدائے تعالےٰ نے (اس ذریعے سے) بنی اسرائیل کی افترا بندی سے ان کو بری کر دیا۔ بالآخر پتھر بھی رُک گیا۔ موسےٰ نے اپنے کپڑے لے لئے اور پھر لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے۔ حضورؐ فرماتے ہیں، خدا کی قسم موسیٰ کے مارنے کی وجہ سے پتھر پر تین یا چار یا پانچ نشان پڑ گئے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا، خدائے تعالےٰ کے مذکورہ ذیل قول کا یہی مطلب ہے.......

یٰایھا الذین امنوا...... (۳۳/۶۹)

قرآنِ کریم کی تصریحات کے بعد جو پہلے گزر چکی ہیں اور جن میں یہ آیت بھی آچکی ہے، پیشِ نظر روایت کسی تبصرہ کی محتاج نہیں رہتی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت وضعی ہے۔

اب پھر اصل واقعہ کی طرف چلئے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی قوم کا علاج کیا؟ یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے نکال لائے تھے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق، فلسطین کی ارضِ مقدس اس قوم کے نام لکھی جا چکی تھی، لیکن وہ مل تو اس جماعت کو سکتی تھی جو اس کے لینے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لے اور اپنے اعمال سے اس مستحق قرار پائے۔ جب بنی اسرائیل کی زیرِ نظر جماعت کے اعمال کی کیفیت وہ ہو جو اوپر بیان کی جا چکی ہے، تو بیٹھے بٹھائے ارضِ مقدس کی حکومت کس طرح مل جائے؟ وراثتِ ارضی کی شرط تو صلاحیت ہے۔ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱/۱۰۵) اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے قلوب و جوارح کے اعمال سے۔

نئی نسل کی تربیت

اس قوم کو ہر قسم کے مواقع بہم پہنچا کر دیکھ لیا۔ ان میں (اُس وقت) زندگی کے کوئی آثار پیدا نہ ہو سکے۔ اس کے بعد اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ قوم کے ان بڑے بوڑھوں کو ختم ہو لینے دیا جائے اور نوجوانانِ ملت کے قلب و دماغ کی تعمیر نئی بنیادوں پر کی جائے۔ جب وہ آگے چل کر قوم بنیں تو پھر اللہ کے یہ وعدے پورے ہوں۔ اسی لئے حکم ہوا۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ۞ (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ جب ان لوگوں کی محرومیوں کا یہ حال ہے، (تو) اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کردی گئی۔ (یعنی چالیس برس تک اس سے محروم کردیئے گئے) یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔ سو (اے موسیٰ!) تم ان نافرمان لوگوں کی حالت پر غمگین نہ ہو (وہ اپنی بدعملیوں سے اسی محرومی کے مستحق ہیں!)

چنانچہ حضرت موسیٰؑ آب و گل کے ان پیکروں کو، چالیس برس تک، جنگلوں اور صحراؤں میں لئے لئے پھرے تاکہ اس افیون خوردہ جماعت کا کوئی فرد باقی نہ رہے اور جب ان کی نئی نسل، جن کی تربیت مصر کے تمدن اور وہاں کی محکومی کی فضا سے الگ رکھ کر کی گئی تھی، بڑھ کر جوان ہو تو اس زمین کا قبضہ وہ حاصل کرلیں۔ قوموں کی بازآفرینی کا طریق یہی ہے کہ ان کے فرسودہ خیال، رجعت پسند عنصر کو الگ کرکے، نئی نسل کے افراد کی تربیت جدید ماحول میں، نئے خطوط پر کی جائے تاکہ وہ تازہ ولولے اور زندہ عزائم لے کر ابھریں اور ہر مخالف قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہادیں۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے دعا مانگی تھی کہ

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن | دارم از روزے کہ می آید سخن
برجواناں سہل کن حرفِ مرا | بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

سلسلۂ رُشد و ھدایت

صحرائے سینا میں حضرت موسیٰؑ نوجوانانِ قوم کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہیں، تجلّی گاہِ طور پر ندائے جمال ان کی رُشد و ہدایت کے سامان فراہم کرتی ہے۔ جب آپ ادھر تشریف لے جاتے ہیں تو حضرت ہارونؑ قوم کی نگرانی کا فریضہ سنبھال لیتے ہیں (۷/۱۴۲)۔ وہاں پہنچتے ہیں تو ذوقِ دیدار سے بےتاب ہوکر جلوہ بےنقاب کی درخواست کرتے ہیں۔

وَ لَمَّا جَآءَ مُوۡسٰى لِمِيۡقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِىۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ ؕ...... فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَ

اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (۷/۱۴۳)

اور جب موسےٰ آیا' تاکہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا' تو (جوشِ طلب میں بے اختیار ہو کر) پکار اُٹھا "پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نگاہ کرسکوں." حکم ہوا " تو مجھے نہ دیکھ سکے گا' مگر ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ. اگر یہ اپنی جگہ ٹکا رہا' تو (سمجھ لیجیو' تجھے بھی میرے نظارہ کی تاب ہے' اور تو) مجھے دیکھ سکے گا." پھر جب اس کے پروردگار (کی قدرت) نے نمود کی' تو پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیا اور موسےٰ غش کھا کر گر پڑا. جب موسےٰ ہوش میں آیا' تو بولا " خدایا! تیرے لئے ہر طرح کی تقدیس ہو! میں اپنی جسارت سے تیرے حضور توبہ کرتا ہوں. میں ان میں پہلا شخص ہوں گا جو (اس حقیقت پر) یقین رکھتے ہیں.

بارگاہِ ایزدی سے نوازشاتِ پیہم کی بارشیں ہوتی ہیں.

قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ زصلے فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ○ (۷/۱۴۴)

خدا نے کہا" اے موسیٰ! میں نے تجھے اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی. پس جو چیز تجھے عطا فرمائی ہے (یعنی احکامِ شریعت)' اسے لے اور شکر بجالا.

اس طرح حضرت موسیٰؑ کو خدا کے احکام ملتے چلے گئے اور وہ انہیں' اس زمانے کے طریق کے مطابق' تختیوں پر منقوش کراتے گئے. (۷/۱۴۷ ــ ۱۴۵) ؛ (۵۱ ــ ۱۹/۵۳).

تربیت گاہِ سینا

اِدھر سے رشد و ہدایت ملتی اور اُدھر اس کے مطابق نونہالانِ قوم کی تربیت کی جاتی. کبھی انہیں ان انعاماتِ خداوندی کی یاد دلائی جاتی جو ان پر فراواں ہوئے تھے. قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں' اس تربیت کا ذکر آیا ہے. (ملاحظہ ہو ۱۴/۶ ؛ ۵/۲۰ ؛ ۷ ــ ۱۴/۸).

تورات میں ہے کہ انہی میدانوں میں حضرت شعیبؑ بھی حضرت موسےٰؑ سے آملے اور انہیں تنظیم کے طور طریق سکھائے.

اور دوسرے دن صبح کو یوں ہوا کہ موسےٰ لوگوں کی عدالت کرنے بیٹھا اور لوگ موسےٰ کے آگے صبح سے شام تک کھڑے تھے۔ تب موسےٰ کے سسرے نے سب کچھ جو اس نے لوگوں سے کیا دیکھ کے کہا یہ تُو لوگوں سے کیا کرتا ہے؟ تُو کیوں آپ اکیلا بیٹھتا ہے اور سب لوگ صبح سے شام تک تیرے آگے کھڑے رہتے ہیں؟ موسےٰ نے اپنے سسرے کو کہا یہ اسی واسطے ہے کہ لوگ خدا سے دریافت کرنے کے لئے مجھ پاس آتے ہیں۔ جب ان میں کچھ جھگڑا ہوتا ہے تو وہ میرے پاس آتے ہیں اور میں ایک دوسرے کے درمیان انصاف کر دیتا ہوں اور میں انہیں خدا کے احکام اور شریعت سے اطلاع کرتا ہوں۔ تب موسیٰ کے سسرے نے اس کو کہا کہ تو اچھا کام نہیں کرتا تو یقیناً ماندہ ہو جائے گا تُو بھی اور یہ گروہ بھی جو تیرے ساتھ ہے۔ کیونکہ یہ کام تجھ پر نپٹ بھاری ہے۔ تُو اکیلا اس کو کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اب میرا کہا مان۔ میں تجھے صلاح دیتا ہوں اور خدا تیرے ساتھ رہے۔ تو ان لوگوں کے پاس خدا کی جگہ ہو اور ان کا سب احوال خدا سے عرض کیا کر۔ اور تُو رسوم اور شریعت کی باتیں انہیں سکھلا۔ اور وہ راہ جس پر چلنا اور وہ کام جسے کرنا انہیں فرض ہے انہیں بتا سو تو ان لوگوں میں اعتباری لوگ چُن لے جو خدا ترس اور سچے انسان ہوں، لالچی نہ ہوں اور انہیں ہزاروں اور سینکڑوں اور پچاس اور دس دس پر حاکم کر دے کہ وہ لوگوں کی ہر وقت عدالت کریں۔ اور یوں ہو کہ وہ ہر ایک بڑا مقدمہ تجھ پاس لائیں۔ پر ہر ایک چھوٹا مقدمہ وہ فیصل کریں کہ یہ تیرے لئے کچھ آسان ہوگا اور وہ بوجھ اٹھانے میں تیرے شریک ہوں گے۔ اگر تُو یہ کام کرے گا اور خدا تجھے یوں حکم کرے تو تُو کام پر قائم رہ سکے گا اور یہ لوگ بھی اپنی اپنی جگہ سلامت جائیں گے۔ چنانچہ موسےٰ نے اپنے سسرے کا کہا سُنا اور سب جو اس نے کہا تھا کیا اور موسےٰ نے سب اسرائیلیوں میں سے اعتباری لوگ چنے اور انہیں لوگوں کا سردار ہزاروں کا سردار سینکڑوں کا سردار پچاس پچاس کا سردار اور دس دس کا سردار کیا۔ وہ لوگوں کا ہر وقت انصاف کرتے تھے۔ مشکل مقدمے موسےٰ پاس لاتے تھے پر چھوٹے مقدمے آپ ہی فیصل کرتے تھے۔

(خروج ۱۳ــــ ۲۶/۱۸)

یہ تھا وہ ماحول جس نے ان نوجوانوں میں عقابی نگاہ پیدا کرنی تھی۔

بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و کرّاری

طریق شاہبازی

قوم کے نوجوان اس آسمانی ماحول میں تربیت حاصل کرکے پروان چڑھتے گئے۔ شاہیں بچوں کی عقابی روحیں بیدار ہوئیں۔ سابقہ نسل کی برف کی سلیں موت کی حرارت سے پگھل پگھل کر آسودہ خاک ہوگئیں۔ اب اس تدبیرِ ربّانی کی پختگی کی منازل قریب آنی شروع ہوئیں جس کے متعلق شروع میں کہا گیا تھا کہ

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَ نُرِىَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝

(۲۸/۶-۵)

اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں ملک میں کمزور بنا دیا گیا تھا اور انہیں (خاک کی اس پستی سے اٹھا کر قوموں کا) امام بنائیں اور انہیں (مصر کی متعلقہ زمینوں کا) وارث بنائیں اور انہیں متمکّن فی الارض کریں اور فرعون اور ہامان اور ان کے جنود (و عساکر) کو وہ کچھ دکھائیں جس سے وہ ڈرا کرتے تھے۔

اب نوجوانوں کا یہ سیلاب اُمڈا اور فلسطین کے میدانوں پر چھا گیا۔ یہ تمام علاقے، حکومت فرعون کے باجگذار تھے۔ اس لیئے وہ قوم جسے اہلِ مصر نے صدیوں تک اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑے رکھا تھا اب ان کے خزائن و دفائن اور ملک و سلطنت کی وارث بن گئی۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۙ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ (۲۶/۵۹-۵۷)

سو ہم نے (اہلِ فرعون کو) ان کے باغوں اور چشموں اور خزائن اور باعزت مکانوں سے نکال دیا اور اس طرح ان سب کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔

جس سرزمین کے متعلق چالیس سال پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ تمہارے نام لکھ دی گئی ہے اس کا "انتقال"

اب ہوا۔ اس لئے کہ یہ فیصلہ مشروط تھا قوم کی مجاہدانہ سعی و عمل اور جاں فروشانہ استقامت کے ساتھ۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝ (۷/۱۳۷)

اور جس قوم کو حقیر و کمزور خیال کرتے تھے، اسی کو ملک کے تمام مشرق کا اور اس کے مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے، وارث کر دیا اور اس طرح اے پیغمبر! تیرے پروردگار کا فرمانِ پسندیدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ (ہمت و ثبات کے ساتھ) جمے رہے تھے اور فرعون اور اس کا گروہ (اپنی طاقت و شوکت کے لئے) جو کچھ بناتا رہا تھا اور جو کچھ (عمارتوں کی) بلندیاں اٹھائی تھیں، وہ سب درہم برہم کر دیں!

جو افرادِ قوم اس وقت مخاطب تھے جب یہ وعدہ کیا گیا تھا، نہ ان کے ایمان میں پختگی تھی نہ عمل میں استقامت اس لئے وہ اِس ارضِ مقدس کے وارث کیسے بن سکتے تھے؟ وراثتِ ارض کے لئے ایمانِ محکم اور عملِ پیہم کی ضرورت تھی۔

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۫ وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝ (۳۲/۲۴)

اور (بنی اسرائیل میں) سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی راہنمائی کرتے تھے (اور) یہ اس لئے تھا کہ انہوں نے استقامت دکھائی اور وہ ہماری آیات پر یقین (محکم) رکھتے تھے۔

دورِ عروج و سیادت

اب بنی اسرائیل کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اب ہر نیا دن عروج و بلندی کا آفتابِ تازہ ساتھ لیکر نمودار ہوتا تھا۔ جدھر ان کا قدم اٹھتا، فتح و ظفر قدم چومتی، شوکت و سطوت، قوت و حشمت، اقوامِ عالم پر فضیلت اور پھر کتاب و نبوت غرضیکہ دین و دنیا کی کونسی نعمت تھی جو ان پر سایہ فگن نہ تھی۔ یہ تھی جماعتِ مومنین کی صحیح زندگی۔

وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ

مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ (۱۰/۹۳)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اپنے وعدہ کے مطابق فلسطین میں) بسنے کا بہت اچھا ٹھکانہ دیا تھا اور پاکیزہ چیزوں سے ان کی روزی کا سامان کر دیا تھا۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ .... (۱۷/۱۰۴)

اور ہم نے اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل سے کہا تھا "اب اس سرزمین میں (فارغ البال ہوکر) بسو (تمہارے لئے کوئی کھٹکا نہیں رہا)۔

حکومت بھی اور نبوت بھی۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۚ (۴۵/۱۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب و حکم و نبوت عطا کئے اور انہیں طیبٰت سے رزق دیا اور انہیں اقوامِ عالم پر فضیلت عنایت فرمائی۔

علم بھی اور فضیلت بھی۔

وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۚ (۴۴/۳۲)

اور ہم نے انہیں علم (و بصیرت) کی بنا پر اقوامِ عالم پر برگزیدہ کیا۔

مومن کا صحیح مقام، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ

مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او برنتابد ہمسرے

مقامِ برتری

اس لئے انہیں ان کی ہم عصر جماعتوں پر افضلیت عطا کی۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۞ (۲/۴۷ نیز ۲/۱۲۲)

اے بنی اسرائیل میری نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے تمہیں سرفراز کیا تھا اور (خصوصاً یہ نعمت) کہ دنیا کی قوموں پر تمہیں فضیلت دی تھی۔

بابِ چہارم

تورات

بنی اسرائیل کی داستان تو ختم ہوگئی لیکن ابھی اس پیغامِ ربانی کی داستان باقی ہے جس کے اتباع سے اس قوم کو غلامی اور محکومی کے عذاب سے نجات ملی اور وہ شوکت و ثروت کی بلندیوں پر سرفراز ہوئی اور پھر جسے چھوڑ دینے سے نکبت و ادبار کے عمیق جہنم میں ایسی گری کہ وہاں سے ابھرنا نصیب نہ ہوا۔

اصل موضوع تک آنے سے پیشتر چند الفاظ تمہیداً ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ جس حقیقت کی طرف اب اشارہ ہوگا اسے ہم (ابلیس و آدم میں) رسالت کے عنوان میں مختصراً لکھ چکے ہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ شاید وہ مضمون اس وقت آپ کے ذہن میں مستحضر نہ ہو، اس کا اعادہ ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ بات نکھر کر سامنے آجائے۔

وحدتِ ادیان کی حقیقت

مختلف مذاہبِ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ ان کی باہمی آویزش و کشمکش سے یوں معلوم ہوگا جیسے ایک منڈی میں مختلف دوکاندار بیٹھے ہیں ان میں سے ہر ایک، گاہکوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے اپنے مال کی خوبیاں اور دوسرے کی برائیاں بیان کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ اصل "سکہ بند" مال صرف اسی کے ہاں سے ملیگا۔ دوسروں کے ہاں خالص مال نہیں ہے لیکن اس باہمی رقابت اور چشمک میں اسلام نے بالکل نئی تعلیم پیش کی ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ مختلف اقوامِ عالم کی طرف مختلف زمانوں میں، اللہ کا پیغام آتا رہا۔ ہوتا یہ تھا کہ خدا کا ایک رسول آتا وہ اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تک لوگ اس پیغام کی حفاظت و اتباع کرتے۔ پھر وہ پیغام یا تو حوادثِ ارضی و سماوی سے ضائع ہو جاتا یا ذہنِ انسانی اس میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتا اور یوں خدا کا پیغام اپنی اصلی اور منزہ شکل میں باقی نہ رہتا۔ اس کے بعد دوسرا رسول آجاتا جو پہلے پیغام کو (جس شکل میں وہ موجود ہوتا) حشو و زوائد سے پاک کر کے، اس کے اصلی رنگ میں پیش کرتا۔ اس طرح وہ سابقہ پیغام اصولی طور پر پھر سے اپنی اصلی شکل پر آجاتا اور اس کے

ساتھ ہی، زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے، سابقہ ہدایت کی جن جزئیات میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی یا جو جدید جزئیات دی جانی مقصود ہوتیں، ان کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ ہدایات کے اس مجموعہ کو اس نئے رسول کی کتاب کہا جاتا۔ اس سے واضح ہے کہ ان تمام پیغامات کا سرچشمہ ایک ہی تھا اور ان کی تعلیم بھی اصولی طور پر ایک۔ البتہ ان کی جزئیات میں مقتضیاتِ زمانہ کے اعتبار سے، ردّ و بدل اور حک و اضافہ ہوتا رہتا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے گذر کر عالمِ شباب تک آپہنچی۔ اب وقت آچکا تھا کہ خدا کے ان تمام پیغامات کو ان کے اصلی رنگ میں یک جا کر دیا جائے اور نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے جو کچھ درکار ہو وہ سب محفوظ و مصئون شکل میں انسانوں کو دے دیا جائے جو قیامت تک کے لئے ان کی ہدایت کا نصاب بن سکے۔ اس مجموعۂ ہدایات کا نام ہے "قرآنِ کریم" جس پر نہ حوادثِ ارضی و سماوی اثر انداز ہو سکتے ہیں اور نہ اس میں ذہنِ انسانی کی آمیزش کا کوئی امکان ہے۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی رُو سے اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان لانا ضروری ہے کہ تمام انبیائے کرامؑ خدا کے فرستادہ تھے اور ان کے آوردہ پیغامات کا سرچشمہ علمِ الٰہی تھا۔ اس لئے وہ تمام رسول سچے اور ان کے پیغامات (مَا اُنزِلَ عَلَیْهِمْ جو کچھ ان پر نازل ہوا تھا) برحق تھے۔ لیکن اب صفحۂ ارض پر وہ پیغامات اپنی اصلی شکل میں صرف قرآنِ کریم کے اندر ہیں، اس کے باہر کہیں نہیں۔ اس لئے اب اطاعتِ خداوندی صرف قرآنِ کریم کی رُو سے ہو سکتی ہے۔ (یہ حقیقت کہ آج صفحۂ ارض پر فی الواقعہ، قرآن کے علاوہ، کوئی آسمانی کتاب اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں، بہت اہم ہے۔ اسے اپنے مقام پر تفصیل سے بیان کیا جائے گا[1])۔ اس لئے قرآنِ کریم جب سابقہ انبیائے کرامؑ یا دیگر آسمانی کتابوں کا ذکر کرتا ہے تو رقیبانہ چشمک سے نہیں بلکہ اس طرح جیسے ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تنزیلِ تورات

چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلا تفصیلی تذکرہ تورات کا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ قرآن سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے تورات و انجیل کو نازل فرمایا۔

(۳/۳)

تورات

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ "تورات" صرف اس کتاب کا نام نہیں جسے حضرت

---

[1] دیکھئے میری کتاب " مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں"۔

موسےؑ پر نازل کیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ ہے ان تمام صحف کا جو حضرت موسےؑ اور ان کے بعد کے انبیاء بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً ملتی رہیں۔ ان میں سے حضرت داؤدؑ کی کتاب زبور اور حضرت عیسیٰؑ کی کتاب انجیل کا نام (قرآن میں) الگ آیا ہے۔ باقی تمام انبیائے بنی اسرائیل کے مجموعۂ کتب کو تورات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ لہٰذا، جب تورات کی نسبت حضرت موسیٰؑ کی طرف کی جائے گی تو اس سے مراد "کتابِ موسیٰؑ" سے ہوگی۔ یہ کتاب بھی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کی طرف نازل شدہ وحی کا مجموعہ تھی۔ اس لئے کہیں اس کی نسبت حضرت موسےؑ کی طرف ہے اور کہیں دونوں کی طرف۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے،

وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

(۲/۵۳ نیز ۲/۸۷، ۲۳/۴۹، ۲۵/۳۵، ۱۸ — ۱۹/۸۷)

اور جب موسیٰ کو الکتاب یعنی (حق اور باطل میں) فرق کر دینے والی عطا فرمائی تاکہ تم پر (سعادت و فلاح کی) راہ کھل جائے۔

اور سورۃ انبیاء میں۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۲۱/۴۸)

اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے موسےؑ اور ہارون کو فرقان (یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے والی کتاب) اور (وحیِ الٰہی کی) روشنی اور متقیوں کے لئے نصیحت دی تھی۔

سورۃ الصّٰفّٰت میں اس کی مزید وضاحت فرمادی گئی جہاں ارشاد ہے:

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۝ۚ وَ نَجَّيْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ۚ وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ۚ وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ۝ۚ (۳۷/۱۱۷ — ۱۱۴)

اور بلاشبہ ہم نے موسےؑ و ہارون پر احسان کیا اور انہیں اور ان کی قوم کو سخت بے چینی سے نجات دی۔ ان کی ہم نے مدد کی تو وہی غالب ہو کر رہے اور (دیکھو) ہم نے دونوں کو واضح کتاب عطا فرمائی۔

ان آیات سے واضح ہے کہ حضرت موسےؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو کتاب ملی تھی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی بلا کتاب آتا ہے اور اس کی سند میں حضرت ہارونؑ کو پیش کیا جاتا ہے، یہ نبی کے مقام اور قرآن کی تصریحات

سے ناواقفیت کی دلیل ہے. کوئی نبی یا رسول بلا کتاب آ ہی نہیں سکتا تھا۔ (تفصیل اس اجمال کی "ابلیس وآدم" بابِ رسالت میں ملے گی)۔

بہرحال، تورات، ان تمام کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جو مختلف انبیائے بنی اسرائیل کو ملتی رہی تھیں. اس کی تائید قرآن کے مختلف مقامات سے ہوتی ہے. مثلاً

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ...... شُهَدَآءَ

(۵/۴۴ نیز ۲/۱۷؛ ۴۹/۲۳)

بلاشبہ ہم نے تورات نازل کی۔ اس میں ہدایت اور روشنی ہے. خدا کے نبی جو (احکامِ الٰہی کے) فرمانبردار تھے، اسی کے مطابق یہودیوں کو حکم دیتے رہے. نیز ربی اور احبار (یعنی یہودیوں کے علماء و مشائخ) بھی اسی پر کاربند رہے، کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس (کے احکام وہدایات) پر گواہ تھے۔

کتابِ موسیٰؑ میں ان احکام کی تفصیل موجود تھی جو بنی اسرائیل کی راہ نمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے تھے۔ (۶/۱۵۴؛ ۲۳/۴۹)

ہدایت ورحمت

یہ ضابطۂ خداوندی ایسا راہ نما تھا جس کے اتباع میں خدا کی رحمتوں کا نزول ہوتا تھا۔ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً (۱۱/۱۷) "اور اس (قرآن) سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب (نازل ہوئی تھی)، جو پیشوا اور رحمت تھی"۔ (نیز دیکھئے ۴۶/۱۲؛ ۲۸/۴۹)۔ اعمالِ صالحہ کے جن درخشندہ نتائج کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے، تورات (وانجیل) میں بھی ان کا تذکرہ تھا (۹/۱۱۱)۔ حتیٰ کہ قدسیوں کی اس جماعتِ حقہ کے آثار و علامات بھی اس میں موجود تھے، جن کے ہاتھوں حضور خاتم الانبیاءؐ کے عہدِ مبارک میں خدا کی حکومت کو زمین پر قائم ہونا تھا (۴۸/۲۹)۔ یہ تھی وہ کتاب جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو عطا کی گئی۔ اس حقیقت پر ایمان رکھنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ (۳/۸۵ — ۸۴۱)

ایمان مَآ اُنْزِلَ پر ہے

(یہاں اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ مَآ اُنْزِلَ (جو کچھ ان حضرات انبیائے کرامؑ پر نازل کیا گیا تھا) پر ایمان رکھنا ضروری ہے نہ کہ اُن کتابوں پر جسے آج یہ اہلِ کتاب اپنی آسمانی کتابیں کہہ کر پیش کرتے ہیں اور جن کے متعلق قرآنِ کریم میں

واضح طور پر موجود ہے کہ وہ محرّف کتابیں ہیں اصلی نہیں ہیں)۔

اسی کتاب کا بنی اسرائیل کو وارث بنایا گیا تھا۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْهُدٰی وَ اَوْرَثْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ ۙ هُدًی وَّ ذِكْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ (۴۰/۵۴-۵۳)

اور (دیکھو) بلاشبہ ہم نے موسےٰ کو (کتاب) ہدایت عطا فرمائی اور بنی اسرائیل کو اس کا وارث بنادیا۔ اس میں عقل والوں کے لئے سامانِ ہدایت و نصیحت تھا۔

لیکن ان وارثین کتاب اللہ نے اپنے ورثہ کے ساتھ کیا کیا؟ انھوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ کچھ حصہ چھپالیا، باقی میں الحاق وتحریف کردی جس کا نتیجہ یہ کہ جسے آج تورات کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ آسمانی کتاب ہونے کے بجائے مختلف افسانوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے جسے انسانی دماغوں نے تراشا[1] تھا (۶/۹۲) یعنی انھوں نے اصلی کتاب میں تحریف کردی (۲/۷۵)۔ یہ تحریف صرف معنوی نہ تھی بلکہ الفاظ میں بھی ردّ و بدل کردیا جاتا تھا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (۴/۴۶؛ ۵/۴۱)۔ کہیں اس میں اپنی طرف سے اضافے کردیئے جاتے تھے۔

فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ۗ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ وَ وَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ ۝ (۲/۷۹؛ ۳/۷۷)

پس افسوس ان (مدعیان علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں۔ پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے (یعنی اس خود ساختہ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ کتابِ الٰہی کے احکام ہیں) اور یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کرلیں۔ پس افسوس اس پر جو کچھ ان کے ہاتھ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعہ سے کماتے ہیں!

اور یوں تلبیسِ حق و باطل کردیتے تھے۔

---

[1] تورات کی تاریخ میری کتاب "مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملے گی۔ اصل تورات ضائع ہوگئی تھی موجودہ تورات بعد میں ازسرِنو مرتب ہوئی اور اس میں بھی ردّ و بدل ہوتا رہا۔

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۳/۷۱)

اے اہلِ کتاب! کیوں حق کو باطل کے ساتھ ملا جُلا کر مشتبہ کر دیتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اصلیت کیا ہے؟)

تاکہ اس سے دنیاوی مقاصد حاصل کئے جائیں (۳/۱۸۷). ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کے نصابِ زندگی کی یہ حالت ہو جائے تو اس میں کس قدر اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۚ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ (۱۱/۱۱۰)

اور ہم نے موسےٰ کو کتاب دی تھی. پھر اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر تیرے پروردگار نے پہلے سے ایک بات نہ ٹھہرا دی ہوتی (یعنی یہ کہ دنیا میں خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مہلت عمل ملتی ہے) تو البتہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور ان لوگوں کو اس کی نسبت شبہ ہے کہ حیرانی میں پڑے ہیں.

لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ سُنّت اللہ تھی کہ جب کسی رسول کا پیغام اس طرح مسخ ہو جاتا اور ابلیسی ہاتھ اس میں اس طرح تحریف و الحاق کر دیتے، تو اللہ تعالیٰ دوسرے رسول کو بھیج کر اس حشو و زوائد کو الگ کر دیتا۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۚ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۙ (۲۲/۵۲)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول اور جتنے نبی بھیجے، سب کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ جو تعلیمِ خداوندی انھوں نے پیش کی تھی اس میں شیطانی ہاتھ ملاوٹ کر دیتے تھے۔ اس کے بعد خدا پھر (ایک اور رسول کو بھیج کر) ایسا کرتا کہ اس انسانی آمیزش کو مٹا دیتا اور اپنے قوانین کو محکم طور پر دے دیتا اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

لیکن وہ لوگ جن کے دل غیر خدائی تعلیم کو مرغوب رکھتے وہ اس جدید پیغامِ خداوندی کی مخالفت

کرتے (۲۲/۵۳). اور جو علمِ صحیح سے بہرہ یاب ہوتے وہ علیٰ وجہ البصیرت اس کی حقانیت پر ایمان لاتے (۲۲/۵۴). قرآنِ کریم اسی سنّتِ خداوندی کے ماتحت اسی مقصد کے لئے نازل ہوا تھا (۵/۱۵). لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہود نے اس پیغامِ خداوندی کی مخالفت کی اور سخت مخالفت کی جس کی وجہ سے ان کی ہلاکت پر مہر ثبت ہو گئی کہ جو قوم اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے قالب میں نہیں ڈھالتی اس کی ہلاکت یقینی اور اس کی بربادی اٹل ہے۔

یہ ہے کتابِ موسیٰؑ کے متعلق قرآنِ کریم کا بیان۔ غور کیجئے کہ ایسی خندہ پیشانی اور کشادہ نگہی سے کسی "دوسرے مذہب" والوں کی کتاب کی اصلی عظمتوں کا اعتراف، قرآنِ کریم کے علاوہ کہیں اور بھی ملتا ہے؟ باقی رہا یہ کہ اس کے باوجود قرآنِ کریم ان کتابوں کو کیوں ناقابلِ اعتبار قرار دیتا ہے، تو اس کی وجہ، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہی ہے کہ یہ کتابیں آج دنیا میں اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہیں۔

بابِ پنجم

بعض ضمنی گوشے

اصلی بحث تو ختم ہو گیا، لیکن بعض ضمنی چیزیں ایسی ہیں جن کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

کلیمِ الٰہی اللہ تعالیٰ نے یوں تو اپنے تمام پیغامات (وحی) کو اپنا کلام کہا ہے (مثلاً يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ (۴۸/۱۵) "وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل ڈالیں" یا وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ...... (۹/۶) اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے....) لیکن حضرت موسیٰؑ کے متعلق خصوصیت سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شرفِ ہمکلامی سے سرفراز فرمایا۔ وَكَلَّمَهُ

کرتے (۲۲/۵۳)۔ اور جو علمِ صحیح سے بہرہ یاب ہوتے وہ علیٰ وجہ البصیرت اس کی حقانیت پر ایمان لاتے (۲۲/۵۴)۔ قرآنِ کریم اسی سنتِ خداوندی کے ماتحت اسی مقصد کے لئے نازل ہوا تھا (۵/۱۵)۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہود نے اس پیغامِ خداوندی کی مخالفت کی اور سخت مخالفت کی جس کی وجہ سے ان کی ہلاکت پر مہر ثبت ہو گئی کہ جو قوم اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے قالب میں نہیں ڈھالتی اس کی ہلاکت یقینی اور اس کی بربادی اٹل ہے۔

یہ ہے کتابِ موسیٰؑ کے متعلق قرآنِ کریم کا بیان۔ غور کیجئے کہ ایسی خندہ پیشانی اور کشادہ نگہی سے کسی "دوسرے مذہب" والوں کی کتاب کی اصلی عظمتوں کا اعتراف، قرآنِ کریم کے علاوہ کہیں اور بھی ملتا ہے؟ باقی رہا یہ کہ اس کے باوجود قرآنِ کریم ان کتابوں کو کیوں ناقابلِ اعتبار قرار دیتا ہے، تو اس کی وجہ، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہی ہے کہ یہ کتابیں آج دنیا میں اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہیں۔

باب پنجم

بعض ضمنی گوشے

اصلی بحث تو ختم ہو گیا، لیکن بعض ضمنی چیزیں ایسی ہیں جن کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

کلیمِ الٰہی اللہ تعالیٰ نے یوں تو اپنے تمام پیغامات (وحی) کو اپنا کلام کہا ہے (مثلاً یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّبَدِّلُوۡا کَلٰمَ اللّٰہِ ؕ (۴۸/۱۵) "وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل ڈالیں" یا وَ اِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ اسۡتَجَارَکَ فَاَجِرۡہُ حَتّٰی یَسۡمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ...... (۹/۶) اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے....) لیکن حضرت موسیٰؑ کے متعلق خصوصیت سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شرفِ ہمکلامی سے سرفراز فرمایا۔ وَ کَلَّمَہٗ

رَبُّهٗ (۷/۱۴۳) "اس کے رب نے اس سے کلام فرمایا۔ یا مثلاً سورۂ نساء میں ہے وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ (۴/۱۶۴) اور اللہ نے موسیٰؑ سے خوب باتیں کیں"۔ سورۂ اعراف میں ہے۔

قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۷/۱۴۴)

خدا نے کہا، اے موسیٰ! میں نے تجھے اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی۔ پس جو چیز تجھے عطا فرمائی ہے (یعنی احکامِ شریعت) اسے لے اور شکر بجالا۔

ندائے جمال، کس طرح حضرت موسیٰؑ کے لئے فردوسِ گوش بنتی تھی، اس کا ذکر تجلیاتِ طور کی روشنی میں گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ لیکن یہ ہمکلامی بھی وحی کا ایک اسلوب تھا۔ سورۂ شعراء میں ارشاد ہے۔

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِىَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِىٌّ حَكِيْمٌ ۝ (۴۲/۵۱)

اور کسی انسان کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے مگر یہ کہ وہ وحی بھیجدے یا پسِ پردہ اپنے کلام سے نواز دے یا کوئی رسول بھیج دے جو باذنِ خداوندی لوگوں تک خدا کی وحی پہنچائے (اور بس)۔ بلاشبہ وہ (بڑا ہی) بلند مرتبہ اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ انسانوں سے خدا کی ہمکلامی کے تین طریقے ہیں۔ پہلے دو طریقے، انبیاء کرام کے ساتھ ہمکلامی کے ہیں اور وہ ہیں بذریعہ وحی یا پسِ پردہ گفتگو۔ اور تیسرا طریقہ ہے عام انسانوں (انبیاء کے علاوہ دوسرے انسانوں) سے ہمکلامی کا۔ یہ طریقہ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی طرف وحی کرتا ہے اور وہ نبی اس وحی کو لوگوں تک پہنچا دیتا ہے جس طرح آج ہم سے خدا، قرآن کے ذریعے ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ پسِ پردہ گفتگو وہ شرف تھا جس کا ذکر حضرت موسےٰؑ کے تذکرہ کے ضمن میں کیا گیا ہے جیسا کہ (ابلیس و آدم میں) وحی کے عنوان میں لکھا جاچکا ہے، وحی اور اس کے جملہ تضمنات، نبوت کی خصوصیات میں سے ہیں جو غیر از نبی، کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں کہ یہ ہمکلامی ایسی تھی جیسے دو انسان پسِ پردہ ایک دوسرے سے باتیں کریں۔ وحی کے معاملہ میں ہم سے مطالبہ ایمان (مان لینے)

کا ہے عرفان (پہچان لینے) کا نہیں۔ اگر یہ ہمکلامی (یا کم از کم اللہ کی آواز کو عام کانوں سے سُن لینا) عام انسانوں کے حیطۂ امکان کی چیز ہوتی، تو بنی اسرائیل کے جو ستر منتخب افراد تجلّی گاہِ طور پر اس غرض کے لئے گئے تھے کہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، انہیں کم از کم اس ندائے پسِ پردہ سے شرف اندوز کر دیا جاتا۔ لیکن یہ صرف خاصّۂ نبوت تھا اور اس کی ماہیت و کیفیت صرف نبی ہی سمجھ سکتا ہے اور اب جبکہ سلسلۂ نبوت ہی ختم ہو چکا ہے تو اس کیفیت کو کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا۔ واضح رہے کہ یہ جو ہم نے اوپر کہا ہے کہ وحی کی ماہیت، غیر از نبی کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی، تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ حقیقت کہ وحی کس طرح آتی تھی، اس کا القاء کس طرح قلبِ نبوی پر ہوتا تھا، جبریلؑ کا فریضہ کیا تھا، ندائے خداوندی کی کیفیت کیا تھی، یہ امور غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ لیکن وحی کی رُو سے جو تعلیم دی جاتی تھی اسے ہر صاحبِ ہوش سمجھ سکتا تھا اور سمجھ سکتا ہے۔

۲۔ شرحِ صدر

جب حضرت موسیٰؑ کو (مدین سے واپسی پر) حکم دیا تھا کہ جاؤ اور بنی اسرائیل کو فرعون کے دستِ استبداد سے چھڑاؤ، تو یہ مہم ایسی عظیم الشان اور زہرہ گداز تھی کہ آپ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ؕ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی ھٰرُوْنَ ﴿۱۲-۱۳/۲۶﴾

موسیٰ نے عرض کیا "اے پروردگار! مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے اور (نتیجہ میں) میرا سینہ (رنج و غم سے گھٹے گا اور) تنگ ہو جائے گا اور نہ میری زبان چل سکے گی۔ تو اپنا یہ حکمِ رسالت ہارون کے پاس بھی بھیج دے (تاکہ وہ اس مہم میں میرا ہاتھ بٹا سکے)۔

آنے والے خطرات کے انداز سے حضرت موسیٰؑ کے قلب پر جو کیفیت طاری ہوئی اسے "ضیقِ صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے متعلق دوسری جگہ آپ کی دعا ان الفاظ میں مذکور ہے۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۙ وَ یَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ۙ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۙ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۪ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۙ هٰرُوْنَ اَخِی ۙ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ۙ وَ

اَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۙ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ۙ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ؕ (۲۰/۲۵-۳۴)

موسےٰ نے عرض کیا "اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔ میرا کام میرے لئے آسان کر دے (کہ راہ کی کوئی دشواری بھی غالب نہ آسکے) میری زبان کی گرہ کھول دے کہ (خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جائے اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے۔ نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے۔ اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے وہ میرے کام میں میرا شریک ہو۔ ہم (دونوں مل کر) تیرے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں پوری طرح تگ و تاز کر سکیں اور تیرے قانون کو غالب کرنے میں بیش از بیش قدم اٹھا سکیں۔

اس سے "ضیقِ صدر" اور "شرحِ صدر" کا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔

ذرا تصور میں لائیے کہ ایک رسول کا مشن (فریضۂ زندگی) کیا ہوتا ہے؟ باطل کی ہر روش کے خلاف دعوتِ انقلاب! ظاہر ہے کہ اس دعوت کا نتیجہ ساری دنیا سے مخالفت مول لینا ہے۔ اس مخالفت میں ہر قسم کے حربے استعمال کئے جائیں گے۔ طعن و تشنیع کی نوکِ سناں سے لے کر تلوار کے گھاؤ تک ہر حربہ۔ جس ہستی کے سپرد اس قسم کی عظیم الشان مہم کی جائے، اس کی ذمہ داریوں کے بوجھ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ اس بوجھ کے نیچے ایسا دب جائے کہ اُٹھنے کی ہمت نہ رہے تو اس کی شکست ایک فرد کی شکست نہیں، ایک عظیم الشان سکیم کی ناکامی ہوگی۔ اس لئے ایسے قائد کے لئے ضروری ہے کہ آنے والے خطرات سے اس کے دل میں تنگی (ضیقِ صدر) پیدا نہ ہو۔ بلکہ اس کا سینہ اتنا کشادہ کر دیا جائے کہ دنیا بھر کے خطرات و مہمات اس کے اندر سما جائیں اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ وہ ایسا وسیع الظرف ہو کہ جب اُسے مخالفین پر غلبہ حاصل ہو، تو ان سے بڑی کشادہ نگی سے پیش آئے، تنگ نظری کی انتقام جویانہ روش نہ اختیار کر لے۔ اسی کا نام ہے شرحِ صدر، یعنی سینہ کی کشاد، وسعتِ ظرف، حوصلہ کی بلندی، ہمتوں کی رفعت۔

دنیا کے سب سے بڑے انقلاب کے داعی (حضور نبی اکرمؐ) کے متعلق ارشاد ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَ ضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ؕ (۱۱/۱۲)

پھر (اے پیغمبر!) کیا تو ایسا کرے گا کہ جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے، اس میں سے کچھ باتیں چھوڑ

دے گا اور اس کی وجہ سے دل تنگ رہے گا؟ اور یہ اس لئے کہ لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ اس آدمی پر کوئی خزانہ (آسمان سے) کیوں نہیں اُتر آیا" یا " ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ ایک فرشتہ آکھڑا ہوجاتا؟" (نہیں، تجھے تو دل تنگ نہیں ہونا چاہیئے) تیرا مقام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ (انکار و بد عملی کے نتائج سے) خبردار کرنے والا ہے۔ (تجھ پر اس کی ذمہ داری نہیں کہ لوگ تیری باتیں مان بھی لیں) اور ہر چیز پر اللہ ہی نگہبان ہے۔

اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے سورۃ حجر کی ذیل کی آیات پر غور فرمایئے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ○ (۱۵/۹۴-۹۶)

پس جو کچھ تمہیں حکم دیا گیا ہے لوگوں پر آشکارا کرو اور مشرکوں کی کچھ پروا نہ کرو۔ ان ہنسی اڑانے والوں کے لئے ہم تمہاری طرف سے بس کرتے ہیں (یہ ہنسی اڑانے والے) جو اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو بھی معبود بناتے ہیں، عنقریب معلوم کریں گے کہ حقیقتِ حال کیا تھی؟

" فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ "! کتنا بڑا فریضہ ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اس دعوت کو لوگوں پر آشکارا کردے اور یہ بھی کہ اس کی تکمیل کے لئے اپنی جداگانہ تنظیم کرلے۔ بہر حال مقصد ایک ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فریضہ کی سرانجام دہی میں ہزاروں مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اس لئے اس کے بعد فرمایا۔

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ○ (۱۵/۹۷)

ہم اس سے بے خبر نہیں کہ ان لوگوں کی باتوں سے تمہارا دل رُکنے لگتا ہے۔

لیکن اس کے لئے علاج کیا ہے؟ کیا دل چھوڑ کر بیٹھ جانا! معاذ اللہ! ایسا نہیں۔ بلکہ احکامِ الٰہیہ کے اتباع میں اور زیادہ جذب و انہماک اور جوش و خروش سے سرگرداں ہوجانا۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○ (۱۵/۹۸)

سو چاہیئے کہ تم ربوبیتِ خداوندی کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لئے پوری پوری کوشش کرو اور قوانین خداوندی کا اتباع کرنے والوں میں سے ہوجاؤ۔

جب یہ کچھ ہوجائے، تو اس کے بعد، مخالفت کی تمام قوتوں کی شکست اور اپنے مقصد کی کامیابی یقینی ہے۔

وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۱۵/۹۹﴾

اس کی اطاعت میں لگے رہو یہاں تک کہ یقین تمہارے سامنے آجائے۔

اسی کا نام "شرحِ صدر" ہے۔ یہ تھا وہ گراں بہا انعامِ خداوندی جس کی یاد بعد میں حضورؐ کو ان الفاظ میں دلائی گئی۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ ﴿۹۴/۱-۴﴾

(اے پیغمبرِ اسلامؐ!) کیا ہم نے تمہیں سینے کی کشادہ نہیں عطا کردی اور تم سے تمہارا بوجھ دور نہیں کردیا جو تمہاری کمر توڑے ڈالتا تھا اور تمہارے لئے تمہارا ذکر بلند نہیں کردیا؟

دیکھئے! دوسری اور تیسری آیت، کس طرح پہلی آیت کی تشریح کررہی ہے، ذمہ داریوں کے اس بوجھ کو ہلکا کردینا جن کے تصور سے (گویا) کمرِ ہمت ٹوٹی جارہی تھی۔ یہ تھا شرحِ صدر! اور اس کا نتیجہ؟ تمام مخالفین کا سرنگوں ہوجانا اور اس داعیٔ انقلاب کے علم بلند ہوجانا۔ اس کے بعد عزم و استقلال اور خطرات کے مردانہ وار مقابلہ کرنے کا راز دو آیتوں میں سمیٹ کر رکھ دیا جہاں فرمایا۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ ﴿۹۴/۵-۶﴾

پس بلاشبہ تنگی کے ساتھ فراخی ہے۔ یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی ہے۔

اور پھر فتح و کامرانی کے بعد، سہل انگاری اور تن آسانی نہیں بلکہ

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ ﴿۹۴/۷﴾

چنانچہ (اے پیغمبرِ اسلامؐ!) جب تم (ایک مہم سے) فارغ ہوجاؤ تو (دوسری کیلئے) جم کر کھڑے ہوجاؤ۔

شروع سے اخیر تک مجاہدانہ زندگی، ابتدا سے انتہا تک سعی و عمل اور اس سعی و عمل اور جدوجہد کا مقصود؟

وَ اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۧ ﴿۹۴/۸﴾

اور اپنے پروردگار کی طرف اور زیادہ متوجہ ہوجا!

زمین پر اس کی حکومت کا قیام اور قیام کے بعد استحکام، یوں شرحِ صدر کیا جاتا ہے! لیکن اس قسم کے عملِ پیہم اور استقلال و استقامت کی بنیاد کیا ہے؟ یقینِ محکم! اپنے نصب العین کی صداقت پر غیر متزلزل

ایمان، کوہ شکن یقین، اس قسم کا ایمان جس میں تذبذب کو کوئی دخل نہ ہو۔ نصب العین اس طرح آنکھوں کے سامنے واضح ہو جیسے سورج کی روشنی میں ہر شے اپنے اپنے مقام پر صحیح صحیح نظر آتی ہے۔ جس کا شرحِ صدر ہوتا ہے اس کی نگاہوں کے سامنے ایسی ہی روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳۹/۲۲)

تو کیا وہ شخص جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی پر ہے (سخت دل لوگوں کے برابر ہو سکتا ہے) ہرگز نہیں! تو افسوس ہے ان لوگوں پر جن کے دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے سخت ہو گئے ہوں۔ یہ لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں!

اس روشنی سے ہدایت (سیدھی راہ) سامنے آجاتی ہے اور پھر حصولِ مقصد میں کوئی کبیدگی محسوس نہیں ہوتی (۶/۱۲۵) اور یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو سیدھی "سلامتی کے گھر" کی طرف لے جاتی ہے۔ (۶/۱۲۷ — ۱۲۶)

۳۔ ضلالت

حضرت موسیٰؑ کا قبطی کو تھپڑ مارنے کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے۔ جب آپ فرعون کے پاس دعوتِ ربانی لے کر آئے تو اس نے کہا کہ تم ہمارے مجرم ہو۔ تم نے ایک قبطی کو جان سے مار دیا تھا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ؕ (۲۶/۲۰)

موسےٰ نے کہا " ہاں میں اس وقت اس فعل کا مرتکب ہوا تھا۔

جبکہ میں ناواقفوں میں سے تھا۔

چونکہ عام طور پر ضلالت کے معنی "گمراہی" کے لئے جاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے ذہن کے اس طرف منتقل ہو جانے کا امکان ہے کہ حضرت موسےٰؑ نے اپنی گمراہی کا اقرار کیا۔ لیکن ضلالت کے معنی "دین کے صحیح راستہ سے بھٹک جانا" ہی نہیں، یہ لفظ وسیع المعانی ہے۔ اس کے معنی عام غلطی کے بھی ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اپنے والد ۔۔۔۔۔۔ (حضرت یعقوبؑ) کے متعلق کہا تھا۔

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ

إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۱۲/۸)

اور جب ایسا ہوا تھا کہ (یوسف کے سوتیلے بھائی آپس میں) کہنے لگے، "ہمارے باپ کو یوسف اور اس کا بھائی (بن یامین) ہم سب سے بہت زیادہ پیارا ہے، حالانکہ ہم پوری ایک جماعت ہیں۔ (یعنی ہماری اتنی بڑی تعداد ہے) اور یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے۔"

اسی طرح جب حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کی بازیابی کے متعلق باتیں کرتے تھے تو یہ لڑکے کہتے کہ انہیں تو (معاذاللہ) وہی پرانا خبط سما رہا ہے۔

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ (۱۲/۹۵)

سننے والوں نے کہا، "بخدا تم تو اب تک اپنے (اسی) پرانے خبط میں پڑے ہو" (یعنی یوسفؑ کا تو نام ونشان بھی نہ رہا اور تمہیں اس کی واپسی کے خواب آ رہے ہیں)۔

جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے سوال کیا کہ گذرے ہوئے لوگ کس حال میں ہیں تو آپ نے جواب میں فرمایا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى (۲۰/۵۲)

موسےٰ نے کہا" اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے۔

یہاں بھی یَضِلُّ کے معنی واضح ہیں۔ پھر اس کے معنی کسی معاملہ کا صاف صاف دکھائی نہ دینا بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص راستہ کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پھر رہا ہے لیکن راستہ واضح طور پر سامنے نہیں آتا۔ وحی سے پیشتر حضرات انبیاء کرامؑ کی کچھ ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے (تفصیل "ابلیس وآدم" عنوان "وحی" میں گذر چکی ہے)۔ ان کا قلب صحیح راستہ کی تلاش میں مضطرب ہوتا ہے، لیکن صحیح راہ تو صرف وحی کی روشنی میں مل سکتی ہے۔ ان کی اس تجسس وتلاش اور کدوکاوش کی کیفیت کو بھی اسی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ (۹۳/۷)

اور (اے پیغمبرِ اسلامؐ!) خدا نے تمہیں تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو اس نے تمہاری راہ نمائی کی۔

ان مقامات سے واضح ہوگیا ہو گا کہ جب حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا کہ " اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ " (میں ناواقفوں میں سے تھا۔) تو اس سے مفہوم (معاذ اللہ) دین کی راہ سے بھٹک جانا نہیں تھا بلکہ مراد یہ تھی کہ میں اس سے بے خبر تھا کہ مکّہ مارنے سے وہ جان سے مرجائے گا۔

۴۔ قتلِ نفس

قصہ بنی اسرائیل میں، قتل کا ایک واقعہ بھی مذکور ہے جو سورۃ بقرہ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۷۲-۲/۷۳)

اور پھر (غور کرو، وہ واقعہ) جب تم نے (یعنی تمہاری قوم نے) ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور اس کی نسبت آپس میں جھگڑتے اور ایک دوسرے پر الزام لگاتے تھے اور (جرم کی) جو بات تم چھپانا چاہتے تھے خدا اسے آشکارا کر دینے والا تھا۔

چنانچہ ہم نے حکم دیا کہ " اسے اس کے بعض حصّے سے ضرب لگاؤ" (جب ایسا کیا گیا تو حقیقت کھل گئی اور قاتل کی شخصیت معلوم ہوگئی) اللہ اسی طرح مُردوں کو زندگی بخشتا اور تمہیں اپنی (قدرت و حکمت کی) نشانیاں دکھلاتا ہے تاکہ تم فہم و دانش سے کام لو!

اِضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کی تفسیر میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہوگیا ہے لیکن بایں ہمہ، بات ویسی کی ویسی مشکل رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور اس کا صحیح مفہوم، تاریخی انکشافات کی روشنی میں ہی متعیّن ہو سکتا ہے۔ جس طرح فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کا بیان ایک تاریخی واقعہ تھا، صدیوں تک اس آیت کی تفسیر میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ لیکن جب تاریخ نے اپنے چہرہ سے نقاب اٹھایا تو مصر کے تہ خانے میں اس آیت کی مجسّم تفسیر نظر آگئی۔ اسی طرح، محوّلہ صدر واقعہ بھی تاریخ سے متعلق ہے۔ قیاس آرائیوں سے اس کا صحیح مفہوم متعین نہیں ہوسکتا۔ یہ آیت ابھی متشابہات کی فہرست میں ہے۔ تاریخ اپنا کوئی اور ورق اُلٹے گی اور اس وقت یہ آیت، محکمات کی فہرست میں منتقل ہو جائے گی۔ ہم جو کچھ سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ تو ہّم پرستیوں

سے لوگوں کی نفسیاتی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ ذرا سے خلافِ معمول واقعہ کا سامنا نہیں کر سکتے اور اس کے احساس سے ان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی اور واقعۂ قتل میں ان کی اسی نفسیاتی حالت کو تحقیقِ مجرم کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ مشتبہ ملزموں میں سے ایک ایک شخص لاش کے قریب سے گذرے اور لاش کا کوئی حصہ اٹھا کر اس شخص کے جسم سے چھوا جائے، ملزم کی پہچان ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مجرم کی جو حالت ہوئی ہو گی وہ اس کے داخلی احساسات کی غماز بن گئی ہو گی۔ اس طرح جب مجرم کا تعین ہو گیا تو اس سے قصاص لے لیا گیا۔ قرآن نے قصاص کے متعلق کہا ہے کہ اس میں رازِ حیات پوشیدہ ہے (۲/۱۷۹)۔

بہر حال، یہ ہمارا قیاس ہے۔ حقیقت اس وقت ہی سامنے آئے گی جب تاریخی انکشافات اس کی نقاب کشائی کریں گے۔

قارون

ہم گذشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف مبعوث ہوئے تھے (۴۰/۲۴) اور فرعون و ہامان کے ساتھ، قارون بھی تباہ ہونے والوں میں سے تھا (۲۹/۳۹)۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، قارون سرمایہ داری کی لعنت کا مجسمہ تھا اور قرآنِ کریم نے اس کا اسی خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ (۲۸/۷۶)

بلاشبہ قارون موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا۔ مگر (کثرتِ مال کی وجہ سے) وہ لوگوں پر تکبر اور ظلم کرنے لگا۔ ہم نے اسے اس قدر دولت دی کہ اس کے خزانے کئی کئی زور آور شخصوں کو گرانبار کر دیتے تھے۔ یاد کرو جب اس کی قوم نے اسے (سمجھاتے ہوئے کہا) "اترا مت! بلاشبہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔

اکتناز سرمایہ داری کی بنیاد اور نوعِ انسانی کی بہت بڑی لعنت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر سچے داعیِٔ انقلاب کی طرح حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ انقلاب بھی اس لعنت کے استیصال کے لئے تھی، لہٰذا اس دعوت کے خلاف،

قارون کی بغاوت و سرکشی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ فساد (یعنی غیر خداوندی نظام) کا ہر شعبۂ اصلاح کی مخالفت کرے گا اور چونکہ فساد کا منبع دولت اور قوت کا غلط استعمال ہے اس لئے قارون کو بھی مفسد کہا گیا ہے۔ چنانچہ سابقہ آیت سے متصل یہ آیت ہے۔

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (۲۸/۷۷)

اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا خدا نے جو کچھ تجھے دے رکھا ہے اس میں عالمِ آخرت (کی بھلائی) کی بھی جستجو کر اور دنیا میں سے اپنا حصّہ بھی نہ بھول (یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں) اور خدا نے جیسا تجھ پر احسان کیا ہے، تو بھی (اس کے بندوں پر) احسان کر اور زمین میں فتنہ و فساد کے درپئے نہ ہو۔ بلاشبہ خدا فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

لیکن اس کے جواب میں قارون نے کیا کہا؟ وہی جو ہر سرمایہ دار کہا کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنے کسب و ہنر اور کاریگری کی بنا پر کیا ہے کسی دوسرے کو کیا حق حاصل ہے کہ اس پر پابندیاں عائد کرے۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ (۲۸/۷۸)

قارون بولا کہ یہ تمام مال و منال تو مجھے اپنی ذاتی ہنرمندی کی وجہ سے ملا ہے۔ کیا اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ خدا اس سے پہلے گذشتہ امتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت و حشمت میں اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور جمعیت میں بھی باکثرت تھے اور ان کے جرائم اس قدر نمایاں تھے کہ ان کی بابت ان سے کچھ پوچھ گچھ کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی۔

پھر سرمایہ داری کی عیش و عشرت کی زندگی بڑی باعثِ فریبِ نگاہ ہوتی ہے۔ ہر اس شخص کا جس کے سامنے حقیقت واضح نہ ہو جی للچاتا ہے کہ اس کی زندگی بھی ایسی ہی ہو جائے۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ

حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (۲۸/۷۹)

چنانچہ (ایک روز جب) قارون جب اپنی برادری کے سامنے اپنی شان و شوکت کے ساتھ نکلا تو وہ لوگ جو صرف دنیوی زندگی (کی کامیابی) ہی کے طلبگار تھے، کہنے لگے "اے کاش ہمیں بھی وہ سازوسامان ملا ہوتا جو قارون کو ملا ہے۔ واقعی وہ بڑا ہی صاحب نصیب ہے۔"

لیکن جن کی نگاہیں حقیقت آشنا ہوں وہ جانتے ہیں کہ حقیقی زندگی کونسی ہے!

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ (۲۸/۸۰)

مگر جن لوگوں کو (دین کا) علم عطا ہوا تھا وہ (اُن حریصوں سے) کہنے لگے "تم پر افسوس ہے جو کچھ قوانینِ خداوندی کے مطابق ملتا ہے وہ ان لوگوں کے بہتر ہے جو ایمان لائے ہوں اور نیک اعمال کئے ہوں۔ مگر وہ (ثوابِ خداوندی) صرف انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو استقامت سے کام لیتے (اور اپنے آپ کو ہوائے نفسانی سے باز رکھنے والے) ہوں۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ حقیقت آشنا نگاہیں، دولت و حشمت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے دولت و ثروت، عزّت و وقار، اللہ کے انعامات ہیں جن کے حصول کے لئے پوری پوری جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لیکن حصولِ مال و دولت اور چیز ہے اور سرمایہ داری اور شے۔ مقدّم الذکر نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے ہے اور ثانی الذکر انسانیت کا گلا گھونٹنے کی خاطر۔ اس لئے اس کا انجام ظاہر ہے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝ (۲۸/۸۱)

چنانچہ ہم نے قارون اور اس کے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا۔ پھر نہ تو کوئی ایسی جماعت ہوئی جو خدا کے برخلاف اس کی امداد کرتی اور نہ وہ خود ہی اپنی امداد کرنے والوں میں سے ہو سکا۔

یہی وہ انجام ہے جو ہر دیدۂ اعتبار کے لئے باعثِ ہزار موعظت و عبرت ہے۔

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۲۸/۸۲)

اور وہ لوگ جو کل اس جیسا ہونے کی تمنا کر رہے تھے، کہنے لگے "رزق کی بسط وکشاد قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر خدا نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم بھی اس کی طرح تباہ ہو جاتے۔ ناشکرے لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے"۔

قارون (قرح) کی اس بغاوت کا ذکر تورات میں بھی ہے۔

اور قورح بن اظہار بن قہات بن لاوی نے لوگ لئے اور داتن وابیرام بنی الیاب اور اون بن قلت۔ بنی روبن ساتھ تھے اور وہ اور بنی اسرائیل میں سے بعض لوگ یعنی اڑھائی سو شخص جو سرگروہ اور نامی اور جماعت کے مشہور تھے موسیٰ کے مقابلہ میں اٹھے اور وہ موسیٰ اور ہارون کی مخالفت پر جمع ہوئے اور انہیں کہا لو تم زیادتی کرتے ہو اس لئے کہ ساری جماعت میں ہر ایک شخص مقدس ہے اور خداوند ان کے درمیان ہے تم کیوں آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا جانتے ہو؟ موسیٰ یہ سنکر منہ کے بل گرا۔ (گنتی ۱ـــ۴/ ۱۶)

اس کے بعد لمبی چوڑی تفصیل ہے کہ اس سرکش جماعت اور اس کے سرغنوں کی ہلاکت کس طرح ہوئی۔ یہودیوں کا مشہور مورخ جوزیفس 'JOSEPHUS' اپنی تاریخ 'Antiquity of the Jews' میں لکھتا ہے:۔

قارون جس کا شمار اس کے نسب اور اس کی دولت دونوں کی وجہ سے ہے عبرانیوں کے مشاہیر میں سے تھا۔ اس نے موسیٰ کا اتنا زیادہ اعزاز دیکھا تو بے چین ہوگیا۔ اسے ان سے حسد پیدا ہوا! اسے اس لئے بھی صدمہ زیادہ ہوا کہ وہ نسبتی اعتبار سے (حضرت) موسیٰ سے کم نہیں تھا اور اپنی ثروت کے اعتبار سے اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھتا اور اس مرتبہ کا اپنے آپ کو مستحق گردانتا تھا چنانچہ اس نے (حضرت) موسیٰ کے خلاف تمام بنی لاوی کو (بالعموم اور) اپنے خاندان دونوں کو (بالخصوص) ابھارنا شروع کیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ خدا کو اگر بنی لاوی میں سے کسی کو اس منصب کے لئے منتخب کرنا تھا تو موسیٰ سے زیادہ اس کا حقدار میں تھا۔ نسب میں میں ان کا ہمسر ہوں اور دولت اور عمر کے اعتبار سے ان سے بڑھ کر۔ (حصہ ۴، باب ۲، فصل ۲)

جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ

قرح کا نام بہ حیثیت غیر معمولی دولت کے مالک کے آتا ہے (حضرت) یوسف نے جو خزانے
مصر میں دفن کئے تھے ان میں سے ایک خزانہ اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ تین سو خچروں کی ضرورت
تو محض اس کے خزانہ کی کنجیوں کے اٹھانے کے لئے ہوتی تھی۔ (جلد ۷، صفحہ ۵۵۶)

ان بیانات اور قرآنِ کریم کی تصدیق سے واضح ہے کہ قارون خود بنی اسرائیل میں سے تھا۔ لیکن چونکہ ضربِ کلیمی کی زد براہِ راست سرمایہ داری پر پڑتی تھی، اس لئے وہ اس دعوتِ حق و صداقت کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن نظامِ خداوندی کے مخالف، اپنی قوم سے ہوں یا غیروں میں سے۔ میزانِ خداوندی میں سب برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ بتاتے ہوئے بھی کہ (اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی (۲۸/۷۶)) اُس کا ذکر، فرعون اور ہامان کے ساتھ کیا ہے۔ قرآنِ کریم کی یہی وہ تقسیم ہے جس کے متعلق "جوئے نور" (بالخصوص قصّۂ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ) میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے جہاں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "اپنے" کون ہوتے ہیں اور "بیگانے" کون۔

۶۔ ھامان

قصّۂ حضرت موسیٰؑ میں فرعون کے ساتھ ہامان کا ذکر بھی خصوصیت سے آیا ہے چونکہ تورات فرعون کے اس دستِ راست (ہامان) کے ذکر سے خاموش تھی۔ اس لئے عیسائی مستشرقین نے قرآنِ کریم کے اس بیان پر عجیب عجیب قسم کے اعتراضات شروع کر دیئے۔ حتّٰی کہ سر ولیم میور نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ تورات کی کتاب آستر میں فارس کے بادشاہ اخسویرس کے ایک وزیر (خواجہ سرا) مہومان (Mehuman) کا جو ذکر آیا ہے قرآنِ کریم میں (معاذ اللہ) اسے ہی غلطی سے فرعون کا وزیر سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن زمانہ تاریخی انکشافات کا منتظر تھا۔ جب تاریخِ مصر کی یہ گم گشتہ کڑیاں برآمد ہوئیں تو ان میں ہامان مع اپنی خصوصیات کے اُبھر کر سامنے آگیا۔

انسانی تاریخ کے ادوار پر نگاہ ڈالئے۔ ہر جگہ بادشاہت کے غلبہ و استیلاء سے کہیں زیادہ عمیق اور شدید، برہمنیت[1] کا تسلط نظر آئے گا۔ بادشاہ تو خیر، بادشاہی کرتا تھا، برہمن (priest) "خدائی" کرتا

---

[1] تاریخ کے اوّلیں ادوار تو ایک طرف، ابھی کل تک سارا یورپ برہمنیت کے تسلط میں تھا اور وہاں بادشاہ کی حکومت نہیں بلکہ پادریوں ہی کی حکومت تھی۔ آج بھی غور سے دیکھئے تو انسانی قلوب برہمنیت (مذہبی پیشوائیت priesthood) کی عقیدت کے شکنجے سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکے۔

تھا، ایسی خدائی جس میں سچ پوچھئے تو بادشاہ بھی اس کی رعایا تھا۔ رفتہ رفتہ برہمنیت نے ایک نظام کی سی صورت اختیار کر لی جس میں مندر اور اس کے پجاری ایک الگ دنیا قائم کئے نظر آتے ہیں۔ مندروں کے ساتھ بڑی بڑی عظیم القدر جاگیریں وقف ہوتیں۔ مندر کا اسقفِ اعظم (Head priest) خاص امتیازات و اختیارات کا مالک ہوتا۔ یوں تو یہ صورت ہر ملک اور ہر زمانہ میں عام تھی، لیکن مصر کے جس دور کی تاریخ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں اس نظامِ برہمنیت نے ایک خاص ریاستی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، آمن رع (سورج کا دیوتا) مصر میں سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ آمن رع کے مندر کا بڑا پجاری، شوکت و ثروت کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ ڈاکٹر سٹنڈروف اپنی کتاب "قدیم مصریوں کا مذہب" میں لکھتا ہے۔

> آمن دیوتا کے سردار کاہن کو نبیِ اوّل کہتے تھے۔ وہ محکمہ تعمیرات کا افسر بھی تھا۔ مندر کی عالیشان عمارات اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کی تفویض میں تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمن کا مندر اور اس کے پجاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے، بلکہ تھیبس اور شمالی اور مغربی مصر کے تمام منادر کے پجاریوں کا افسرِ اعلیٰ بھی یہی تھا۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے آمن کے مندر کے قبضہ میں مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا اور کم از کم سواں حصہ آبادی پر اس کی حکومت تھی۔

یہ تھی آمن دیوتا کے مندر کے سردار کاہن (Head priest) کی وجاہت و ثروت۔ یہی آمن قرآنِ کریم کا ہامان[1] ہے۔ (جیسے تغیرِ لفظی سے تورات یا مصر کا آردن (AORON) قرآنِ کریم میں ہارون ہو گیا۔ ڈاکٹر سٹنڈروف نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جرمنی میں، مصر کا ایک قدیم مجسمہ ہے جس پر منقوش ہے کہ وہ آمن کے سردار کاہن، بکن خونس کا ہے جو رعمیسس ثانی کے زمانہ میں تھا۔ اب غور فرمائیے

---

[1] جس طرح قرآنِ کریم نے فرعونِ موسیٰ کا نام نہیں لکھا بلکہ اسے اس کے معروف لقب سے پکارا ہے، اسی طرح آمن کا بھی نام نہیں لکھا بلکہ اس کا ذکر بھی اس کے لقب سے ہی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو ان institutions اور ان کی خصوصیات کا تذکرہ مقصود تھا، نہ کہ خاص افراد کی وقائع نگاری۔

آمن کا یہ سردار کاہن کس قدر اہمیت کا مالک تھا اور واقعۂ بنی اسرائیل میں اس کا عمل و دخل کس قدر تھا، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں (تحت لفظ مصر) مذکور ہے۔

> فراعنۂ مصر کے اٹھارویں خاندان کے وقت سے مندر کے پجاریوں نے خاص اثر اور اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اس خاندان کے زمانہ میں آمن رَع (واقعہ تھیبس) کے کاہن کے نام پر ایشیا کے مفتوح علاقے وقف ہو چکے تھے جن کی وجہ سے وہ بے حساب دولت و قوت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر BREASTED نے بھی اپنی مشہور کتاب "تاریخِ مصر" میں لکھا ہے کہ آمن کے سب سے بڑے پجاری کے ماتحت، بہت بڑا مقامی لشکر ہوتا تھا۔ (دوسرا ایڈیشن صفحہ ۵۲۶)

اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآنِ کریم نے فرعون کے ساتھ ہامان اور اس کے لشکروں کا ذکر کیوں ضروری سمجھا (۲۸/۶؛ ۲۸/۸) اور فرعون نے ہامان (محکمہ تعمیرات کے افسر اور نظامِ روحانیت کے سب سے بڑے رکن) سے کیوں کہا تھا کہ اس کے لئے ایک بلند مینارہ تعمیر کرایا جائے جس پر چڑھ کر وہ (معاذاللہ) حضرت موسیٰؑ کے خدا کو جھانک لے (۳۶—۴۰/۳۷)۔ یہی وجہ تھی کہ فرعون کے ساتھ ہامان کی فسوں سازیوں کا تار و پود بکھرنا بھی ضروری تھا۔ مندروں کے جن پجاریوں کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ ہوا تھا وہ سب ہامان ہی کے فوج کے سپاہی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق و صداقت کی مخالفت میں ملوکیت کے جیوش و عساکر کے ساتھ ساتھ "روحانیت" کی افواج و سپاہ نے بھی کچھ کم حصّہ نہیں لیا۔

یہودی لٹریچر میں نبی کے معنی

ضمناً ایک اور اشارہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مصر میں آمن دیوتا کے سردار کاہن کو نبی اوّل کہتے تھے۔ قرآنِ کریم میں نبی کا لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور جیسا کہ (ابلیس و آدم میں) رسالت کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے، نبی اور رسول کا مفہوم ایک ہی ہے۔ لیکن یہودیوں کے لٹریچر میں نبی کا لفظ نظامِ ہیکل کے ایک ممتاز منصب دار کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسے کاہن۔ یہی نبی اور کاہن (احبار و رہبان) ہیں جن کے بگڑنے سے یروشلم اور بنی اسرائیل پر تباہی آئی تھی۔ تورات میں متعدد مقامات پر اس کی تصریح آئی ہے۔ مثلاً یرمیاہ کی کتاب میں ہے۔

> نبیوں کی بابت میرا دل میرے اندر ٹوٹ گیا۔ میری ساری ہڈیاں کانپتی ہیں۔ خداوند کے سبب

اور اس کی مقدس باتوں کے سبب میں متوالا سا ہوں اور اس شخص کی مانند جو مے سے مغلوب ہو گیا۔ یقیناً زمین زناکاروں سے بھر گئی۔ لعنت کے سبب زمین ماتم کرتی ہے۔ میدان کی چراگاہیں سوکھ گئیں کیونکہ ان کی عادت بُری ہے اور ان کا زور ناحق ہے کہ نبی اور کاہن دونوں ناپاک ہیں۔ ہاں میں نے اپنے گھر کے بیچ ان کی برائی پائی۔ خداوند فرماتا ہے۔ اس لئے ان کی راہ ان کے حق میں ایسی ہو گی جیسی پھسلنی جگہیں تاریکی کے وقت میں وہ ان میں کھدیڑے جا کے وہاں گریں گے کہ میں ان پر بلا لاؤں گا کہ یہ اُن سے انتقام لینے کا وقت ہے خداوند کہتا ہے۔ اور میں نے سامریہ کے نبیوں میں حماقت دیکھی ہے۔ انہوں نے بعل کی طرف سے نبوت کی اور میرے لوگ اسرائیل کو بھٹکایا ہے۔ میں نے یروشلم کے نبیوں میں بھی ایک ہولناک چیز دیکھی۔ وہ زناکاری کرتے اور جھوٹ کے پیرو ہوتے۔ وہ بدکاروں کے ہاتھوں کو بھی زور بخشتے ہیں یہاں تک کہ کوئی اپنی برائی سے نہیں پھرتا۔ وہ سب میرے لئے ایسے ہیں جیسے کہ سدوم اور اس کے باشندے عمورہ کی مانند ہیں۔ اسی لئے رب الافواج نبیوں کی بابت یوں کہتا ہے کہ دیکھ میں انہیں ناگدونا کھلاؤں گا اور ہلاہل کا پانی پلاؤں گا کیونکہ یروشلم کے نبیوں کے سبب سے ساری سرزمین میں بے دینی پھیلی ہے۔ رب الافواج یوں کہتا ہے کہ ان نبیوں کی باتیں مت سنو جو تم سے نبوت کرتے ہیں وہ تم کو بطالت کی طرف مائل کرتے۔ وہ اپنے دلوں کے خواب خیالوں کو بیان کرتے ہیں اور نہ کہ وہ باتیں جو کہ خداوند کے مُنہ نکلیں۔[1] (یرمیاہ ۹ ـ ۱۶/۲۳)

اس لئے جن مشاہیر کو تورات نے نبی کہہ کر پکارا ہے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قرآنی مفہوم کے اعتبار سے بھی نبی تھے یا جنہیں نبی نہیں بلکہ کاہن (priest) کہا ہے وہ قرآنی اصطلاح میں نبی نہیں تھے۔ اس لئے کہ تورات میں تو حضرت ہارونؑ کو بھی کاہن کہہ کر پکارا گیا ہے، حالانکہ قرآن کی رُو سے وہ ایسے ہی نبی تھے جیسے حضرت موسیٰؑ۔

اور خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہارون کاہن کے بیٹے الیعزر کو فرما کر عود سوزوں

---

[1] یہی وجہ ہے کہ انگریزی زبان میں 'prophet' کا مفہوم قرآنی اصطلاح کا نبی نہیں بلکہ محض پیش گوئی (prophecy) کرنے والا ہے اور رسالت کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب۔ (تفصیل ابلیس و آدم "عنوان" وحی و رسالت" میں گذر چکی ہے۔

کو جلے ہوؤں میں سے اٹھا اور آگ وہیں بکھیر دے کیونکہ وہ تو مقدس ہیں۔ (گنتی ۱۶/۳۷)

لفظ نبی کے متعلق یہودی لٹریچر اور قرآنی مفہوم کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے ورنہ ان کا اختلاط اکثر غلط فہمیوں کا موجب بن جاتا ہے۔

۷۔ حقیقتِ سحر ساحرین کے قصہ کے ضمن میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ مفہوم کے اعتبار سے ان ساحرین سے مراد ہیں فرعونی مندروں کے باطل پرست علماء (پوجاری) اور ان کے سحر سے مفہوم ہے ان کی باطل تعلیم۔ اس مفہوم کے اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ "جادوگری" کا نہ تھا بلکہ ایک غلط مذہب کے مقابلہ میں، خدائی دین کی صداقت و حقانیت کو جلال انگیز دلائل اور بشارت آمیز براہین نیرہ کے ذریعے پیش کرنا تھا۔ لیکن جو لوگ قرآن کے ان الفاظ (سحر اور ساحرین) کا مجازی مفہوم نہیں لیتے بلکہ انہیں حقیقی معنوں پر محمول کرتے ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ "سحر" کے متعلق جو کچھ کہا یا سمجھا جاتا ہے، اسے بھی مختصر الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ ذیل کی سطور سے یہی مقصود ہے۔

دنیا عالمِ اسباب ہے۔ یہاں ہر معلول (effect) کے لئے ایک علت (cause) اور ہر نتیجہ کے لئے ایک سبب کی ضرورت ہے۔ بعض علل و اسباب ایسے ہیں جو ہر شخص کو دکھائی دیتے ہیں یا کم از کم ہر ایک کی سمجھ میں آجاتے ہیں یا یوں کہیئے کہ وہ واقعات اس طرح التزاماً اور معمولاً ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں کہ ذہنِ انسانی ان سے مانوس ہو جاتا ہے، اس لئے ان میں کچھ اجنبیت نہیں محسوس کرتا۔ لیکن بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اسباب عام طور پر سمجھ میں نہیں آتے۔ انسانی ذہن چونکہ ابھی تک اپنی مکمل پختگی تک نہیں پہنچا، اس لئے وہ "عجائبات" میں (بچوں کی طرح) بڑی کشش و جاذبیت محسوس کرتا ہے (پختہ فکر کی یہ کیفیت نہیں ہوتی)۔ کوئی واقعہ کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو اگر وہ عادتاً اور معمولاً اس کے سامنے ظہور پذیر ہوتا ہے تو اس کی طبیعت اس سے اتنی متاثر نہیں ہوتی جتنی کسی ایسے واقعہ سے (خواہ نتیجہ کے اعتبار سے وہ کتنا ہی ہیچ کیوں نہ ہو) جس کا سبب معلوم (یا محسوس) نہ ہو سکے۔ ایک طبیب حاذق کسی نہایت مہلک مرض کا کتنا ہی کامیاب علاج کیوں نہ کرے وہ اپنے اندر اتنی جاذبیت کبھی نہ رکھے گا جتنی ایک ایسا شخص جو پھونک مار کر کسی کے سر درد کو ہٹا دے۔ اس لئے کہ اول الذکر کا سبب بدیہی ہے، یعنی ہر شخص کو معلوم ہے کہ مریض کو دوا کے اثر سے آرام ہوا ہے لیکن ثانی الذکر کا سبب

بڑا لطیف اور باریک ہے اور عام طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا کہ پھونک مارنے سے درد کو کیسے آرام ہوگیا۔ اس لئے یہ موجبِ حیرت و استعجاب ہے۔ عربی زبان میں سحر اُسے کہتے ہیں جس کا سبب بہت لطیف اور دقیق ہو۔ تاریخِ انسانی کے اوّلین اوراق لیجئے۔ انسان کی یہ اعجوبہ پسندی ہر مقام پر ابھری ابھری نظر آئے گی۔ اور "اوّلین اوراق" ہی کا کیا ذکر! اعجوبہ پسندی تو آج بھی اکثریت کے دلوں میں چٹکیاں لیتی نظر آتی ہے۔ اس کی کشش و جاذبیت میں آج بھی ویسی ہی تازگی ہے۔ علمِ انسانی کی وسعت سے صرف اتنا ہوا ہے (اور ہو رہا ہے) کہ بہت سے واقعات و نتائج جن کے اسباب و علل کبھی نگاہوں سے اوجھل تھے اور اس لئے وہ "سحر" کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے، رفتہ رفتہ معمولی واقعات میں تبدیل ہوتے گئے (اور ہوتے جارہے ہیں)۔ لیکن، بایں ہمہ، جن واقعات کے علل اور جن نتائج کے اسباب، ابھی تک نگاہوں کے سامنے نہیں آسکے ان کی جاذبیت بدستور قائم ہے۔ سو ظاہر ہے کہ انسان جس قدر علم و بصیرت اور تجربات و مشاہدات کی دنیا میں پیچھے ہٹتا جائے گا سحر و طلسم کی فسوں کاریاں اتنی ہی زیادہ ہوتی جائیں گی۔

یوں تو 'MAGIC' کا لفظ اشارہ کناں ہے کہ اس کی ابتداء مجوس (MAGIS) کے ہاں سے ہوئی[1] لیکن عصرِ حاضرہ کی تحقیق کا رُخ اس طرف ہے کہ اسے سب سے پہلے ایک باضابطہ علم یا فن کی صورت قدیم مصری مذہب نے عطا کی۔ وہاں سے یہ یونان کی طرف گیا اور اس کے بعد بابل میں جو بعد میں اس کا مشہور مرکز قرار پاگیا۔ (تفصیل اس کی حضرت سلیمانؑ کے عنوان میں "سحرِ بابل" کے تحت ملے گی)...... یونان میں اس کی نسبت ایک افسانوی نام 'HERMES TRISMAGISTUS' کی طرف کی گئی ہے جہاں سے اسے 'HERMETIC SCIENCE' کا نام ملا ہے۔ یہ فن مشرق کے ظلمت کدوں میں ابھی تک اسی قدیم نقاب میں لپٹا چلا آتا ہے۔ لیکن ممالکِ یورپ میں سحر و نیرنجات (occultism) نے ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور اس کی سوسائٹیاں مختلف مقامات پر موجود ہیں۔

علم السحر کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے حواس کی دنیا سے ماوراء ایک عالمِ مثال (Astral world) ہے جس میں تمام موجوداتِ عالم (افراد و حوادث) کے عکس موجود رہتے ہیں۔ وہاں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی تخصیص نہیں۔ ماضی اور حال کے افراد و حوادث کی طرح مستقبل کے افراد

---

[1] یہودیوں کے ہاں اس کا رواج کس طرح اور کس قدر ہوا، اس کا بیان بھی وہیں ملے گا۔

حوادث بھی اپنی عکسی صورت میں اس عالمِ مثال میں موجود رہتے ہیں اور وہاں سے اس کائنات کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ عالمِ مثال اور ہمارے اس حواس کی دنیا میں باہمی تعلق ایک آفاقی عامل (universal agent) کے ذریعہ قائم ہے۔ (اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ہمارے کرۂ ارض کے اردگرد ریڈیائی لہریں موجزن ہیں اور وہ ہر کہربائی حرکت کو ایک ثانیہ میں ہر مقام پہنچا دیتی ہیں)۔ یہی وہ عامل ہے جو ایک شخص کے خیالات کی دنیا کو دوسرے شخص کے "عالمِ تخیل" سے مربوط کئے ہوئے ہے، خواہ ان میں کتنا ہی بُعدِ مکانی کیوں نہ ہو۔ اب صرف کرنا یہ ہوتا ہے کہ اس عامل کو اپنا ہم نوا بنا لیا جائے۔ جو ایسا کرے، ماضی، حال اور مستقبل کی تمام قوتیں اس کے اشاروں پر ناچیں گی اور وہ وہ باتیں ظہور میں آئیں گی جو کسی کی عقل و فکر میں نہ آسکیں۔ اسی کا نام سحر، افسوں، طلسم، نیرنجات ہے۔ اس عامل سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے انسان کو اپنی داخلی قوتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ضروری ہے اور یہ ان ریاضتوں اور مشقتوں سے ہوتا ہے جو اس "سائنس" میں قدیم سے چلی آتی ہیں۔ یہ ہیں مختصراً وہ بنیادیں جن پر اس فن کی ساری عمارت قائم ہے۔ عام طور پر سمجھا ہی جاتا ہے کہ اس فن سے مقصود فقط شعبدہ بازی ہے لیکن اس کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ شعبدہ بازی تو محض راستے کے مناظر ہیں۔ یہ دراصل ادراکِ حقیقت کا ذریعہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک حقیقت وہی عالمِ مثال ہے اور اس کا ادراک اسی طریق سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے قدیم زمانہ میں فنِ سحر نے ایک مذہبی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ اور اب بھی مشرق میں اسے عام طور پر یہی حیثیت حاصل ہے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ اس فن کی تمام تر بنیاد اس پر ہے کہ انسان اپنی داخلی قوتوں کو اس قدر نظم و ضبط میں لے آئے کہ اس سے اس قسم کی خلافِ معمول (خارقِ عادات) باتیں ظہور میں آنے لگ جائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ "داخلی قوتیں" کیا ہیں جنہیں ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ان کا مطمحِ نگاہ ہوتا ہے۔

علمائے نفسیات (psychologists) کی تحقیق ہے کہ انسان کی قوتِ متخیلہ یا قوتِ ارادی (will power) کو مختلف طریقوں سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ غالب قوتِ ارادی والا انسان، اپنے سے کمزور قوتِ ارادی والے انسان کو اپنی قوت سے متاثر کر سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے حواس اس کی مرضی کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں، یعنی اس کی آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں جو یہ دکھانا

چاہے. اس کے کان وہی کچھ سنتے ہیں جو یہ سنانا چاہے وقس علیٰ ہذا. انسان کے حواس اس کے ذہن کے تابع ہوتے ہیں. آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ کسی گہری فکر میں مستغرق ہوں تو آپ کے سامنے سے کوئی گزر جائے تو آپ کو خبر تک نہیں ہوتی. حالانکہ آپ کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں. اس لئے قوّت غالب (الا انسان) در اصل کمزور قوت والے انسان کی دماغی قوت کو مغلوب کر لیتا ہے اور اس طرح اس کے حواس خود بخود اس کی قوت کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں. اب اگر یہ چاہے کہ ایک پتھر کا ٹکڑا اسے سونا بن کر دکھائی دے تو وہ اسے سونا ہی دیکھے گا اور سونا ہی سمجھے گا. یا یہ کہ اس کا دماغ درد کا احساس نہ کرے تو وہ اس کا احساس چھوڑ دے گا جیسے کلوروفارم کے اثر کے ماتحت دماغ سے قوتِ احساس معطل ہو جاتی ہے. یہ ہے وہ بنیاد جس پر سحر وافسوں کی تمام محیّر العقول اور نگاہ فریب عمارت استوار ہے. 'STEINER' اپنی کتاب (The way of Initiation) میں لکھتا ہے.

> ہر انسان میں ایسی مخفی قوتیں موجود ہیں جن کی رُو سے وہ عالمِ بالا کا علم حاصل کر سکتا ہے.... جب سے نوعِ انسان کی ابتدا ہوئی ہے ایسے اسکول موجود رہے ہیں جن میں وہ لوگ جن کی یہ قوتیں بلند سطح پر موجود تھیں، ان لوگوں کو یہ کچھ سکھاتے تھے جو اس کی تلاش میں تھے.

فنِ سحر کا بہت بڑا محقق (Eliphas Levi) لکھتا ہے.

> جس طرح جسمانی ورزشوں کے ذریعہ سے انسان اپنی جسمانی قوتوں کو محیّر العقول درجہ تک لے جا سکتا ہے اور قائم رکھ سکتا ہے، اسی طرح "روحانی" قوتوں کا حال ہے. کیا آپ اپنے آپ پر اور دوسروں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں؟ اگر چاہتے ہیں تو یہ سیکھئے کہ اپنی قوت ارادی کو کس طرح استعمال میں لایا جائے. فنِ سحر کا سب سے پہلا راز یہی ہے اور اس راز کی بنیادوں کو محکم بنانے کے لئے قدیم استادانِ فن نے یہ طریق اختیار کر رکھا تھا کہ اپنی خانقاہوں کے اردگرد ایسی ایسی نگاہ فریب اور بھیانک صورتیں پیدا کر چھوڑتے تھے کہ جو شاگرد اس فن کے سیکھنے کے لئے اس حلقہ میں داخل ہونا چاہتا اُس کی قوتِ ارادی کا پہلے ہی امتحان ہو جاتا اور اس کے بعد اسے ایسی ایسی مشقت آمیز ریاضتوں سے گزارا جاتا کہ جن سے اس کی قوت محکم سے محکم تر ہوتی جاتی.

ان بیانات کے پیشِ نظر EVELYN UNDERHILL نے اپنی کتاب Mysticism میں لکھا ہے. "فنِ سحر کے دورِ حاضرہ کے استادوں کے نظریہ کی رُو سے یہ فن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ

قوتِ ارادی کو اس کی عام حدود سے آگے بڑھا دیا جائے ...... لہٰذا سحر کاری یہی ہے کہ ذہن کو خاص نظم و ضبط کے ماتحت لا کر قوتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا جائے۔" جب قوتِ ارادی میں اس قسم کا نظم و ضبط پیدا کر لیا جائے تو کیا کیا کرشمے دکھا سکتی ہے، اس کے متعلق (Joy E.Towene اپنی کتاب Philisophy) میں لکھتا ہے۔

> ذرا تصور میں لایئے کہ یہ تمام کائنات اور ستاروں کا ہجوم سب کے سب چشم براہ ہیں کہ آپ انہیں کیا حکم دیتے ہیں۔ پھر تصور میں لایئے کہ آپ کو فقط ایک بٹن دبانا ہے اور اس کے بعد جو کچھ آپ کہیں گے، یہ کریں گے۔ جونہی آپ نے کہا کہ "میں یہ کچھ کر سکتا ہوں اور میں یہ کر کے دکھاؤں گا" کائنات کی تمام قوتیں آپ کے اشارے پر ناچنے کے لئے تیار ہوں گی۔

قوتِ ارادی کو بیدار اور مستحکم کرنے کے لئے عجیب و غریب طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز اسے ایک نقطہ پر مرکوز کرنا (concentration) ہے۔ اس کے لئے مراقبے کرائے جاتے ہیں۔ مختلف الفاظ اور فقرات کو خاص خاص طریقوں سے دہرایا جاتا ہے، بڑی بڑی مشقیں اور ریاضتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ 'LEVI' لکھتا ہے۔

> یہ تمام شکلیں اور ان کی مثل حرکات و سکنات، یہ تمام اعداد و شمار اور حروف و الفاظ، مقدس فقرے، منتر، تعویذ، سب کے سب قوتِ ارادی کی تربیت کے ذرائع ہیں جن سے یہ تمام قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور اس طرح متخیلہ کی تخلیقی قوتوں کو محکم بنا دیتی ہیں۔ ایک عمل خواہ وہ کتنا ہی توہم انگیز اور جہالت آمیز کیوں نہ نظر آتا ہو، مؤثر ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے قوتِ ارادی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

عملیات کے ذریعے مریضوں کے علاج کرنے کے متعلق یہی محقق لکھتا ہے۔

> عامل کی تمام قوت کا راز یہی قوتِ ارادی ہے اور اس کا کمال فقط یہ ہے کہ وہ مریض کے دل میں عقیدت پیدا کر دے۔

یہ ہے فنِ سحر کی بنیاد، یعنی قوتِ ارادی اور متخیلہ کے کرشمے۔ جس شخص پر اس قوت کو اثر انداز کیا جاتا ہے وہ وہی کچھ دیکھنے اور سمجھنے لگ جاتا ہے جو کچھ اسے دکھایا اور سمجھایا جائے، یعنی جو کچھ اسے دکھائی دیتا ہے وہ فی الواقع ایسا نہیں ہوتا بلکہ محض فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔

جہاں تک قرآن کی تعلیم کا تعلق ہے وہ **سحر** کی بڑی مذمت کرتا ہے (تفصیل اس کی حضرت سلیمانؑ کے قصہ کے ضمن میں سامنے آئے گی) اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جس انقلاب کی دعوت ہی علیٰ وجہ البصیرت دی جائے اور جس کا مقصد شرفِ انسانیت کی ایسی تکمیل ہو جس سے وہ اس کائنات کو بھی مسخر کرے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی سرفرازیوں کے مقامِ بلند پر فائز المرام ہو، وہ اس قسم کی توہّم پرستیوں اور شعبدہ بازیوں کو کس طرح بنظرِ استحسان دیکھ سکتا ہے جس سے قلب و دماغ کی صحیح صلاحیتیں سلب اور بازوؤں کی قوّتیں معطل ہو کر رہ جائیں؟ حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم، انسان کو ایک خاص منزل کی طرف لے جاتی ہے جو اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اس کے برعکس خود محققینِ یورپ کا اعتراف ہے کہ سحر انسان کو کسی منزل کی طرف نہیں لے جاتا، محض قوّتِ ارادی کی کرشمہ سازیوں میں کھو دیتا ہے۔

> سحر، خواہ یہ اپنی اصلی اور خالص صورت میں بھی کیوں نہ ہو، اس سے مقصود خارقِ عادات آفاقی چیزوں کو ظہور میں لانا ہے۔ یہ کسی منزل کی طرف انسان کی راہ نمائی نہیں کرتا۔
> (Mysticism: p.151)

مسلمان اور سحر کاری

لیکن بایں ہمہ مسلمانوں کو دیکھئے کہ کس طرح سحر و فسوں سازی سے لپٹے ہوئے چلے آرہے ہیں اور قیامت بالائے قیامت کہ خود اللہ کی کتاب کو اس شعبدہ گری کی آماجگاہ بنا رکھا ہے اور اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اس فن کا نام سحر سے کچھ الگ رکھ چھوڑا ہے اور یہ سمجھ رکھا ہے کہ فقط نام کی تبدیلی سے اشیاء کی ماہیت نہیں بدل جایا کرتی۔ پانی، پانی ہی ہے، خواہ اسے آب کہیئے یا ماء، جل کہیئے یا واٹر۔ کالا علم اور نوری علم دو الگ الگ نام رکھ لینے سے مختلف حقیقت کے علمبردار نہیں ہو سکتے۔ (ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں اس سے کتنی پیشانیوں پر شکن پڑ رہے ہیں اور کتنی آنکھوں کا رنگ لال ہو رہا ہے۔ لیکن جب ہم قرآنِ کریم کی روشنی میں علیٰ وجہ البصیرت دیکھ رہے ہیں کہ ان چیزوں میں سوائے نام کی تبدیلی کے اور کچھ فرق نہیں تو شکن آلود پیشانیوں اور خشم آگیں آنکھوں کے ڈر سے حقیقت کو کس طرح مسخ کر دیا جائے)۔ یہ اوراد و وظائف، یہ گنڈے تعویذ، یہ مراقبے اور ریاضتیں اسی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں جس کا ذکر اوپر سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیکن چونکہ یہ نام ایک زمانہ سے دامنِ تقدیس کے ساتھ وابستہ چلے آرہے ہیں، اس لئے مسلمان اسے سننا تک گوارا نہیں کر سکتا کہ اسے سحر کہہ دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ عقیدہ اس کے دل کی انتہائی گہرائیوں

میں جگہ پکڑ چکا ہے کہ سحر و فسوں سازی غیر اسلامی شعار ہے لیکن عملیات و وظائف اسلامی مسلک لیکن یہ حقیقت نہیں. جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ ایک فن ہے جسے ہر انسان، بلا لحاظ عقیدہ و مسلک، حاصل کر سکتا ہے. مختلف اقوام میں اس کے حصول کے مختلف طریقے ہیں. چونکہ جن لوگوں سے اس قسم کی محیّر العقول باتیں سرزد ہوتی تھیں، انہیں بڑی بڑی مافوق الفطرت قوتوں کا حامل سمجھا جاتا تھا اس لئے ان قوتوں کی تقدیس و عظمت دلوں میں گھر کر جاتی تھی. لہٰذا ازمنۂ قدیمہ سے اس قسم کی قوتیں اور مذہبی تقدیس لازم و ملزوم چلی آتی ہیں. ہندوؤں کے جوگی، بدھوں کے لاما، یہود و نصاریٰ کے رہبان اور دوسرے مذاہب کے فقیر منش لوگ، جو ان قوتوں کو حاصل کرتے ہیں ہمیشہ مذہبی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں. چنانچہ رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ ان باتوں کو مذہب کا انتہائی مقام قرار دے دیا گیا. اس لئے اس قسم کے لوگ انتہائی عزت و تکریم کے مستحق قرار پا گئے اور شرفِ انسانیت کے تمام شعبے اس سے ادنیٰ درجہ پر رہ گئے. اس وجہ سے یہ چیزیں زیادہ عام ہو گئیں اور عظمت و عقیدت کے حصول کا آسان ذریعہ قرار پا گئیں. اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان تمام لوگوں نے اسے دیدہ دانستہ دنیاوی مقاصد کے حصول کی خاطر، بطور مکر و فریب اختیار کیا تھا. ایسے لوگ بھی تھے جو اسے فی الواقع مذہب کا انتہائی مقام سمجھتے تھے اور یہی سمجھ کر انہوں نے اسے اختیار بھی کیا تھا. لیکن اس سے بھی اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی. جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ ایک فن ہے اور ہر شخص بطور فن اس کی تحصیل کر سکتا ہے. اگر ایک مسلمان، تا بہ کمر پانی میں کھڑا ہو کر سورۂ یٰسین کی بعض آیات کا ورد کر کے کچھ خاص قسم کی قوت حاصل کر سکتا ہے، تو ایک ہندو جوگی، اپنے طریق پر وید کے کسی منتر سے ویسی ہی قوت حاصل کر سکتا ہے. آپ ان کا نام مختلف رکھ لیجئے، اسے کالا علم اور اُسے نوری علم کہہ دیجئے لیکن جہاں تک اس فن کا تعلق ہے، حقیقت دونوں کی ایک ہے. یہ سب قوتِ ارادی کی تنظیم و انضباط کے ذرائع ہیں. بقول UNDERHILL "اس باب میں ذرائع کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے. اصل چیز تو قوتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ہے" (Mysticism: p.158) وظیفہ، گنڈہ، تعویذ یا قرآنی آیات کے عملیات کو دین سے کچھ واسطہ نہیں. یہ سب قوتِ ارادی کو مجتمع کرنے کے لئے مختلف ذرائع ہیں[1]

---

[1] مسٹر WHITE اپنی کتاب "The Occult Sciences" میں تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف قسم کی ریاضتیں، مراقبے، اوراد و وظائف کس طرح ایک ہی قسم کے نفسیاتی اثرات پیدا کرتے ہیں.

اوران کے نتائج (مثلاً امراض کا علاج وغیرہ) اسی قوت کے کرشمے۔ مشرق میں یہ طریقے بڑے مخفی رکھے جاتے تھے (اور ابھی تک رکھے جاتے ہیں) لیکن مغرب نے اسے ایک سائنس کی حیثیت سے عام کر دیا ہے امریکہ میں "Meni-Culture: New Thought" اور "New Consciousness" کے اسکول اور یورپ میں مختلف سوسائٹیاں اپنے اپنے طریقوں پر یہ سب کچھ سکھاتی پڑھاتی ہیں۔ لہٰذا، اسے قرآنی آیات کے "عمل" سے حاصل کیجئے یا یوگ کے ذریعہ یورپ کی سوسائٹیوں سے سیکھئے یا امریکہ کے مدرسوں سے، نتیجہ ہر صورت میں وہی برآمد ہو گا۔ لیکن جب آپ اسے دین اور دین کا بھی نچوڑ قرار دینگے اور وجۂ افضلیت خارقِ عادات باتیں تسلیم کریں گے، تو مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر مسلم (مثلاً ہندوؤں کے جوگی سنیاسی) ایسے ایسے محیّر العقول شعبدے دکھائیں گے جن کا جواب نہیں بن پڑے گا۔ آئے دن آپ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں جوگی نے اس قسم کی محیّر العقول بات دکھادی اور فلاں مقام پر اس قسم کی۔ لہٰذا اگر کسی مذہب کی حقانیت کی دلیل اس کے پیروؤں کے خارقِ عادات شعبدے ہیں تو دنیا میں اسلام کی برتری کا ثبوت مشکل ہو جائے گا۔ باقی رہا یہ کہ آپ کے ہاں کے شعبدے، کرامات ہیں اور دوسروں کے شعبدے محض سحرکاری کی "شیطنت"؛ تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ دوسرے لوگ یہی کچھ آپ کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم اس اسلام کو جس میں زندگی اور حرارت پائی جائے صحیح اسلام نہیں قرار دیتے۔ بلکہ صحیح اسلام اسے قرار دیتے ہیں جس میں اس قسم کی "روحانیت" کے کرشمے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے پیروں اور فقیروں یعنی "روحانی بزرگوں" کی عام طور پر تعریفیں کی جاتی ہیں اور بہت سے غیر مسلم ان کے معتقدین کے حلقہ میں بھی داخل ہو جاتے ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کے ان جلیل القدر مشاہیر کو کبھی بنظرِ استحسان نہیں دیکھیں گے جنہوں نے دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے نافذ کیا تھا۔ اس لئے کہ "روحانی بزرگوں" کو اسلام کا سچا پیرو قرار دے کر وہ ہر غیر اسلامی مذہب کو اسلام سے برتر نہیں تو کم از کم اس کے برابر ثابت کر سکتے ہیں اور اس طرح اس دعوے کا بلند آہنگی سے اعلان کر سکتے ہیں کہ "تمام مذاہب اپنی بنیادی صداقتوں کی رُو سے یکساں ہیں۔" لیکن دین کو ایک نظامِ زندگی قرار دے کر ایسا دعویٰ اور اس کا ثبوت ممکن نہیں۔

لے شریعت اور طریقت کی باہمی آمیزش کے مباحث پر نگاہ ڈالئے، ہر مقام پر طریقت کا پلڑا جھکا ہوا دکھائی دے گا۔

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے)

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں زیادہ طول طویل بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآنِ کریم نے بھی اپنے متعلق یہ کہا ہے کہ میری فلاں آیت یا فلاں لفظ کو اتنی مرتبہ دہرا لینے سے فلاں نتیجہ برآمد ہو جائے گا؟ جب قرآنِ کریم نے اپنے متعلق یہ نہیں کہا تو قرآن کا یہ مصرف انسانی دماغ کی اختراع کے سوا اور کیا ہوگا؟ باقی رہا یہ کہ "صاحب! جب ایسا کرنے سے یہ نتائج ہمارے سامنے آجائیں تو قرآنی آیات والفاظ میں ان قوتوں کی موجودگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی؟" لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، یہ فرض کر لینا حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ یہ نتائج محض قرآنی آیات والفاظ کے اوراد و وظائف سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ غیر قرآنی (اور بعض اوقات بالکل مہمل[1]) الفاظ و کلمات سے ایسے بلکہ اس سے بھی زیادہ محیّر العقول نتائج مرتب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے نتائج خواہ قرآنی الفاظ سے مرتب ہوں یا غیر قرآنی سے، بہرحال قوتِ ارادی کی کرشمہ سازیوں کا ہی نتیجہ ہیں جو اکتسابی طور پر ہر شخص حاصل کر سکتا ہے اور قرآن کریم سے اس کی کوئی سند نہیں مل سکتی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آیاتِ

قرآن کی عظمت

قرآنی سے اس قسم کے "روحانی" نتائج پیدا کر کے قرآن کی عظمت کو بلند کرتے ہیں، وہ درحقیقت سمجھتے نہیں کہ اس سے وہ قرآن کو اس کے صحیح مقام سے

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) اہلِ طریقت و معرفت کا بالعموم دعویٰ یہ ہے کہ شریعت محض ظاہری اعمال کا نام ہے۔ "روحانیت" جو مذہب کی غایت ہے، انہی کے ہاں ہے اور اس کا ثبوت اسی قسم کی خارقِ عادات باتوں سے پیش کیا جاتا ہے۔

[1] خود مسلمان بزرگوں کے ہاں ایسے ایسے اوراد و نقوش موجود ہیں، جو عجیب و غریب الفاظ پر مشتمل ہیں۔ دیوبند سے شائع ہونے والے رسالہ 'خالد' میں کسی بزرگ کی کتاب "عطاء المنان" کا ترجمہ مسلسل شائع ہوا کرتا تھا جس میں بڑے بڑے جلیل القدر بزرگانِ دین کے عملیات مذکور تھے۔ مثلاً ایک عمل یہ تھا۔

الٰہی بحرمۃ یملیخا۔ کسلمینا، کشفوطط، کشافطیونس۔ تبونس، افذ فطیونس۔ بوانس یوس وکلہم قطمیر و علی اللہ قصد السبیل ومنہا جائر ولو شاء لہدٰکم اجمعین۔ "ایک تعویذ یہ تھا" ھتّیٰ ھتّیٰ ھتّیٰ ھتّیٰ ھتّیٰ ھتّیٰ ھتّیٰ (بچوں کے گلے میں ڈال دیا جائے)۔ ایک اور عمل تھا۔ بسم اللہ علیقہ بلیقہ تلیقہ تلیقہ بحق لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ و علی ولی اللہ (فائدہ) بغرض اجرائے حاضرات ایک چلتا ہوا عمل ہے۔ جب اس قسم کے الفاظ و کلمات سے بھی وہی نتائج مرتب ہو سکتے ہیں تو پھر قرآنی آیات کی کیا تخصیص ہے؟

کس قدر پست سطح پر لے آتے ہیں. جس شخص کے قلب سلیم کو اللہ تعالیٰ نے متاعِ ایمان سے بہرہ یاب اور اس کی نگاہوں کو نورِ بصیرت سے سرفراز فرمایا ہو وہ جب خدائے حیّ و قیوم کی اس زندہ و پایندہ کتاب کی عظمتوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کے جبروت و جلال کے سامنے تھرتھرا اٹھتا ہے. اس عظیم المرتبت ضابطۂ خداوندی کی شوکت و سطوت کے پیشِ نظر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے. اس سراجِ منیر کی درخشندگی کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے. وہ جب تدبر و تفکر سے اس کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو حقائق و معارف کی ایک نئی دنیا اس کے سامنے جلوہ بار ہوتی ہے. اگر کسی کتاب کی رفعتِ شان کا اندازہ اس کے "مصنف" سے لگایا جا سکتا ہے تو اس کتابِ حکیم کی بلندیٔ منزلت کا کیا پوچھنا جس کا "مصنف" خود خدائے علیم و بصیر ہو. اگر اس کی تقدیس کا جائزہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا محمل کون ہے تو اس کتاب مقدس و مبارک کا کیا کہنا جس کا مہبط اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کا قلبِ منور تھا جو معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم تھی. اگر اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس کے شمولات سے کیا جا سکتا ہے تو اس زندہ و پایندہ کتاب کے علومرتبت کا کیا اندازہ جس کے اصولوں کے ماتحت نظامِ کائنات سرگرمِ عمل ہو اور جس کے قوانین، اقوام و ملل عالم کی موت و حیات کے فیصلے کر رہے ہوں. اور پھر اگر اس نسخۂ تکوینِ حیات کی ارجمندی کی قدر و قیمت اس کی تعلیم کے نتائج سے پہچانی ہو، تو اس کے متعلق پوچھئے سرزمین عرب کے ان ذرات سے، جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ایک اونٹ چرانے والی بادہ نشین قوم، دیکھتے ہی دیکھتے، قیصر و کسریٰ کی دولت و ثروت کی وارث بن گئی اور مکارمِ اخلاق کے اس مقامِ بلند پر فائز ہو گئی جو آج تک چشمِ عالم کو دیدۂ حیراں بنا رہا ہے. حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں بلکہ ایک برقِ خاطف تھی جو فاران کی بدلیوں سے چمکی اور ہر طاغوتی قوت راکھ کا ڈھیر بنا گئی. ایک شمشیر برہنہ تھی جو فضائے عالم میں کوندی اور ہر اس زنجیر کو کاٹ کر الگ کر گئی جس نے انسانیت کو غیر خداوندی بندشوں میں جکڑ رکھا تھا. یہ تھی وہ کتابِ حکیم جو مسلمانوں کو اس لئے دی گئی تھی کہ وہ اسے قیامت تک کے لئے اپنا نصابِ زندگی بنائیں اور اس کے قوانین کے تابع چلیں. لیکن ذرا غور کیجئے کہ اگر کوئی مریض کسی طبیب سے سر درد کا نسخہ

قرآن کا غلط مصرف

لے تو اس کا فائدہ اسی صورت میں ہو گا کہ اس نسخہ کے مطابق دوائیاں خرید کر انہیں حسبِ ہدایت استعمال کرے. لیکن اگر وہ اس کاغذ کو جس پر وہ نسخہ لکھا ہے سبز کپڑے میں سی کر، سر پر باندھ لے تو اس کی اس حرکت پر عقل ہنسے گی اور

علم رو ہے گا۔ پھر سوچیے کہ اگر کوئی شخص تعزیراتِ پاکستان کی اس دفعہ کے الفاظ کو جس میں (مثلاً) لکھا ہے کہ چوری کی سزا تین سال کی قید ہے' دس ہزار مرتبہ پڑھ کر پھونکے کہ اس سے چور کا سراغ مل جائے گا تو اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ قرآنِ کریم قوموں کے امراضِ کہن کا نسخۂ کیمیا ہے، ایک ضابطۂ قوانین ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو انفرادی اور اجتماعی شرف و مجد حاصل ہو جاتا ہے. لیکن اگر اس نسخۂ کیمیا کو کاغذ پر زعفران سے لکھ کر گھول گھول کر پیا جائے یا اس ضابطۂ قوانین کی مختلف دفعات کے چلے کاٹے جائیں تو اس سے بڑھ کر اس کتابِ حکیم کا غلط مصرف اور کیا ہو گا؟

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس قسم کی کرامات پسندی سے انسانی فضیلت کا معیار کس طرح بدل جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے انسان کی فضیلت کا سب سے بڑا معیار تقویٰ ہے، یعنی یہ کہ اس کی زندگی کس قدر قوانینِ خداوندی کے مطابق ہے. لیکن آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص نہایت بلند سیرت و بلند کردار ہو' وہ گمنامی کی زندگی جیئے گا. کوئی اس کی طرف رجوع نہیں کرے گا. اس کے برعکس' ایک شخص کسی خانقاہ میں بیٹھا بھنگ کی لہروں اور چنڈو کی موجوں میں مستغرق ہو، لیکن اگر وہ سٹہ کا نمبر صحیح بتا دے تو جیتے جی مرجع انام رہے گا اور مرنے کے بعد اس کی قبر کی پرستش ہو گی. یہ کیوں؟ اس لئے کہ معیارِ فضیلت' سیرت و کردار کی بلندی نہیں بلکہ شعبدہ بازی قرار پا چکا ہے. اب اگر کسی ایسے شخص سے اس قسم کے شعبدات ظہور میں آتے ہیں جو بے باکانہ لغو زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی لغویت پر طرح طرح کے پردے ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ اس کی "بزرگی" کی شان میں فرق نہ آنے پائے. اس قسم کے لوگوں کی عقیدت و عظمت کچھ اس طرح غیر شعوری طور پر قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے کہ بڑے بڑے اربابِ علم و فضل' ان کی شان میں گستاخی کا کلمہ زبان تک لاتے خوف کھاتے ہیں. گویا ان لوگوں کو محکمۂ قضا و قدر میں ایسا دخل حاصل ہے کہ نہ معلوم ان کی سُوءِ ادبی سے کتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی. اس غلط معیارِ فضیلت سے قوانینِ الٰہیہ کی جو قدر و قیمت دلوں میں رہ سکتی ہے' وہ ظاہر ہے۔

ایسے حضرات بھی ہیں جو اگرچہ شریعت کے پابند ہیں لیکن معیارِ فضیلت اسی قسم کی چیزوں کو قرار دیتے ہیں. آپ دیکھیں گے کہ ان کی "پرستش" میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی. اگرچہ زبان سے سب یہی کہتے ہیں کہ ہم کبھی لوگوں کو اس قسم کی باتوں کی جرأت نہیں دلاتے لیکن وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ لوگ کس طرح انہیں اور ان کے بزرگوں کو قبلۂ حاجات و کعبۂ مقصود سمجھتے ہیں لیکن بایں ہمہ'

وہ ایک لفظ اس کے خلاف نہیں کہتے اور اگر وہ بفرضِ محال' زبان سے اس کی مخالفت بھی کریں تو بھی اس کا کیا اثر ہے جب وہ اپنے عمل سے لوگوں کو خود انسان پرستی کی طرف دھکیل کر لاتے ہیں۔ ان کے ماننے والوں کے دلوں میں یقیناً خدا کی ایسی عظمت و عقیدت نہیں ہوتی جتنی خود ان حضرات کی ہوتی ہے' اس لئے کہ وہ اپنی ہر مشکل میں انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور گو کہتے یہی ہیں کہ ہم ان کے "واسطہ" سے اپنی درخواست خدا تک پہنچاتے ہیں (جو خود ایک غیر قرآنی عقیدہ ہے) لیکن فی الحقیقت اپنی مرادوں کا منبع انہیں بزرگوں کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کا خدا کے ساتھ وہ تعلق کبھی نہیں رہ سکتا جو قرآنِ کریم قائم کرنا چاہتا ہے۔ سنیئے کہ اس باب میں غیر مسلموں کی شہادت کیا ہے۔

> اگر گہرائیوں میں اُتر کر دیکھئے تو عملیات کا ہر طالب اس مقام کی طرف جدوجہد کرتا دکھائی دے گا جہاں وہ صرف بٹن دبا دے اور باقی سب کچھ آفاقی قوتیں خود بخود کر دیں۔ وہ جب بہ ہزار مشقت اس قسم کی قوت حاصل کر لیتا ہے جس سے وہ بہت سوں پر غالب آجائے تو اس سے اس ایک کو بھول جانے کی طرف میلان ہو ہی جاتا ہے۔ (LEVI کے الفاظ میں) "فطرت کے امور کا بہت گہرا مطالعہ اس قسم کے غیر محتاط متجسس کو خدا سے بے گانہ بنا دیتا ہے۔ کیونکہ اس کی دماغی تکان اس کے ارتعاشِ قلب کو مفلوج کر دیتی ہے۔
>
> (Mysticism, by Underhill)

خانقاہیت کا جمود انگیز مشرب

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس خانقاہ نشینی کے طلسم نے جس طرح مسلمانوں جیسی یکسر برق تپاں قوم کو جمود و تعطل کے بیکار مجسمے بنا کر رکھ دیا ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ عمل بالقرآن نے وہ قوم پیدا کی تھی جس کے ہاتھ میں اقوامِ عالم کی "تقدیریں" تھیں، جن کی نگاہوں سے موت کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا .... جن کی ہیبت سے مصائب و مشکلات کی پیشانی پر پسینہ آجاتا تھا۔ وہ جس طرف باگیں اٹھاتے' فتح و ظفران کی رکاب تھامتی۔ وہ جدھر رُخ کر لیتے' کامرانی و کامیابی اُن کا بڑھ کر استقبال کرتی۔ وہ قوم جو "اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کسی دوسری طاقت کو حائل نہ ہونے دیتی"؛ وہ جو اپنے تمام عزائم و مراحل میں' اپنی قوتِ بازو اور قوانینِ خداوندی کی تائید کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ نہ کرتی، یہ تھی وہ قوم جسے قرآنِ کریم نے دنیا میں قوانین الٰہیہ کی تنفیذ و ترویج کے لئے

پیدا کیا تھا. لیکن (UNDERHILL کے الفاظ میں) اس منزل کی تلاش نے، جہاں انہیں صرف بٹن دبانا پڑے اور باقی سب کچھ غیر معلوم آفاقی قوتیں ان کے لئے خود بخود کریں، اس قوم کو رفتہ رفتہ ایسی حالت میں پہنچا دیا کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں دوسروں کے آسرے ڈھونڈنے لگ گئے اور قدم قدم پر اس طرح غیروں کے محتاج ہوئے کہ ہر شخص انہیں ذلیل و خوار سمجھے. یہ سب اس لئے کہ وہ کشمکشِ حیات میں مردانہ وار حقائق کا سامنا کرنے کے بجائے، کامیابی و کامرانی کے لئے کشف و کرامات کے "سم سم" کے پیچھے پڑ گئے اور اس طرح وہ تمام زندہ کرامتیں جو خود ان کے دست و بازو سے ظہور میں آتی تھیں افسانے بن کر رہ گئیں. بقول علامہ اقبالؒ.

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا

آزاد کا ہر لحظہ ہے اک زندہ کرامات

اس کا نتیجہ یہ کہ آج دنیا میں مسلمان سے زیادہ نکمّی اور اپاہج قوم شاید ہی کوئی اور ہو. یہ ہے مآل اس "اعجوبہ پسندی" کا جسے ان کے فریب نگاہ نے بڑے بڑے مقدس غلافوں میں لپیٹ کر رکھا ہے اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ اسلام جیسا زندہ اور زندگی بخش نظامِ حیات دھرم بن کر رہ گیا ہے. چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ وہ عظیم المرتبت مجاہدینِ اسلام جن کے ایمان کی حرارت نے فضائے کائنات میں تموج پیدا کر دیا' مسلمانوں کے ذہن سے عام طور پر اُتر چکے ہیں. لیکن وہ بزرگ جن کی طرف اس قسم کی جتنی کرامات منسوب ہیں ہر وقت ان کے قلب و نگاہ کے سامنے رہتے ہیں. یقین مانیئے! یہ سب کشمکشِ حیات میں اعترافِ شکست ہے. کشاکشِ زندگی میں سپر اندازی ہے' دنیائے عمل و حقیقت سے فرار کی راہ ہے. دنیا میں سب سے بڑی کرامت وہ ہے جو جماعتِ مومنین کی قوتِ بازو سے ظہور پذیر ہو اور جس کا عملی نتیجہ اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا قیام. اس کرامت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی کرامت نہیں. وہ کرامت جس سے جہانِ انسانیت میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ جائے اور اس طرح یہ زمین "اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے."

ہمارے ہاں اس مسلک کو "تصوّف" کہہ کر پکارا جاتا ہے. تصوّف کی تاریخ بیان کرنے کا یہ مقام نہیں. (اسے میں نے اپنی کتاب "تصوّف کی حقیقت" میں واضح کیا ہے) اس مقام پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "تصوّف" (اقبالؒ کے الفاظ میں) "سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے". (مکاتیبِ اقبال).

یہ فی الواقع ایک غیر اسلامی تصوّر ہے جسے ہم نے دوسروں سے مستعار لیا تھا۔ اسلام ایک نظام ہے جس میں اس قسم کے مسالک کی کوئی گنجائش نہیں۔

بعض حضرات (حقائق سے مُنہ موڑنے کے لئے) تصوّف کی دو قسمیں بیان کر دیتے ہیں، یعنی اسلامی تصوّف اور غیر اسلامی (عجمی) تصوّف۔ لیکن جب تصوّف اپنی اصل کے اعتبار سے "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے" تو اسے اسلامی اور غیر اسلامی میں تقسیم کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اسلام، اسلام ہے اور بس۔ یہ ایک نظامِ مملکت ہے، نظامِ حکومت ہے، ضابطۂ زندگی ہے جسے اس قسم کی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں یا کشف و کرامات کی بھُول بھلیوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآنِ کریم سے ان امور کی کوئی سند نہیں ملتی۔

جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ سحر کی اصلیت کیا ہے اور وہ کس طرح لوگوں کی نگاہوں کو فریب دیتا ہے۔ اس فریب کے علاوہ اس کی بنیاد کچھ نہیں۔ اس لئے قرآن کریم میں لفظ سحر، جادو کے علاوہ، جھوٹ کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

سحر بمعنی جھوٹ

سورۂ ہود میں ہے۔

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ

لے سر جیمس فریزر لکھتا ہے

Magic is a spurious system of Natural law as well as a fallacious guide of conduct; it is false science as well as abortive art.

(The Golden Bough)

ذرا غور فرمایئے! قرآن کریم نے جس حقیقت کو آج سے چودہ سو سال پہلے بے نقاب کیا تھا علمی تحقیقات اس کی کس طرح حرف بحرف تصدیق کئے چلی جا رہی ہیں۔ قرآن نے سحر کو باطل، جھوٹ، بناوٹ، فریب قرار دیا ہے اور تحقیق کے بعد اس فن کی حقیقت بھی یہی ثابت ہوئی ہے۔ اسے زندگی کے حقائق سے کچھ تعلق نہیں۔

الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ○ (۱۱/۷)

اور (اے پیغمبرؐ!) اگر تو ان لوگوں سے کہے "تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے" تو جو لوگ منکر ہیں

وہ ضرور بول اٹھیں "یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے"۔

مادہ پرستوں کے نزدیک حیات بعد الممات (معاذ اللہ) ایک کھلا ہوا جھوٹ یا فریب ہے. دوسری جگہ ہے کہ جب انھیں جہنم کی طرف لایا جائے گا، تو پوچھا جائے گا کہ کہو! یہ بھی جھوٹ ہے یا سچ مچ کچھ سامنے نظر آرہا ہے.

یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ○ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ (۵۲/۱۵-۱۳)

(اور دیکھو) جس روز انہیں آتشِ دوزخ کی طرف دھکے دے کر لایا جائے گا (تو ان سے کہا جائے گا)

یہ وہی آگ ہے جسے تم (دنیا میں) جھٹلایا کرتے تھے (اور پوچھا جائے گا کہ کہو) یہ بھی جھوٹ ہی ہے

یا کیا تم (سچ مچ) کچھ دیکھ رہے ہو؟

سحر (جھوٹ) کی تشریح، تکذبون (جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے) نے کردی. کفار، قرآنِ کریم کو بھی سحر (جھوٹ) کہا کرتے تھے اس لئے کہ اگر وہ اس کے وحی ہونے کے دعوے کو سچا تسلیم کر لیتے تو پھر کفر باقی کس طرح رہ سکتا! سورۃ انبیاء میں ہے.

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○ (۲۱/۳)

اور دل ہیں کہ یکقلم غافل. اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کیں "یہ آدمی

اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو

جہاں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں؟"

سورۃ احقاف میں اس کی وضاحت یوں فرمادی.

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا

تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۸/۴۶ - ۷﴾

اور (دیکھو) جب ان کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو نافرمان لوگ حق کے بارہ میں، جب وہ ان کے پاس آتا ہے، تو کہنے لگتے ہیں "یہ تو کھلا جھوٹ ہے" بلکہ وہ (اور آگے بڑھتے ہیں اور) کہتے ہیں۔ "محمدؐ نے اسے خود ہی گھڑ لیا ہے"۔ (تو اے پیغمبرِ اسلام!) تم کہہ دو "اگر میں نے خود ہی اسے گھڑ لیا ہے تو تم لوگ مجھے خدا (کے عذاب) سے ذرا بھی نہیں بچا سکتے۔ جو باتیں تم بناتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔ وہ میرے اور تمہارے درمیان کافی گواہ ہے اور وہ بڑا ہی مغفرت کرنے والا اور بہت ہی مہربان ہے۔

کفار کے اس قول کو چند آیات کے بعد "اِفْكٌ قَدِيمٌ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ ۚ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴿۱۱/۴۶﴾

اور دیکھو یہ نہ ماننے والے لوگ ایمان لانے والوں کے متعلق کہنے لگے۔ اگر یہ (قرآن) کوئی بھلائی کی چیز ہوتا، تو وہ (کمتر درجہ کے لوگ) اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کر سکتے اور چونکہ (نافرمان لوگوں) کو قرآن سے ہدایت نہیں ملی ہے تو وہ اب جلد ہی پکار اٹھیں گے "یہ تو وہی پرانا جھوٹ ہے"۔

ولید نے اسی کو "سِحْرٌ يُؤْثَرُ" کہا تھا یعنی ایک انسان کا کلام ہے اور وحی کا دعویٰ (معاذاللہ) وہ جھوٹ ہے جو اسی طرح سے چلا آ رہا ہے۔ (۲۴ - ۲۵/۷۴ نیز ۴۳/۳۴)

سورۂ زخرف میں ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ ﴿

(۳۰/۴۳) (نیز ۶/۶۱ و ۲/۱۰ و ۴/۳۸)

اور (دیکھو) جب حق ان کے سامنے آتا ہے تو وہ کہتے ہیں "یہ تو جھوٹ ہے اور بیشک ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں۔

ہر زمانے کے کفار اپنے نبی کے متعلق یہی کہتے۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۚ (۵۱/۵۲)

(بالکل) اسی طرح ان سے پہلی امتوں کے پاس بھی خدا کا کوئی رسول نہیں آیا مگر لوگوں نے (اسکی نسبت) یہی کہا کہ (یہ شخص) یا تو جھوٹا ہے یا پھر پاگل ہے۔

کفار حضرات انبیاء کرامؑ کو ساحر[1] (جھوٹا یا فریبی) کہتے لیکن جب دیکھتے کہ وہ دنیا جہان سے نرالی باتیں کرتے ہیں، (یعنی ایسی باتیں جو ان کے مسلک و آئین یا ان کے اسلاف کی روشِ کہن کی رُو سے نرالی ہوتیں) تو وہ اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق یہ سمجھتے کہ ان کی یہ (معاذاللہ) بہکی بہکی باتیں کسی کے سحر کا اثر ہیں۔

قوم ثمود نے حضرت صالحؑ سے کہا۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۚ (۲۶/۱۵۳)

تو وہ کہنے لگے "اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے" (جو تو یوں بہک گیا ہے)۔

اسی طرح حضرت شعیبؑ سے کہا گیا۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۙ (۲۶/۱۸۵)

لوگوں نے کہا اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (کہ تم یوں بہک گئے ہو)۔

اور ذاتِ رسالت مآبؐ کے متعلق بھی۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا[2] ۝ (۱۷/۴۷)

جب یہ لوگ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جو کچھ ان کا سننا ہوتا ہے اسے ہم اچھی طرح

---

[1] کذب اور سحر دونوں کا مطلب جھوٹ ہے۔ کذب کسی واقعہ کے متعلق خلاف بیان یا جھوٹ اور سحر باطل کو حق بنا کر پیش کرنے کا فریب۔ جھوٹ لفظ تو چھوٹا سا ہے لیکن ابلیسیت کے تمام حربے اس کے اندر سما جاتے ہیں۔

[2] مسحور بمعنی ساحر (جھوٹا) بھی آسکتا ہے۔

جانتے ہیں اور جب یہ ظالم باہم سرگوشیاں کرتے ہوئے کہتے ہیں" تم جس آدمی کے پیچھے پڑے ہو، وہ اس کے سوا کیا ہے کہ اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے"۔

نبی اکرمؐ کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کفار کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) یہ شخص مسحور ہے اس پر کسی کے جادو کا اثر ہے۔ لیکن بدبختی کہ خود مسلمانوں کے یہاں بھی یہ عقیدہ موجود ہے کہ حضورؐ (معاذ اللہ) مسحور تھے۔ چنانچہ بخاری شریف میں یہ روایت موجود ہے۔

عَنْ عائشۃؓ قالت سحر النبی حتّٰی کان یخیل الیہ انّہ فعل شیئًا وما یفعلہ حتّٰی کان یوم دعا و دعا ثم قال اشعرت ان اللہ افتا نی فیما فیہ شفائی اتانی رجلان فقعد احدھما عند رأسی والاٰخر عند رجلی۔ فقال احدھما للاٰخر ما وجع الرجل قال مطبوب۔ قال ومن طبہ قال لبید ابن الاعصم۔ قال فیما ذا۔ قال فی مشط ومشاقۃ وجف طلعۃ ذکر قال فاین ھو قال فی بئر زروان۔ فخرج الیھا النبی ثم رجع فقال لعائشۃ حین رجع نخلھا کانھا رؤس الشیاطین فقلت استخرجۃ فقال لا اما انا فقد شفانی اللہ وخشیت ان یثیر ذالک علی الناس شرًا ثم دفنت البئر۔ (بخاری جلد دوم ص ۱۲۷)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ پر ایسا جادو کیا گیا تھا کہ آپ خیال کرتے تھے کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ آپؐ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔ ایک روز حضورؐ نے دعا کی، پھر دعا کی۔ دعا کے بعد مجھ سے فرمایا، عائشہؓ تم کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے وہ حکم دیا ہے جس میں میری شفا کا راز (مضمر) ہے۔ میرے پاس (خواب میں) دو آدمی آئے۔ ایک میرے سرہانے بیٹھا، دوسرا پائنتی۔ ایک دوسرے سے بولا اس شخص کو کیا بیماری ہے؟ دوسرے نے کہا اس پر جادو کیا گیا ہے۔ پہلا شخص بولا کس نے کیا ہے؟ دوسرے نے کہا لبید ابن اعصم نے۔ پہلے نے پوچھا کس چیز میں کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کنگھی میں اور کنگھی سے جھڑے ہوئے بالوں میں اور نر چھوارے کے غلاف میں۔ پہلا بولا یہ چیزیں کہاں رکھی ہیں۔ دوسرا بولا چاہِ زروان میں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ

زرواں پر تشریف لے گئے اور لوٹ کر مجھ سے فرمایا کہ اس کنوئیں کے کھجور شیطانوں کی سروں کی طرح ہیں. میں نے کہا کہ کیا حضورؐ نے جادو کی چیز وہاں سے نکال ڈالی؟ فرمایا نہیں لیکن اللہ نے مجھے صحت عطا فرما دی. مجھے خوف ہوا کہ کہیں لوگ اس فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں اس کے بعد وہ کنواں پاٹ دیا گیا۔

صاف نظر آتا ہے کہ معاندینِ اسلام نے اس قسم کی روایات مشہور کر رکھی تھیں. لیکن ان پر کیا گلہ؟ ان کا تو کام ہی یہ تھا. لیکن مسلمانوں کو دیکھئے کہ ہزار برس سے ایسی ایسی چیزوں کو اپنے سینے سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں. اور اگر کسی کی غیرتِ ایمانی اور بصیرتِ قرآنی نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف اس قسم کی باتیں منسوب کرنا گوارا نہ کرے تو اس پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

۸۔ واقعۂ خضر حضرت موسیٰؑ کے تذکرۂ جلیلہ کے ضمن میں قرآنِ کریم میں ایک اور واقعہ بھی مذکور ہے جسے عام طور پر حضرت موسیٰؑ اور "خضر" کی ملاقات کہا جاتا ہے حالانکہ قرآنِ کریم میں اس بزرگ کا نام نہیں آیا. قوم کی اعجوبہ پسندی نے عجیب و غریب قصے ان کی طرف منسوب کر رکھے ہیں جن پر ہماری شاعری اور ہماری افسانوں کی ایک دنیا قائم ہے. اصل واقعہ صرف اتنا ہے جو سورۂ کہف کی آیات ۶۰ لغایت ۸۲ میں مذکور ہے جس میں فرمایا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝ (۱۸/۶۰)

اور موسیٰ نے اپنے ساتھی (خادم) سے کہا "میں اپنی کوشش سے باز آنے والا نہیں جب تک اس جگہ نہ پہنچ جاؤں جہاں دونوں سمندر (یا دریا) آملے ہیں، میں تو (اپنی راہ) چلتا ہی رہوں گا.

قرآن نے حضرت موسیٰؑ کے اس ساتھی کا نام نہیں بتایا. اس کے بعد ہے.

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ سَرَبًا ۝ (۱۸/۶۱)

پھر جب دونوں سمندروں (یا دریاؤں) کے ملنے کی جگہ پہنچ گئے، تو اس مچھلی کا انہیں خیال

نہیں رہا جو اپنے ساتھ رکھ لی تھی۔ (مچھلی ہنوز زندہ تھی) اس نے سمندر میں جانے کے لئے سُرنگ کی طرح ایک راہ نکال لی۔

اس سے آگے بڑھے تو کھانے کا وقت قریب آگیا۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ز لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ٥ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ز وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ج وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ صلے عَجَبًا ٥ (۱۸/۶۲-۶۳)

جب وہ آگے بڑھے، تو موسےٰ نے اپنے آدمی سے کہا" آج کے سفر نے ہمیں بہت تھکا دیا۔ لاؤ صبح کا کھانا کھا لیں۔ اس نے کہا، کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ جب ہم (دریا کے کنارے) چٹان کے پاس ٹھہرے تھے، تو مجھے مچھلی کا کچھ خیال نہیں رہا تھا۔ اس نے عجیب طریقے پر دریا کی راہ نکال لی (تعجب ہے کہ میں آپ سے اس کا) ذکر کرنا بالکل بھول گیا اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ یہ شیطان کا کام تھا۔

اس پر حضرت موسےٰ نے فرمایا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ صلے فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ٥ (۱۸/۶۴)

موسےٰ نے کہا، اب مجھے خیال پڑتا ہے کہ جس مقام کی تلاش میں ہم نکلے تھے وہ وہی تھا۔ چنانچہ وہ الٹے پاؤں لوٹ گئے۔

جب آپ واپس لوٹے تو اللہ کے ایک بندے سے ملاقات ہوئی۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ٥ (۱۸/۶۵)

(پھر جب چٹان کے پاس پہنچے) تو انہیں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ مل گیا۔ اس شخص پر ہم نے خصوصیت کے ساتھ مہربانی کی تھی۔ اسے اپنے پاس سے (وحی کا) علم عطا فرمایا تھا۔

حضرت موسیٰؑ نے آپ کی معیت کی خواہش کی۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ

تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ○ (۱۸/۶۶)

موسیٰؑ نے اس سے کہا "آپ اجازت دیں تو آپ کے ساتھ رہوں، بشرطیکہ جو علم آپ کو اس خوبی کے ساتھ عطا کیا گیا ہے، اس کی کچھ تعلیم مجھے بھی دے دیں۔

اس پر انہوں نے کہا کہ مجھے اس پر تو اعتراض نہیں لیکن اس تھوڑے سے عرصہ میں میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ تم بڑے جلد باز واقع ہوئے ہو اس لئے تم ضبط اور تحمل سے کام نہیں لے سکو گے۔

قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ○ (۱۸/۶۷)

اس نے جواب دیا" ہاں، مگر تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہ کر سکو گے"۔

اس لئے کہ

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ○ (۱۸/۶۸)

جو بات تمہاری سمجھ سے باہر ہو گی جب تم اُسے دیکھو گے تو صبر نہیں کر سکو گے، جلدی مچا دو گے۔

لیکن حضرت موسیٰؑ نے وعدہ کیا کہ آپ اپنی بیتابیٔ تمنا کو اپنے سینے میں تھامے رکھیں گے اور ان کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ چنانچہ وہ اس پر راضی ہو گئے اور تاکید کر دی کہ

قَالَ سَتَجِدُنِيٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ صَابِرًا وَلَآ أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ○ قَالَ فَإِنِ ٱتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْـَٔلْنِي عَن شَيْءٍ حَتَّىٰٓ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ○ (۱۸/۶۹-۷۰)

موسیٰ نے کہا " اگر خدا نے چاہا، تو آپ مجھے متحمل مزاج پائیں گے۔ میں آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔" اس نے کہا، " اچھا اگر تمہیں میرے ساتھ رہنا ہی ہے تو اس بات کا خیال رکھو کہ جب تک میں خود تم سے کچھ نہ کہوں، تم کسی بات کی نسبت سوال نہ کرنا۔

چنانچہ اب ایک نیا سفر شروع ہوا۔

فَٱنطَلَقَا حَتَّىٰٓ إِذَا رَكِبَا فِي ٱلسَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۖ قَالَ أَخَرَقْتَهَا

لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ○ (۱۸/۷۱)

پھر ایسا ہوا کہ دونوں سفر میں نکلے۔ یہاں تک کہ سمندر (دریا) کے کنارے پہنچے اور کشتی میں سوار ہوئے۔ اب موسےٰ کے ساتھی نے یہ کیا کہ کشتی میں ایک جگہ دراڑ ڈال دی۔ یہ دیکھتے ہی موسےٰ بول اُٹھا۔ "آپ نے کشتی میں دراڑ ڈال دی کہ مسافر غرق ہو جائیں؟ آپ نے کیسی خطرناک بات کی۔"

لیجئے! پہلے ہی واقعہ پر ضبط نہ ہو سکا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ○ (۱۸/۷۲)

اس نے کہا" کیا میں نے نہیں کہا تھا، تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے؟"

حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ مجھ سے بھول ہو گئی، معاف کر دیجئے۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَ لَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ○ (۱۸/۷۳)

موسیٰ نے کہا" بھول ہو گئی اس پر نہ پکڑیئے۔ ایک بات بھول چوک میں ہو جائے تو آپ سخت گیری کیوں کریں۔

چنانچہ وہ پھر آگے بڑھے اور ایک اور واقعہ پیش آگیا۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ○ (۱۸/۷۴)

پھر وہ دونوں آگے چلے۔ یہاں تک کہ (ایک بستی کے قریب پہنچے اور) انہیں ایک لڑکا ملا۔ موسیٰ کے ساتھی نے اسے قتل کر ڈالا۔ اس پر موسیٰ بول اٹھا، آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی۔ حالانکہ اس نے کسی کی جان نہیں لی تھی۔ آپ نے کیسی برائی کی بات کی۔

اس پر انہوں نے پھر کہا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ○ (۱۸/۷۵)

اس نے کہا، کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا، تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔

حضرت موسےٰؑ نے عرض کیا کہ اس مرتبہ اور درگذر کر دیجئے۔ اگر اس کے بعد پھر ایسا کروں تو بیشک مجھے اپنی معیت سے الگ کر دیجئے۔

قَالَ إِن سَأَلْتُكَ عَن شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي ۖ قَدْ بَلَغْتَ مِن لَّدُنِّي عُذْرًا ○ (۱۸/۷۶)

موسیٰ نے کہا " اگر پھر میں نے کچھ پوچھا، تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیئے گا۔ اس صورت میں آپ پوری طرح معذور سمجھے جائیں گے۔

اب آگے بڑھے تو ایک واقعہ اور پیش آگیا جو پہلے دو واقعات سے بھی زیادہ تحیر انگیز تھا۔

فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَن يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَن يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ ۖ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ○ (۱۸/۷۷)

وہ دونوں اور آگے بڑھے یہاں تک کہ ایک گاؤں کے پاس پہنچے۔ گاؤں والوں سے کہا، ہمارے کھانے کا انتظام کردو۔ انہوں نے مہمان نوازی کرنے سے صاف انکار کردیا پھر ان دونوں نے دیکھا، گاؤں میں ایک (پرانی) دیوار ہے اور گرا چاہتی ہے۔ یہ دیکھ کر موسےٰ کے ساتھی نے (اس کی مرمت شروع کردی اور) اُسے ازسرِنو مضبوط کردیا۔ اس پر موسیٰ (سے نہ رہا گیا) بول اٹھا " اگر آپ چاہتے تو اس محنت کا کچھ معاوضہ ان لوگوں سے وصول کرتے۔" (بغیر معاوضہ کے بیکار کی محنت کیوں کی؟)

اس پر انہوں نے کہا کہ اب بس! ہمارا تمہارا ساتھ نبھ نہیں سکے گا۔

قَالَ هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا ○ (۱۸/۷۸)

تب موسیٰ کے ساتھی نے کہا " بس، اب مجھ میں اور تم میں جدائی کا وقت آگیا۔ ہاں، جن باتوں پر تم سے صبر نہ ہو سکا، ان کی حقیقت تمہیں بتلا دیتا ہوں۔

اب اُن باتوں کی حقیقت دیکھئے جن کی لِم، حضرت موسیٰؑ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ○ (۱۸/۷۹)

سب سے پہلے کشتی کا معاملہ لو۔ وہ چند غریب آدمیوں کی کشتی تھی جو سمندر میں محنت مزدوری

کرتے ہیں. وہ جس طرف بڑھ رہے تھے' وہاں ایک بادشاہ ہے (ظالم) جس کسی کی (اچھی) کشتی پاتا ہے' زبردستی لے لیتا ہے. میں نے چاہا ان کی کشتی میں ایک عیب نکال دوں. (تاکہ عیبی دیکھ کر بادشاہ کے آدمی چھوڑ دیں).

دوسرا معاملہ لڑکے کے قتل کا تھا.

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ○ (۱۸/۸۱-۸۰)

باقی رہا لڑکے کا معاملہ' تو اس کے ماں باپ بڑے امن پسند ہیں. میں یہ دیکھ کر ڈرا کہ وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے ان کے لئے موجبِ اذیت بن جائے گا. پس میں نے چاہا کہ ان کا پروردگار اس لڑکے سے بہتر انہیں لڑکا دے' دینداری میں بھی اور محنت کرنے میں بھی.

یعنی لڑکے کے ماں باپ بڑے امن پسند تھے لیکن لڑکا خود بڑا سرکش' باغی اور قانون شکن واقع ہوا تھا. خدشہ یہ تھا کہ کہیں اس کے ماں باپ بھی اس کی قانون شکنی اور بغاوت کی لپیٹ میں نہ آجائیں. لہٰذا اللہ کے اس بندے (رسول) نے اسے قتل کر کے لوگوں کو اس کی فتنہ و فساد کی آگ اور اس کے ماں باپ کو مفت میں مجرم بننے کی عقوبت سے بچا لیا.

تیسرا واقعہ دیوار کی تعمیر کا تھا.

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ○ (۱۸/۸۲)

اور وہ جو دیوار درست کر دی گئی تو (اس کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے. وہ) شہر کے دو یتیم لڑکوں کی ہے' جس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا ہے. ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا. پس تمہارے پروردگار نے چاہا' دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پاکر نکال لیں.

(اگر وہ دیوار گر جاتی، تو ان کا خزانہ محفوظ نہ رہتا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اسے مضبوط کر دیا جائے) یہ ان لڑکوں کے حال پر پروردگار کی ایک مہربانی تھی جو اس طرح ظہور میں آئی اور یاد رکھو میں نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا (اللہ کے حکم سے کیا)۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے!

واقعہ اتنا ہی ہے۔ لیکن اس پر تاویلات کی حاشیہ آرائیاں اتنی طول طویل چڑھا دی گئی ہیں کہ نفسِ واقعہ کی حیثیت محض "مصرعِ طرح" کی رہ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰؑ کو ہنوز نبوت عطا نہیں ہوئی تھی اور وہ تلاشِ حقیقت میں مضطرب و بےقرار پھرتے تھے۔ وحی سے پہلے، ان کے پاس ذریعہ علم صرف عقل تھی۔ عقل اور وحی میں فرق یہ ہوتا ہے کہ عقل کا طریقِ انکشافِ حقیقت ہوتا تجرباتی ہے۔ وہ رفتہ رفتہ حقیقت تک پہنچتی ہے اس کے برعکس، وحی ان تجرباتی کڑیوں کو حذف کر کے ایک ہی جست میں اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں عقل نے طول طویل مراحل کے بعد پہنچنا تھا۔ (تفصیل اس کی "ابلیس و آدم" میں "وحی" کے عنوان کے تابع گزر چکی ہے) جس وقت وحی کسی آنے والی بات کا ذکر کرتی ہے تو چونکہ عقل اپنی منطقی کڑیوں سے اس تک پہنچ نہیں سکتی، اس لئے وہ اس پر معترض ہو جاتی ہے اور اتنا انتظار نہیں کرتی کہ زمانہ ذرا اور آگے بڑھ جائے تو حقائق خود بخود بےنقاب ہو کر سامنے آ جائیں۔ اس واقعہ میں قرآن نے، عقل اور وحی کی اس کشمکش کو واضح کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی تصریح نہیں کی کہ وہ "اللہ کا بندہ" کون تھا جو حضرت موسیٰؑ کو ملا تھا۔ فقط اتنا ہی بتایا ہے کہ وہ عَبْدٌ مِّنْ عِبَادِنَا (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) تھا جسے اللہ نے اپنے ہاں سے علم عطا فرمایا تھا (۱۸/۶۵) لیکن آگے چل کر کچھ باتیں ایسی آ گئی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اس "اللہ کے بندے" کا مقام بہت بلند تھا۔ چنانچہ لڑکے کے قتل کے سلسلہ میں انہوں نے کہا "فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا" (۱۸/۸۰) "ہمیں خوف ہوا کہ وہ بچہ کہیں کفر و سرکشی نہ اختیار کر لے۔" فَاَرَدْنَا (۱۸/۸۱) "سو ہم نے چاہا" کہ اللہ انہیں اس سے بہتر لڑکا عطا کر دے۔ اس سے اگلی آیت میں، بہ سلسلۂ واقعۂ دیوار، کہا کہ فَاَرَادَ رَبُّكَ (۱۸/۸۲) "تیرے رب نے چاہا" کہ وہ بچے بلوغت تک پہنچ جائیں۔ ان ہر دو واقعات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان تمام معاملات سے مقصود تکمیلِ مشیتِ خداوندی تھی۔ چنانچہ ذرا آگے چل کر کہا کہ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ (۱۸/۸۲) "یہ سب کچھ میں نے اپنے حکم سے نہیں کیا"

اللہ کے حکم سے کیا جس کا میں تابع فرمان (عبد) ہوں۔ (آیاتِ بالا میں فَخَشِينَآ اور فَاَرَدْنَآ کا انداز عام اسلوب سے الگ ہے۔ اس ضمن میں "جوئے نور" میں حضرت لوطؑ کے تذکرۂ جلیلہ میں فرستادگانِ خداوندی کے اندازِ گفتگو پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ حقیقت سامنے آجائے گی)۔

ہوسکتا ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ واقعہ تمثیلاً بیان کیا ہو۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ یہ سب کچھ سچ مچ واقعہ ہوا تھا، تو بھی اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو اِدھر اُدھر کی دور از کار تاویلات کی محتاج ہو۔

اس واقعہ میں ایک جزو البتہ ایسا ہے جس کے سمجھنے کے لئے ذہن میں ذرا سا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے لیکن وہ اُلجھاؤ بھی اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب پہلے یہ تصور کر لیا جائے کہ اس "اللہ کے بندے" نے ایک چھوٹے سے معصوم بچے کو مار ڈالا اور مار ڈالا اس خدشہ کی بنا پر کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کے لئے ایسا ثابت ہوگا۔ قرآنِ کریم نے اسے غلام کہا ہے (۱۸/۷۴؛ ۱۸/۸۰)۔ غلام اسے کہتے ہیں جس کی مَسیں بھیگ رہی ہوں، یعنی نوجوان۔ اور مجازاً پیدا ہونے سے جوانی تک کی عمر کے لڑکے کو بھی غلام کہتے ہیں۔ اس لئے اس مقام پر (جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا) غلام سے مراد ایک نوجوان لڑکا ہے۔ اب رہا خدشہ سو اس کے لئے قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں فَخَشِينَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (۱۸/۸۰)۔ اَرْهَقَ کے معنی ہیں زبردستی سے کسی دوسرے کو ڈھانپ دینا۔ (دیکھئے ۱۰/۲۶) اب معنی واضح ہوگئے کہ وہ لڑکا ملک (یا شریعت) کے قانون کا منکر اور سرکش اور باغی تھا۔ لیکن اس کے ماں باپ قانون کے فرماں بردار اور امن پسند تھے۔ اس کی سرکشی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ماں باپ پر بھی زبردستی کرتا تھا۔ اس لئے خدشہ یہ تھا کہ کسی دن اس زبردستی سے وہ انہیں بھی اسی قسم کی سرکشی میں اپنے ساتھ نہ ملا لے۔ اس لئے اس کا قتل اس کے فساد و سرکشی کے جُرم کی بنا پر تھا جو قانون کی رُو سے بالکل جائز تھا اور ضروری اس لئے کہ اگر اسے مہلت مل جاتی تو اندیشہ تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھی زبردستی ان جرائم میں شریکِ کار بنا لیتا۔ یا اگر وہ ان کے پاس پناہ لیتا تو قانون کی نگاہوں میں وہ بھی برابر کے مجرم قرار پا جاتے۔ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا (۱۸/۸۱) کے الفاظ بھی اس لڑکے کی سیرت پر گواہی دیتے ہیں کہ اس میں نیکی کی صلاحیت نہ تھی اور نہ ہی ماں باپ کے لئے جذبۂ رحم اور ہمدردی تھا اس لئے دعا یہ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس سرکش اور ظالم بیٹے کے بدلہ

میں ایک ایسا لڑکا عطا کر دے جو نیکو کار ہو اور رحمدل۔ حضرت موسیٰؑ نے اس لڑکے کو نَفْسًا زَكِيَّةً (۱۸/۷۴) "ایک بے گناہ جان" کہا تھا، اس لئے کہ انہیں اس کی سرکشی کا علم نہ تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس "اللہ کے بندے" نے ایک نوجوان کو راہ چلتے پکڑ کر مار ڈالا ہے۔ وہ لامحالہ یہی کہہ سکتے تھے کہ "تم نے ایک بے گناہ انسان کو ناحق مار دیا (۱۸/۷۴)۔ لیکن اس "اللہ کے بندے" کو معلوم تھا کہ وہ سرکش اور مفسد لڑکا ہے جس کے فتنہ و فساد سے نہ صرف بے گناہوں کا خون ہی ہو رہا ہے بلکہ خطرہ ہے کہ اس کے شعلوں کی لپیٹ میں اس کے نیک ماں باپ بھی نہ آجائیں۔

ہم نے جیسا کہ پہلے لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کو نبوت ملنے سے پیشتر کا ہے اور جن صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تھی وہ خدا کے رسول تھے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، اس واقعہ میں کوئی بات وضاحت طلب نہیں رہ جاتی لیکن عام طور پر اس واقعہ کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کی نبوت کے بعد کا ہے اور جو بزرگ انہیں ملے تھے وہ ایک "روحانی پیشوا" (خواجہ خضر) تھے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ

(۱) جب حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر نبی کو بھی ایک مرشدِ طریقت کی ضرورت تھی تو عام انسان مرشد کی ہدایت و تلقین کے بغیر کس طرح سیدھی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟

(۲) شریعت کے احکام ظواہر پر مبنی ہوتے ہیں لیکن اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حقائق و بواطن، ظواہر سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے مرشد وہی ہو سکتا ہے جس کی نگاہ بواطن و اسرار پر ہو اور اگر اس کا کوئی عمل ظواہر سے خلاف بھی ہو، تو بھی اس پر حرف گیری نہیں کرنی چاہیئے۔

شریعت اور طریقت

اس صغریٰ و کبریٰ کی بنیادوں پر "پیری مریدی" کی عظیم الشّان عمارت تیار ہوگئی اور یہیں سے شریعت اور طریقت کا بنیادی فرق شروع ہو گیا، یعنی دین کی اصل اسرار و رموز ہیں جو ظواہر پرستوں (اہلِ شریعت) کی سمجھ میں نہیں آسکتے اور ان کے سمجھنے کے لئے "علمِ لدُنّی" کی ضرورت ہے جو مخفی طریق پر سینہ بسینہ اربابِ طریقت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ قربِ الٰہی کا ذریعہ یہی اسرار و معارف ہیں جنہیں عام نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ مرشد[1] کی

---

[1] یاد رکھئے قرآنِ کریم کی رُو سے خدا کے سوا کوئی مرشد نہیں۔ مَنْ يَهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ

(باقی اگلے صفحے پر دیکھئے)

نگاہ ان بواطن و اسرار پر ہوتی ہے، اس لئے اس کا کوئی حکم اگر ظاہر کے خلاف بھی ہو تو بھی اس پر جرح و تنقید نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ انسان اپنے مرشد کی اطاعت میں آنکھیں بند کئے چلا جائے۔

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

اگرچہ اس واقعہ میں "پیری مریدی" کا کوئی سوال ہی نہیں اور اس لئے مندرجہ صدر "نتائج" کی تردید میں لمبے چوڑے دلائل کی ضرورت نہیں، بایں ہمہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بتا دیا جائے کہ قرآن کی رُو سے بھی "پیری مریدی" کی کوئی حقیقت نہیں اور "اسرار و رموز" کی نظر فریب عمارت جس کی آئینہ بندی بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے، ایک ایسی بنیاد پر استوار ہے جس کی سند قرآنِ کریم میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اس کا جذبۂ محرکہ بھی دراصل انسان کی وہی اعجوبہ پسندی ہے جو کھلی ہوئی حقیقتوں سے سیراب

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝ (۱۸/۱۷) جسے اللہ ہدایت دے تو وہی (درحقیقت) راہِ ہدایت پر ہے اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو اس کے لئے کوئی کارساز مرشد نہیں"۔ اور وہی ہادی ہے وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (۲۵/۳۱) "اور تیرا رب ہادی اور نصیر کافی ہے"۔ یہ رشدِ خداوندی قرآنِ کریم سے ملتی ہے۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝ (۷۲/۲-۱)

(اے پیغمبرِ اسلامؐ!) تم کہو کہ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتلایا گیا ہے کہ جنگلی آدمیوں کی ایک جماعت نے سُنا تو وہ (اپنی قوم کے پاس گئے اور) کہنے لگے "ہم نے عجیب طریقہ سے قرآن کو سنا جو نیکی کے رستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ ہم اس پر ایمان لے آئے اور اب ہم اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہیں کریں گے۔"

اور ہدایت بھی وہیں سے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ہونے کے بجائے سربستہ رازوں کی تلاش میں لذت محسوس کرتی ہے۔

نبی اکرمؐ شریعت لائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر قرآنِ کریم نازل فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۵/۶۷)

اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے' اسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا' تو (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادائے فرضِ رسالت میں کوتاہی کی) اور اللہ تمہیں انسانوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔ وہ اس گروہ پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہے۔

حضورؐ نے اس وحی کا ایک ایک لفظ امت تک پہنچا دیا۔ آپ اسی قرآن کی تعلیم فرماتے تھے۔ خود بھی اس پر عمل کرتے اور اسی کے مطابق دوسروں سے عمل کرا کر ان کی ذات کی نشوونما کرتے تھے۔

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ق وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ (۶۲/۲)

وہ خدا جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے خدا کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کی ذات کی نشوونما کا سامان کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

کوئی راز نہیں

اس تعلیم و عمل میں نہ کوئی راز تھا، نہ خفیہ سرگوشیاں۔ یہ سب کچھ کھلے بندوں

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ج (۲/۱۸۵)۔

یہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن کا نزول (شروع) ہوا ہے۔ وہ انسانوں کے لئے رہنما ہے۔ ہدایت کی روشن صداقتیں رکھتا ہے اور حق کو باطل سے الگ کر دینے والا ہے۔

ہوتا تھا مسلمان تو ایک طرف، غیر مسلموں سے بھی کسی قسم کا اخفائے راز نہ تھا۔ حضورؐ نے یہ فریضۂ رسالت بکمالِ حسن و خوبی ادا فرمایا۔ اس زمین پر خدائی حکومت قائم ہوئی اور حجۃ الوداع میں لاکھوں کے مجمع سے پوچھا کہ کہو! میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا یا نہیں؟ ہر ایک نے اس کی شہادت دی اور اس پر حضورؐ نے خود اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرایا اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ۔ اب آپ خیال فرمایئے کہ اس کے بعد یہ تصور میں بھی لایا جا سکتا ہے کہ دین کے بہت سے (یا تھوڑے سے) اسرار و رموز حضورؐ نے (معاذ اللہ) چھپا کر رکھ لئے تھے اور دو چار مخصوص حضرات کو چپکے چپکے بتا دیئے تھے تا کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو؛ لیکن بایں ہمہ آپ دیکھیں گے کہ یہ عقیدہ موجود ہے کہ اسرار و بواطن، جو دراصل دین کی اساس اور رُوح ہیں، پردۂ راز میں رکھے گئے تھے اور ان کی تعلیم خفیہ طور پر ہوئی تھی جہاں سے یہ سلسلہ سینہ بسینہ آگے منتقل ہوا۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر تصوف کی فلک بوس عمارت قائم ہے۔ چنانچہ خود بخاری شریف میں یہ روایت موجود ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ قال حفظت عن رسول اللہ دعاءین۔ فاما احدھما فبثثتہ و اما الاٰخر فلو بثثتہ قطع ھذا لبلوم۔

(بخاری، جلد اوّل، صـ۲۴)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے دو برتن (لے کر) یاد رکھے۔ ایک کو تو میں (لوگوں کے سامنے) کھول چکا۔ رہا دوسرا، تو اگر میں اس کو بیان کر دوں، تو یہ حلق کاٹ دیا جائے (یعنی اسرار و معرفت)۔

یہ ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ قرآنِ کریم ہی کی تعلیم فرمایا کرتے تھے جس کے متعلق حضورؐ کو ارشاد تھا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (۵/۶۷) (جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو)۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو بھی حضورؐ نے اسی قرآن کی تعلیم دی ہوگی۔ اب تعلیم کے ایک حصّہ کو ظاہر کرنا اور ایک حصّہ کو چھپا رکھنا کس طرح سے جائز ہو سکتا ہے؟ حالانکہ قرآنِ کریم میں بالتصریح موجود ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نازل فرمودہ تعلیم کو چھپائے اس کے لئے عذابِ الیم کی وعید ہے (۲/۱۷۴)۔ خود حضرت ابو ہریرہؓ نے اس آیت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ میں اسی لئے بکثرت احادیث کی روایت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کتمانِ کتاب سے سخت منع فرمایا ہے۔ (بخاری جلد اوّل صـ۲۴) اور بخاری شریف میں اسی کتاب العلم کے تحت ایک باب "لیبلغ العلم الشاھد الغائب"

کے عنوان سے موجود ہے۔ ان تصریحات کے پیشِ نظر تعلیم نبویؐ کے کسی حصّہ کو چھپانا کیا معنی رکھتا ہے ؟ ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی۔ لیکن اسے "اسرار و رموز کی تعلیم" کے سلسلہ میں بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔

اسلام کا مقصود اس مقام پر ہم تصوّف کی تاریخ نہیں لکھنا چاہتے (کہ یہ اس کا مقام نہیں[1]) ورنہ یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی کہ یہ تمام عقائد کن کن راستوں سے اسلام میں داخل ہوئے اور کس طرح انہوں نے اسلام جیسے نکھرے اور واضح نظامِ زندگی کو بھول بھلیاں بنادیا۔ اس مقام پر صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اسلام کا مقصد ایک ایسا نظامِ حیات قائم کرنا ہے جس میں انسان خود بھی قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرے اور ان قوانین کو عملی صورت میں دنیا میں نافذ کرسکے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایک ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جاسکے جو قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔ نبی اکرمؐ نے اپنے عالمتاب عمل سے بتادیا کہ یہ نظام کس طرح سے قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے جو جماعت تیار ہوگی ظاہر ہے کہ اس کی زندگی قرآن کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہوگی۔ اس کا نام تزکیۂ نفس ہے۔ یہ جماعت ایک ایسی مشینری ہوگی جس کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ پر نہایت محکم اور پائیدار (اصلح) ہوگا۔ ان تمام پرزوں کی نقل و حرکت سے یہ پوری مشین سرگرمِ عمل ہوگی اور اس کے عمل کا نتیجہ، دنیا میں حکومتِ قرآنی کا قیام و استحکام ہوگا۔ اسی کا نام استخلاف فی الارض ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۲۴/۵۵)

خدا نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے صلاحیت بخش کام کئے ہیں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں زمین کی حکومت ضرور بالضرور عطا فرمائے گا جیسا کہ وہ ان سے پہلے (مومن اور صالح) لوگوں کو عطا فرماتا رہا ہے اور یہ کہ ان کے اُس دین (اسلام) کو جسے

---

[1] اس کے لئے دیکھئے "تصوّف کی حقیقت" — ایڈیشن اوّل، ستمبر ۱۹۸۱ء

وہ ان کے لئے پسند فرما چکا ہے تمکّن (اور قوت و شوکت) عطا فرمائے گا اور یہ کہ بیم و خوف (کے زمانہ) کے بعد (اُن کا زمانہ) امن (کے زمانہ) سے تبدیل کردے گا۔ (ان عنایات کے وعدے صرف اس وجہ سے ہیں کہ) وہ میری ہی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرتے ہیں اور (میری اطاعت و محکومیت میں) میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ اور (یاد رکھو کہ) جو کوئی اس (کھلے وعدہ) کے بعد بھی نافرمانی اختیار کرے تو سمجھ لو کہ یہی لوگ (دراصل) سرکشی کرنے والے لوگ ہیں۔

لیکن مسلمانوں نے کیا کیا؟

یہ سب کچھ حاصل ہوگا مجاہدانہ سعی و عمل سے۔ لیکن جب مسلمانوں کی نگاہوں سے (مختلف اسباب و علل کی بنا پر) یہ درخشندہ نصب العین اوجھل ہوگیا اور قلب و نگاہ کی محکومی سے تن آسانی اور سہل انگاری کی افسردگی ان کے رگ و پے میں سرایت کرگئی، تو انہوں نے بھی (دوسری اقوام کی طرح) دین کو محض انفرادی تربیت[1] کا ذریعہ سمجھ لیا اور اس کے لئے مختلف راستے تلاش کرنے شروع کردیئے۔ وہ کھلی ہوئی شاہراہ (صراطِ مستقیم) جس پر گامزن ہوکر دنیا میں قرآنی حکومت قائم کی گئی تھی، بالکل واضح تھی جس میں کوئی پیچ و خم نہ تھا۔ لیکن یہ پگڈنڈیاں، جن کے متعلق کہا گیا کہ یہ قربِ الٰہی کے مختصر راستے (Short cuts) ہیں، پیچ در پیچ تھیں جن کا علم خاص خاص "سالکینِ راہِ حقیقت" کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ واضح شاہراہ پر چلنے کے لئے (جس پر خدا کے مقدس کارواںؑ اور اس دانائے سبلؐ کارواں سالارؐ کے نقوشِ قدم ستاروں کی طرح چمکتے تھے) قندیلِ قرآنی کی روشنی کافی تھی۔ لیکن ان پیچدار راہوں میں جب تک کوئی "مُرشد" ہاتھ پکڑ کر آگے نہ جائے، ہر وقت راستہ کھو جانے کا خطرہ تھا۔ یہ ہے اسرار و بواطن کی وہ دنیا جو اس ظاہری دنیا سے بالکل الگ ہے جہاں کے آئین و دستور

---

[1] یہ خصوصیتِ کبریٰ صرف قرآنِ کریم ہی کو حاصل ہے کہ اس نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ فرد اپنی تکمیلِ ذات (یعنی تکمیلِ شرفِ انسانیت) کے لئے جماعت کا محتاج ہے۔ اس لئے نظامِ اسلامی کے لئے جماعتی زندگی لاینفک ہے۔ قرآن کے علاوہ ہر مذہب (جس شکل میں وہ آج دنیا میں موجود ہے) اور ہر فلسفہ نے یہی کہا کہ انسان کی "روحانی ترقی" یا ذات کی نشوونما، صرف انفرادی طور پر ہوسکتی ہے۔ رہبانیت یا تصوف اسی کا نام ہے۔

نرالے اور راہ و رسم منزل انوکھے ہیں اور ان کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ اس فن کی تحصیل کی راہیں ہیں جن کا ذکر سحر کے عنوان میں کیا جا چکا ہے۔

تسخیرِ فطرت اور تصوّف

باطنیت (MYSTICISM) کس طرح ادراکِ حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتی اس کے لئے "ابلیس و آدم" میں "وحی" کے عنوان کے تابع تفصیلاً لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت ضمناً ایک اور گوشہ پر بھی نگاہ ڈال لیے۔ قرآنِ کریم پر غور کرنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ وہ سماعت و بصارت (sense peveception) کو علمِ انسانی کے حصول کے ذرائع قرار دیتا ہے اور تجربات و مشاہداتِ حسّی کے ذریعہ تسخیرِ فطرت کی تلقین کرتا ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ اس کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ کس محکم نظام کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے اور اس سے کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں۔ وہ تخلیقِ ارض و سمٰوٰت، تکویرِ لیل و نہار، تنویرِ شمس و قمر، تقدیرِ شجر و حجر، غرضیکہ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرّۂ خاک سے لے کر، بڑے سے بڑے محیّر العقول نظامِ فلکی تک ہر شے میں غور و فکر کا حکم دیتا ہے اور اسی غور و فکر پر علم الاشیاء کی محکم عمارت قائم کرتا ہے۔ مسلمان اسی اندازِ تحقیق و تفتیش کو لے کر اٹھے اور جس شاہراہِ زندگی پر جادہ پیما ہوئے کائنات کی مستور قوتوں نے ان کے سامنے اپنے سینے کھول دیئے۔ انہوں نے علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں سمجھ لیا تھا کہ

> فطرت کا علم خدا کی خدائی کا علم ہے۔ جب ہم فطرت کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو گویا ہم آقائے مطلق سے قریب تر ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کی عبادت ہے۔
>
> (خطبات صفحہ ۷۷)

لیکن اس دورِ عمل کے بعد، جب "طاؤس و رباب" کا زمانہ آیا، تو حکمتِ یونان کی افسوں گری ان کے قلب و دماغ پر چھا گئی اور انہوں نے قرآنی طریقِ حصولِ علم و تسخیرِ فطرت کو چھوڑ کر عجمی مسالک اختیار کر لئے۔ سقراط نے اپنی توجہات کا مرکز، عالمِ آفاق کے بجائے "انسان" کو قرار دیا تھا۔ اس کے شاگرد (افلاطون) نے اس باب میں اور بھی شدت اختیار کی اور دنیائے محسوسات کو پائے استحقار و تنفر سے ٹھکرا کر صرف "باطنی دنیا" کو حقیقی علم قرار دے دیا۔ یہی وہ حکمت تھی جو تصوّف[1] کا حسین و

(فٹ نوٹ ص۱ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

مقدس نقاب اوڑھ کر مسلمانوں کے دل و دماغ پر مستولی ہو گئی۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
آنچناں افسونِ نامحسوس خورد — اعتبار از دست و چشم و گوش برد
گفت سرِ زندگی در مردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است
بر تخیلہائے ما فرماں رواست — جامِ اُو خواب آور و گیتی رُباست
گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ اُو بر جانِ صوفی محکم است

غور فرمائیے کہ عمل کی دنیا تو ایک طرف، علمی دنیا میں بھی یہ "باطن پرستی" کس طرح عین اسلام بن گئی۔ حکمتِ یونان[1] کے علاوہ ایرانیوں کی نسل پرستی بھی اس باطن پرستی کا بہت بڑا موجب بنی لیکن ان مختلف کڑیوں کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔

علم النفس

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے عالمِ آفاق کے ساتھ ساتھ عالمِ انفس میں غور و فکر کا بھی حکم دیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ (۵۱/۲۰)

اور (دیکھو) یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (خدا کی) بہت سی نشانیاں (پھیلی ہوئی) ہیں (تم ان پر غور کیا کرو)۔

اس سے متصل آیت میں یہ بھی فرمایا کہ

وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (۵۱/۲۱)

اور خود تمہاری ذات میں بھی (بہت سی نشانیاں موجود ہیں) تو کیا تم دیکھتے نہیں؟

گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ [1]

ہر چند اس سے ذرا پہلے یہودیت اور عیسائیت کے مسلکِ رہبانیت کے اثر کے باعث، کہیں کہیں مسلمان صوفیوں کی خانقاہیں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ لیکن اسے ایک مستقل شعبے کی حیثیت حکمتِ یونان ہی کے ماتحت آ کر حاصل ہوئی۔

[1] یونانی مفکر اس امر پر زور دیتے تھے کہ کائنات سکونی ہے۔ یہ تصور بھی قرآنی تصور کے خلاف تھا جو کائنات کو حرکیاتی قرار دیتا ہے۔ ان دونوں تصورات میں کیا فرق ہے؟ یہ ایک الگ مبحث ہے جس کی توضیح کا یہ مقام نہیں۔

سورۂ روم میں اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمایا جہاں ارشاد ہے کہ علمِ صحیحہ کے حصول کے لئے، عالمِ طبیعی میں تدبر، تاریخِ امم میں تفکر اور عالمِ النفس میں تبصّر نہایت ضروری ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۣ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (۳۰/۹-۸)

اور کیا ان لوگوں نے خود اپنے آپ پر غور نہیں کیا؟ (اگر غور کرتے تو خدا کی قدرت کی ہزارہا نشانیاں انہیں خود اپنے ہی اندر مل جاتیں) آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے خدا نے حق کے ساتھ اور ایک میعاد متعین کے لئے پیدا کیا ہے اور بلاشبہ بہت سے لوگ اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہیں۔ کیا وہ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلی اُمتوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے؟ وہ طاقت وقوت میں ان سے زیادہ مضبوط تھے اور انہوں نے زمین کو بھی ان سے زیادہ بویا جوتا اور جتنا ان لوگوں نے زمین کو آباد کر رکھا ہے اس سے زیادہ ان لوگوں نے آباد کر رکھا تھا۔ ان کے رسول بھی ان کے پاس واضح دلائل کے ساتھ آچکے تھے (مگر انہوں نے انکار و بدعملی کی زندگی کو نہ چھوڑا بالآخر اس کا نتیجہ بھی ان کے سامنے آکر رہا) خدا ایسا نہیں تھا کہ ان پر (خواہ مخواہ) ظلم کرتا (اور بلاوجہ انہیں تباہ کر دیتا)۔ لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے تھے۔

لیکن اس "عالمِ النفس" سے مراد کوئی باطنی دنیا نہیں۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ دیگر اقوام کے علاوہ، تم خود اپنی قوم پر بھی نگہ بصیرت سے غور کرو۔ لیکن اگر 'نفس' سے مراد خود انسان ہی ہو تو انسان کے جسم کی مشینری اور حیاتیات کا علم ایک عظیم دنیا اپنے اندر رکھتا ہے اور اگر اس سے مفہوم "انسانی ذات" (human personality) ہی لیا جائے، تو بھی اس سے علم النفس

(psychology) ہوگا جسے علم الفطرت کی طرح ایک سائنس کی حیثیت سے حاصل کیا جاتا ہے. یہی وہ علم ہے جو افراد سے گزر کر جب اقوام تک پہنچتا ہے تو ان انقلابات کا پتہ دیتا ہے جو ان کی زندگی کے سرچشموں میں کروٹیں لے رہے ہوتے ہیں. حقیقت یہ ہے کہ خارجی انقلابات، نفسیاتی انقلابات ہی کا مظہر ہوتے ہیں.
یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے جسے قرآنِ کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (۸/۵۳ نیز ۱۳/۱۱)

(اور) یہ بات اس لئے ہوئی کہ اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ جو نعمت وہ کسی گروہ کو عطا فرماتا ہے، اسے پھر کبھی نہیں بدلتا، جب تک کہ خود وہ گروہ اپنی نفسیاتی کیفیت کو نہیں بدلتا اور (یہ اس لئے کہ) اللہ (سب کی) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے.

اقوام و ملل کی نفسیاتی کیفیات اور ذہنی و قلبی ماجریات کا یہی وہ علم ہے جس کے ذریعہ آج اقوامِ مغرب باقی اقوامِ عالم کی دنیائے فکر و نظر پر غیر محسوس طور پر چھائی ہوئی ہیں. حالانکہ وہاں ابھی یہ علم اپنے عہدِ طفولیت میں ہے. اگر اس علم کو بھی انتہائے تکمیل تک پہنچایا جائے اور پھر اس کے ماحصل سے قرآنی روشنی میں متمتّع ہوا جائے تو دیکھئے کہ یہ دنیا کس طرح جنّتِ ارضی میں تبدیل ہو جاتی ہے. اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اصل تبدیلی تو نگاہ کے زاویوں کی تبدیلی ہے.

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

علمِ لدُنّی

حضرت موسیٰ کے واقعہ زیرِ نظر میں اس بزرگ ہستی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (۱۸/۶۵) "اسے ہم نے اپنے ہاں سے علم سکھایا تھا." یہاں سے ہمارے ہاں "علمِ لدُنّی" کی عجیب و غریب اصطلاح آگئی ہے. علمِ لدُنّی سے مراد لیا جاتا ہے ایسا علم جو ظاہری ذرائع و وسائط سے حاصل نہ کیا جائے بلکہ کسی مخفی طریقہ سے یونہی مل جائے. یہ بھی درحقیقت "ظاہری و باطنی" (شریعت و حقیقت) کی تفریق و تمیز ہی کی ایک شق ہے اور حصولِ علم کا وہی باطنی طریقہ جسے ابھی ابھی حکمتِ یونان کے ماتحت لکھا جا چکا ہے. مندرجہ صدر آیت میں اللہ تعالےٰ

نے فرمایا ہے کہ "ہم نے اپنے اس بندے کو اپنے ہاں سے (مِنْ لَّدُنَّا) علم عطا فرمایا تھا"۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مِنْ لَّدُنَّا سے قرآنِ کریم کی مراد کیا ہے؟

جیسا کہ اس سے پیشتر کئی ایک مقامات پر لکھا جا چکا ہے، وحی وہ علم ہے جو مادی اسباب و ذرائع کے بغیر حضرات انبیاء کرامؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے، لیکن یہ موہبتِ کبریٰ مخصوص ہے نبوّت کے ساتھ۔ اس میں کسی دوسرے انسان کا کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کو مِنْ لَّدُنَّا (یعنی اللہ کی طرف سے عطا فرمودہ) کہا ہے۔ قرآنِ کریم کے متعلق فرمایا۔

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍۙ

الف۔ لام۔ را (۱۱/۱)

یہ کتاب ہے، جس کی آیتیں (اپنے مطالب و دلائل میں) مضبوط کی گئیں، پھر کھول کھول کر واضح کردی گئیں۔ یہ اس کی طرف سے ہے جو حکمت والا (اور ساتھ ہی) ساری باتوں کی خبر رکھنے والا ہے۔

سورۂ نمل میں ہے۔

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝ (۲۷/۶؛ ۲۰/۹۹)

اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) بلاشبہ تمہیں یہ قرآن اُس (خدا) کی طرف سے سکھایا جاتا ہے جو حکمت والا اور (سب کچھ) جاننے والا ہے۔

وحی کے علاوہ وہ صلاحیتیں جو انسانی طبائع میں از خود موجود ہوتی ہیں اور انہیں اکتساباً حاصل نہیں کیا جاتا، ان کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ "ہمارے ہاں" سے ملتی ہیں۔ حضرت یحییٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۙ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ۙ (۱۲-۱۳/ ۱۹)

"اے یحییٰ" تو کتابِ الٰہی کے پیچھے مضبوطی سے لگ جا۔ چنانچہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ ہم نے اسے علم و فضیلت بخش دی۔ نیز اپنے ہاں سے دل کی نرمی اور نفس کی نشوونما کی صلاحیت عطا فرمائی۔

لیکن مِنْ لَّدُنَّا ان انعامات و خطائص کے متعلق بھی آیا ہے جو مادی اسباب و ذرائع کے

ماتحت حاصل ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت زکریاؑ نے بیٹے کے متعلق دعا مانگی۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ٥ (۳/۳۸)

اسی جگہ کا یہ معاملہ ہے (یعنی قربان گاہ کا) زکریاؑ نے اپنے پروردگار کے حضور دعا مانگی تھی "خدایا! تو اپنے خاص فضل سے مجھے پاک نسل عطا فرمایا (جو مریم کی طرح نیک اور عبادت گزار ہو)۔ بلاشبہ تو ہی ہے کہ دعائیں سننے والا اور التجائیں قبول کرنے والا ہے۔

ظاہر ہے کہ اولاد طبعی اسباب کے ماتحت ہی عطا ہوتی ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ ہجرت (نبی اکرمؐ) کے بعد، بعض کمزور اور ضعیف مسلمان مکہ میں گھر گئے تھے۔ ان کی دعاؤں کو قرآن کریم نے اپنی آغوشِ رافت میں محفوظ کر لیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.......... وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۗ (۴/۷۵)

اور (مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم و تشدد سے عاجز آ کر) فریاد کر رہے ہیں۔ خدایا! ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے، نجات دلا! (یعنی مکہ سے نجات دلا) اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کر دے!"

ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ امداد ظاہری اسباب کے ماتحت ہی پہنچی تھی جب مجاہدین کی مسلح جماعت ان کی حمایت کے لئے آگے بڑھی تھی، کوئی باطنی مدد نہیں تھی۔ سورۂ قصص میں اہلِ مکہ کے متعلق فرمایا کہ اگرچہ ان کی آبادی بے برگ وگیاہ وادی میں واقع ہوئی ہے لیکن ان کا رزق اطراف و اکنافِ عالم سے کھنچا چلا آتا ہے لسے بھی اللہ تعالیٰ نے "اپنے ہاں سے" رزق قرار دیا ہے۔

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ (۲۸/۵۷)

کیا ہم نے انھیں امن والے حرم میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں.
یہ ہماری طرف سے رزق ہے. لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے.

اعمالِ انسانی کی جزا کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ کے ہاں سے ملتی ہے.

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا وَ یُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا ○ (۴/۴۰ نیز ۴/۶۷)

(یاد رکھو) اللہ (مکافاتِ عمل میں) ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا (کہ عمل کے بدلے میں کسی طرح کی کمی ہو جائے یا کوئی بدلے سے محروم رہ جائے. اس کا قانون تو یہ ہے کہ) اگر ذرہ برابر بھی کسی نے نیکی کی ہے، تو وہ اسے دوگنا کر دے گا اور پھر اپنے پاس سے ایسا بدلہ بھی عطا فرمائے گا جو بہت بڑا بدلہ ہوگا!

اسی سلسلہ میں اِن آیات کو بھی دیکھئے. (۱۸/۲ ؛ ۱۸/۱۰ ؛ ۳/۷ ؛ ۱۷/۸۰)

ان مقامات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مِنْ لَّدُنَّا (ہماری جناب سے) ارشاد فرماتا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہوتا ہے؟ یعنی ان امور میں جن کا تعلق کسب و ہنر سے نہیں ہوتا اس سے مفہوم بلا مادی اسباب و ذرائع ہوتا ہے (جیسے وحی) لیکن جن امور میں انسانی کسب و ہنر کو دخل ہوتا ہے ان میں مقصود اسباب و ذرائع کے ماتحت ظہورِ نتائج ہوتا ہے. وحی خاصۂ نبوت ہے. اس لئے اس علم کو علمِ لدنی (بلا مادی اسباب و ذرائع اور بغیر انسانی کسب و ہنر من جانب اللہ) کہا جائے گا. لیکن وحی کے علاوہ ہر قسم کا علم انسانی کسب و ہنر سے حاصل ہوگا. چونکہ وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، اس لئے اب تمام علوم عام اسباب و ذرائع کے ماتحت انسانی کسب و ہنر سے ہی حاصل ہوں گے اور ان کا دروازہ ہر انسان کے لئے کھلا ہوگا جو ان کا متلاشی ہو. اسلام کسی چور دروازہ کا قائل نہیں. اس لئے آج اس آسمان کے نیچے علمِ لدنی (منجانب اللہ بلا کسب و ہنر علم) صرف قرآن کریم کی دفتین کے اندر ہے، اس سے باہر اور کہیں نہیں. اس کے علاوہ تمام علوم اکتسابی ہیں. پھر یہ بھی دیکھئے قصۂ حضرت موسیٰؑ میں "اللہ کے بندے" نے کہا تھا کہ "وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ" (۱۸/۸۲) (میں نے یہ کچھ اپنے اختیار و فیصلہ سے نہیں کیا).

آج یہ جرأت کیسے ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا کام کرے جس کی قرآنی سند اس کے پاس نہ ہو اور پھر دعویٰ کرے کہ "مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ" (میں نے یہ اپنے فیصلہ سے نہیں کیا، بلکہ خدا کے

حکم سے کیا ہے!) آج خدا کے فیصلے اور اس کے احکام قرآنِ کریم کے اندر ہیں۔ جو شخص ان کے مطابق عمل اور حکم کرتا ہے وہی کہہ سکتا ہے کہ "مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ"۔ اس کے علاوہ کوئی لاکھ کشف والہام اور "عِلْمِ لَدُنِّی" کا مدعی ہو، اس کا اس قسم کا دعویٰ باطل ہے۔ جیسا کہ 'ابلیس و آدم' (باب فی) میں لکھا جا چکا ہے، کشف والہام (جسے مبنی بر "علم لدنی" کہا جاتا ہے) قوتِ نفسی کے مظاہرے ہیں جو اکتسابی طور پر حاصل کئے جا سکتے ہیں اور ظنی اور غیر یقینی ہیں۔ اس لئے نہ ان کا دین سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی یہ کسی کے لئے حجت قرار پا سکتے ہیں۔ حجت دینی کتاب اللہ ہی ہے جو سرتا پا یقین اور حقیقت ہے۔

[قصۂ حضرت موسیٰ اور "خدا کے اس بندے" کے سلسلہ میں' میں نے "مفہوم القرآن" میں آیت (۱۸/۸۲) کے فٹ نوٹ میں جو تشریح پیش کی ہے' اسے بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے۔]

وَلَقَدۡ كَتَبۡنَا فِى الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّكۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوۡنَ ۝ (۲۱/۱۰۵)

سطوتِ داؤدی

و

شوکتِ سلیمانی

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

حضرت داؤد علیہ السّلام

ہم گذشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ جناب طالوت، بنی اسرائیل کے کمانڈر مقرر ہوئے تھے جن کی زیرِ سرکردگی حضرت داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا تھا۔ حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ نے ملک وسلطنت کے ساتھ ساتھ نبوت ورسالت سے بھی سرفراز فرمایا۔ ان کا زمانہ قریب سنہ ۱۰۰۰ ق م سمجھنا چاہیے۔ قرآن کریم میں فقط اتنا ہے کہ آپ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے تھے۔

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۶/۸۴)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق (اور (اسحاق کا بیٹا) یعقوب دیا۔ ہم نے ان سب کو راہِ راست دکھائی اور ابراہیم سے پہلے نوح کو دکھا چکے ہیں۔

اور ابراہیم کی نسل سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی (یہی) راہ دکھائی۔ ہم اسی طرح حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

آپ پر زبور نازل ہوئی تھی۔ (۴/۱۶۳ ؛ ۱۷/۵۵) جس میں وراثتِ ارضی کے آئین و قوانین مذکور تھے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۲۱/۱۰۵)

اور دیکھو) ہم نے زبور میں تذکیر و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ " زمین کی وراثت انہی بندوں کے حصے میں آئے گی جو اپنے اندر وراثتِ ارضی کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔

یہ کتاب، تورات (عہدِ عتیق) کے مجموعہ میں شامل ہے اور جو حال تحریف و الحاق کے اعتبار سے خود تورات کا ہے وہی اس مجموعہ کی دوسری کتابوں کا بھی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ (اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ) کو علم عطا فرمایا تھا۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۷/۱۵)

اور ہم نے داؤد اور (اس کے بیٹے) سلیمٰن کو علم (نبوت) عطا فرمایا۔ چنانچہ (شکر گزاری کے طور پر) وہ دونوں پکار اٹھے " اس خدا کی ہزار ہزار تعریف ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر (علمِ نبوت کے لئے منتخب فرما کر) برتری بخشی۔

اور بالخصوص معاملہ فہمی اور قوتِ فیصلہ۔

وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ ۝ (۳۸/۲۰)

ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کر دیا اور (مزید برآں) ہم نے اسے دانائی اور معاملہ فہمی عطا فرمائی۔

اور اس قوتِ فیصلہ کے ساتھ چونکہ شرفِ نبوت بھی حاصل تھا اس لئے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ فیصلے حق پر مبنی ہوں اور ذاتی رجحانات کسی معاملے پر اثر انداز نہ ہونے پائیں۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝ۧ (۳۸/۲۶)

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں (گذشتہ طاقتوں کا) جانشین بنا دیا ہے۔ پس تم لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو اور اپنے جذبات کی پیروی نہ کرو اور (اگر تم نے ایسا کیا تو یہ چیز تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی (یاد رکھو) جو لوگ اللہ کے راستے

سے بھٹک جاتے ہیں تو چونکہ وہ حساب (اور مکافاتِ عمل) کے دن کو بالکل بھول جاتے ہیں
اس لئے ان کے واسطے (بہت ہی) سخت عذاب ہے۔

اس لئے آپ کے متعلق فرمایا کہ وہ صاحبِ قوت بھی تھے (اور استخلاف فی الارض قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں)۔ لیکن یہ قوت، قوتِ فرعونی نہیں تھی، بلکہ اس عظیم الشان قوت وحکومت کے ساتھ ساتھ ان کی جبینِ نیاز آستانۂ ایزدی پر جھکی رہتی تھی۔ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (۳۸/۱۷) وہ قانونِ خداوندی کے مطیع ومنقاد تھے اور اس کے بدلے میں اللہ نے بڑے بڑے سرکش قبائل کو ان کا مطیع وفرماں بردار بنا رکھا تھا۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ ۙ وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝ (۳۸/۱۸-۱۹)

بلاشبہ ہم نے پہاڑی قبائل کو اس کے لئے مسخر کر دیا تھا کہ صبح وشام اس کے ساتھ "تسبیح" کرتے تھے اور قبیلہ طَیر کو جمع کر دیا تھا۔ سب کے سب اس کی طرف رجوع ہونے والے (مطیع ومنقاد) تھے۔

اس آیت میں الجبال کے معنی پہاڑی قبائل بھی ہو سکتے ہیں اور الطیر کے معنی قبیلہ کے منتشر خانہ بدوش افراد جن سے شاہی رسالے (گھوڑوں کے رسالے) مرتب ہوتے تھے۔ تسبیح کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مطلب، تسبیح کے دانے گننا نہیں ہوتا بلکہ فرائضِ مفوضہ کی سرانجام دہی میں پوری پوری قوتوں سے سرگرمِ عمل رہنا ہے۔ لہٰذا اس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ بڑے بڑے سرکش پہاڑی قبائل حضرت داؤدؑ کے تابع فرمان تھے جو ان کے ساتھ، ان کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں دن رات سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ نیز خانہ بدوش قبیلہ طَیر کے افراد کو بھی اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ ان پر حضرت داؤدؑ کے گھوڑوں کے رسالے مشتمل تھے۔ نیز دھاتوں سے اسلحہ سازی کا کام لیا جاتا تھا ـــــ (۳۴/۱۰-۱۱)۔ یہی ایک مردِ مومن کی خصوصیت ہے کہ یہ جب اس کا ہو جاتا ہے جس کی ساری دنیا ہے۔ تو پھر ساری دنیا اس کی ہو جاتی ہے۔ یہ اس کے حضور جھکا ہوا اور ساری دنیا اس کے حضور جھکی ہوئی۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔

وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝
وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ

فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ٥ (۷۹-۸۰/۲۱)

اور ہم نے داؤد کے لئے پہاڑی قبائل کو مسخر کر دیا تھا کہ وہ تمام امور کو سرانجام دیتے اور اسی طرح قبیلہ طیر کو بھی اور ہم ایسا ہی کرنے والے تھے (مزید برآں) ہم نے اسے تمہارے لئے زرہ بکتر بنانا سکھایا کہ وہ تمہیں ایک دوسرے کی زد سے بچائے تو کیا تم (ہماری نوازشات کے) شکر گزار نہیں ہوتے۔

قرآن کریم نے حضرت داؤدؑ کے کوائفِ حیات کی تفصیل نہیں دی۔ البتہ ان کے ایک فیصلے کا ذکر خصوصیت سے فرمایا ہے۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ٥ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ٥ (۷۸-۷۹/۲۱)

اور داؤد اور سلیمان (کا معاملہ بھی یاد کرو) جب انھوں نے ایک کھیت کے معاملہ میں کہ لوگوں کی بکریاں اس میں منتشر ہو گئی تھیں، فیصلہ کیا تھا اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھ رہے تھے۔ پس ہم نے سلیمان کو اس بات کی پوری سمجھ دے دی اور ہم نے فیصلہ کرنے کا منصب (اور نبوت کا) علم، ان میں سے ہر ایک کو عطا فرمایا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ کوئی ایسا مقدمہ پیش آیا تھا جس میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں نے فیصلہ دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے فیصلے کو زیادہ صائب قرار دیا۔ سورۃ ص میں بھی ایک تنازعہ کا ذکر ہے۔ اس کا ذکر سورۃ ص کی آیات ۲۱ تا ۲۶ میں آیا ہے۔ یہ واقعہ اتنا اہم اور اس میں جو حقیقت پوشیدہ ہے وہ ایسی عالمگیر ہے کہ ہم ان آیات کا مفہوم — مفہوم القرآن سے نقل کرتے ہیں جس سے ساری بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ (آپ کا جی چاہے تو آپ قرآن کریم کھول کر سامنے رکھ لیں اور متعلقہ آیات کو وہاں دیکھ کر، اس مفہوم کو سمجھتے جائیں) مفہوم یہ ہے۔

(اُس کی قوم بڑی جاہل اور وحشی تھی — ایسی جاہل کہ عام آدابِ معاشرت تک سے بھی واقف نہیں تھی۔ وہ اپنے معاملات اُس کے سامنے پیش کرنے کے لئے آتے تو نہ وقت دیکھتے نہ راستہ۔ جب اور جدھر سے جی چاہا آگھستے۔ وہ اس پر بھی برافروختہ نہ ہوتا اور اُن سے مُنہ نہ موڑتا۔ بلکہ نہایت سکون و

ثبات سے ان کی اصلاح کی فکر کرتا رہتا۔ ایک مصلح کا یہی انداز ہونا چاہیئے (مثلاً) ایک دفعہ وہ اپنے گھر کے اندر کسی کام میں مصروف تھا کہ اس نے دیکھا کہ دو آدمی، دیوار پھاند کر اندر گھس آئے ہیں۔

وہ گھبرا گیا کہ نہ معلوم ان کی نیت کیا ہے جو یہ اس طرح دیوار پھاند کر، اچانک، اس کے مکان کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم ایک مقدمہ کے دو فریق ہیں۔ ہم میں باہمی جھگڑا ہو گیا ہے اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتا ہے۔ سو ہم میں حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ دیکھنا! تم ناانصافی نہ کرنا۔ ہمیں عدل و انصاف کی راہ پر لگا دینا۔

(کوئی اور ہوتا تو انہیں ڈانٹ کر باہر نکال دیتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ انہوں نے بربنائے جہالت ایسا کیا ہے۔ اس لئے اس نے انہیں آرام سے سمجھایا اور پھر کہا کہ اچھا! اب تم اپنا واقعہ بیان کرو۔ اس پر مستغیث نے کہا کہ سنو)۔ یہ میرا بھائی ہے۔ (اب دیکھو کہ یہ بھائی ہو کر مجھ سے برتاؤ کیا کرتا ہے؟) اس کے پاس ننانوے (۹۹) دنبیاں ہیں۔ اس لئے بڑا خوش حال ہے اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ (اب، بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ مدد کرے) مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دے دے۔ (چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحبِ اثر، اس لئے) باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے (اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں — یہ ہے میرے اس بھائی کا رویہ! اب بتاؤ کہ اس کا یہ مطالبہ جائز ہے یا ناجائز)۔

داؤدؑ نے کہا کہ اس شخص کا یہ مطالبہ کہ اپنی ننانوے دنبیوں کو سو بنا لے اور تیرے پاس ایک دنبی بھی نہ رہنے دے، سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ جب بھی مل جل کر رہتے یا باہمی شراکت سے کاروبار کرتے ہیں، تو ان میں سے اکثر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ ایسا کچھ وہ لوگ نہیں کرتے جو قوانینِ خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کرتے ہیں۔ — لیکن ایسے لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

(داؤدؑ نے جب اس معاملہ کی گہرائی پر غور کیا تو یہ حقیقت، اس کی سمجھ میں آگئی کہ معاملہ صرف اُن دنبیوں کا نہیں۔ یہ اُس غلط معاشی نظام کا سوال ہے جس میں بڑا سرمایہ، چھوٹے سرمایہ کو اپنی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور دن بدن، معاشرہ کے ان دو طبقات میں بُعد، زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے چنانچہ اس نے محسوس کیا کہ یہ اُس کا فریضہ ہے کہ اس غلط معاشی نظام کو

صحیح خطوط پر متشکل کرے)۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس کے لئے اس نے اپنے رب سے سامانِ حفاظت طلب کیا ــــ ایسی بلند ہمت جس سے وہ تمام مخالفتوں کا مقابلہ کر سکے ــــ اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق معاشرہ کی اصلاح کر کے رہے گا۔

ہم نے اُس کے لئے سامانِ حفاظت بہم پہنچا دیا ــــ وہ ہر معاملہ میں ہمارے قوانین سے قریب تر رہتا تھا اس لئے اس کے تمام معاملات کا مآل نہایت حسین اور خوشگوار ہوتا تھا۔

چنانچہ ہم نے اس سے کہہ دیا کہ (تم بالکل اطمینان اور بے خوفی سے معاشرہ کی اصلاح کرو)۔ ہم نے تمہیں ملک میں حکومت عطا ہی اس لئے کی ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کرو یعنی قوانینِ خداوندی کی رُو سے، عدل و انصاف کے مطابق ــــ اور کسی کے خیالات اور جذبات کا اتباع (اور رعایت) مت کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں صحیح راستے سے بہکا دیں گے ــــ یاد رکھو! لوگ صحیح راستے سے اس لئے بہک جاتے ہیں کہ وہ ہمارے قانونِ مکافات کو فراموش یا نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ سخت تباہی ہوتا ہے۔

افسانہ طرازیاں

قرآن کریم میں فقط اتنا ہی ہے اور بات بالکل واضح ہے لیکن تورات اٹھا کر دیکھئے کہ اس میں اس قدر افسانہ طرازی سے کام لیا گیا ہے اور خدا کے اس مقدس رسول کی شانِ اطہر کی طرف ایسی خرافات منسوب کی گئی ہیں جن کے تصوّر سے انسانیت کا جگر کانپ اُٹھے۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ اس لغویت کو یہاں نقل کیا جاتا لیکن آسمانی کتاب انسانی تحریف و الحاق کے تقابل کے لئے یہ ناگزیر ہے۔ اس لئے طوعاً و کرہاً اسے درج کیا جاتا ہے۔ تورات (سموئیل کی کتاب' حصہ دوم' باب ۱۱) میں لکھا ہے۔

> اور ایک دن شام کو ایسا ہوا کہ داؤد اپنے بچھونے پر سے اٹھا اور بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور وہاں سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے اس عورت کا حال دریافت کرنے کو آدمی بھیجے۔ انہوں نے کہا، کیا وہ الِعام کی بیٹی بت سبع جو حتّی اوریا کی جورو ہے؟ اور داؤد نے لوگ بھیج کے اس عورت کو بلا لیا۔ چنانچہ وہ اس کے پاس آئی اور وہ اس سے ہم بستر ہوا۔ کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک

ہوئی تھی اور وہ اپنے گھر کو چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہوگئی۔ سو اس نے داؤد پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں۔ (سموئیل ۲، باب ۱۱، آیات ۲۔۵)

معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ یہ سب کچھ خدا کے ایک برگزیدہ رسول کے متعلق ''آسمانی کتاب'' میں درج ہے! اس کے بعد لکھا ہے کہ (حضرت) داؤدؑ نے (خاکم بدہن) ایک مکروہ چال سے اس عورت کے خاوند کو جنگ میں بھجوا دیا اور خاص خفیہ ہدایات کے ماتحت اسے ایسے مقام پر رکھا جہاں سے وہ بچ کر نہ آسکے چنانچہ وہ جنگ میں مارا گیا اور یوں (حضرت) داؤد علیہ السلام اس عورت کو اپنے گھر لے آئے۔ اس کے بعد باب نمبر ۱۲ میں مذکور ہے۔

اور خداوند نے ناتن کو داؤد کے پاس بھیجا۔ اس نے اس کے پاس آکے اس سے کہا، ایک شہر میں دو شخص تھے، ایک تو دولت مند اور دوسرا کنگال۔ اس مالدار پاس بہت بے شمار بھیڑ، بکری اور گائے بیل کے گلے تھے، پر اس کنگال پاس بھیڑ کی اس پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا جسے اس نے مول لیا تھا اور پالا تھا اور وہ اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ بڑھی تھی اور اس کے پیالے سے پیتی تھی اور اس کی گود میں سوتی تھی اور اس کی بیٹی کی جگہ تھی۔ اور ایسا اتفاق ہوا کہ ایک مسافر دولت مند پاس آیا۔ سو اس نے اپنے گائے بیل اور بھیڑ بکری کو بچا رکھا اور اس مسافر کے لئے جو اس پاس آیا تھا نہیں پکایا، بلکہ اس کنگال کی بھیڑ لے لی اور اس شخص کے لئے جو اس پاس آیا تھا پکا ڈالی۔ تب داؤد کا غصہ اس شخص پر بہ شدت بھڑکا اور اس نے ناتن کو کہا زندہ خداوند کی قسم کہ وہ شخص جس نے یہ کام کیا واجب القتل ہے۔ سو وہ شخص جو گنی پٹھیا اسے پھیر دے، کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور کچھ رحم نہ کیا۔

تب ناتن نے داؤد کو کہا کہ وہ شخص تو ہی ہے۔ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا ہے کہ میں نے تجھے مسح کیا تاکہ اسرائیلیوں پر سلطنت کرے۔ اور میں نے تجھے ساؤل کے ہاتھ سے چھڑایا اور میں نے تیرے آقا کا گھر تجھے دیا اور تیرے آقا کی جوروؤں کو تیری گود میں دیا اور اسرائیل اور یہوداہ کا گھرانہ تجھ کو دیا اور اگر یہ سب کچھ تھوڑا تھا تو میں تجھ کو فلانی فلانی چیز بھی دیتا۔ سو تو نے کیوں خداوند کے حکم کی تحقیر کر کے اس کے آگے بدی کی؟ کہ تو نے حتی اوریا کو تیغ سے قتل کروایا

اور اسکی بیوی لے لی تاکہ وہ تیری بیوی بنے اور اسکو بنی عمون کی تلوار سے مروا ڈالا سو اب تیرے گھر سے تلوار کبھی جاتی نہ رہیگی کہ تو نے مجھے حقیر کیا اور حتی اوریاہ کی جورو کو لے کے اپنی جورو کیا۔ (سموئیل ۲ ۱۲/۱۰-۱)

یہ تو رہا حضرت داؤدؑ کے متعلق۔ اسی کتاب میں آپ کے ایک بیٹے کا حسب ذیل قصہ لکھا ہے۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ داؤد کے بیٹے ابی سلوم کی ایک خوبصورت بہن تھی جس کا نام تمر تھا۔ اس پر داؤد کا بیٹا امنون عاشق ہوا۔ اور امنون ایسا بے چین ہوا کہ اپنی بہن تمر کے لئے بیمار پڑا کیونکہ وہ کنواری تھی۔ سو امنون نے اس سے کچھ کرنا اپنے لئے دشوار جانا اور داؤد کے بھائی سمعہ کا بیٹا یونددب' امنون کا دوست تھا اور یوندب بڑا داتا شخص تھا سو اس نے اس سے کہا کہ تو بادشاہ کا بیٹا ہو کے کیوں دن بدن دُبلا ہوتا جاتا ہے؟ کیا تو مجھے خبر کرے گا؟ تب امنون نے اس سے کہا کہ میں اپنے بھائی ابی سلوم کی بہن تمر پر عاشق ہوں۔ سو یوندب نے اس سے کہا کہ تو بستر پر پڑا رہ اور اپنے تئیں بیمار رہنا اور جب تیرا باپ تجھے دیکھنے آئے، تو تُو اسے کہہ کہ میری بہن تمر کو پروانگی دیجئے کہ آئے اور مجھے بھی کھلائے پلائے اور میرے سامنے کھانا پکائے تاکہ میں دیکھوں اور اس کے ہاتھ سے کھاؤں۔

تب امنون پڑا رہا اور اپنے تئیں بیمار بنایا اور جب بادشاہ اس کے دیکھنے کو آیا تو امنون نے بادشاہ سے کہا کہ میری بہن تمر کو آنے دیجئے کہ وہ میرے سامنے دو پھلکے پکائے، تاکہ میں اس کے ہاتھ سے کھاؤں۔ سو داؤد نے تمر کے گھر کہلا بھیجا کہ تو ابھی اپنے بھائی امنون کے گھر جا اور اس کے لئے کھانا پکا۔ سو تمر اپنے بھائی امنون کے گھر گئی اور وہ بستر پر پڑا ہوا تھا اور اس نے آٹا لیا اور گوندھا اور اس کے لئے پھلکے پکائے اور انہیں لیکر ایک قاب میں دھرا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کھانے سے انکار کیا۔ تب امنون نے کہا، سب مرد میرے پاس سے نکل جائیں اور ہر ایک اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ تب امنون نے تمر سے کہا کہ کھانا کوٹھری کے اندر لا' تاکہ میں تیرے ہاتھ سے کھاؤں۔ سو تمر نے وہ پھلکے جو پکائے تھے' لئے اور کوٹھری میں اپنے بھائی کے پاس لائی اور جب وہ کھانا اس کے سامنے لائی کہ اُسے کھلائے تو اس نے اسے پکڑا اور اس سے کہا کہ اے میری بہن آ مجھ سے ہمبستر ہو۔ وہ بولی نہیں میرے بھیا! مجھے رسوا نہ کر کہ اسرائیلیوں میں ایسا کرنا اچھا

نہیں۔ سو تو ایسی احمق نہ کر۔ اور میں کیا کروں گی کہ میری رسوائی رفع ہو اور تو بھی اسرائیلیوں کے احمقوں میں سے ایک کی مانند ہو گا۔ پس اب بادشاہ سے کہئے سو وہ مجھے تجھ سے منع نہ کریگا۔ لیکن اس نے اس کی بات نہ مانی کہ وہ اس سے زور آور تھا۔ سو اس سے زبردستی کی اور اس سے ہم بستر ہوا۔ (سموئیل ۲، ۱۔ ۱۳/۱۵)

غور فرمایئے! یہ ایک خانوادۂ نبوت کا ذکر ہو رہا ہے! استغفر اللہ۔ اور ذکر کس کتاب میں ہو رہا ہے تورات مقدس میں! یعنی اس کتاب میں جسے آسمانی کتاب کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی تورات میں حضرت داؤدؑ کے بڑھاپے کا ایک واقعہ یوں لکھا ہے۔

اور داؤد بادشاہ بوڑھا ہوا کہن سال ہوا اور وہ اس پر کپڑے اڑھاتے تھے پر وہ گرم نہ ہوتا تھا۔ سو اس کے خادموں نے اس سے کہا کہ ہمارے خداوند بادشاہ کے لئے ایک کنواری عورت ڈھونڈی جائے جو کہ بادشاہ کے حضور کھڑی رہے اور اس کی خبرگیری کیا کرے۔ اور اس کی گود میں سو رہا کرے، تاکہ ہمارا بادشاہ خداوند گرم ہو۔ چنانچہ انہوں نے اسرائیل کی ساری مملکت میں ایک نوجوان خوش شکل عورت کی تلاش کی اور شونمیت ابی شاگ کو لایا۔ سو اسے بادشاہ پاس لائے اور وہ جوان عورت بہت شکیل تھی۔ سو وہ بادشاہ کی خبرگیری اور اس کی خدمت کرتی تھی۔ لیکن بادشاہ نے اس سے صحبت نہ کی۔

(سلاطین ۱، ۴۔ ۱/۱)

ہماری کتبِ تفسیر

ایسی کتاب میں اگر حضرت داؤدؑ کے متعلق اوریا کی بیوی کا قصہ بھی درج ہے تو کیا تعجب؟ لیکن افسوس ہے کہ ہمارا مذہبی لٹریچر اس قسم کی لغویات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ معالم التنزیل تفسیر کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں ایک دلچسپ تمہید کے بعد اسی حیا سوز واقعہ کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

حضرت داؤدؑ نے اس عورت کو باغ میں حوض کے کنارے نہاتے ہوئے دیکھا۔ داؤدؑ کو اس کا حسن بہت پسند آیا اور بہت دیر تک اس کو دیکھتے رہے۔ اتنے میں اس عورت نے ان کا سایہ دیکھ لیا اور اپنے بال بکھیر لئے اور اپنے بدن کو ڈھانپ لیا۔ اس سے ان کا شوق اور بڑھا۔

اس کے بعد اس تدبیر کا ذکر ہے جس کی رُو سے حضرت داؤدؑ نے اس عورت کے خاوند کو اپنے بھانجے کی مدد سے میدانِ جنگ میں قتل کرا دیا اور پھر اس عورت سے نکاح کر لیا اور اس عورت کے بدن سے حضرت سلیمانؑ پیدا ہوئے۔ (استغفر اللہ) لیکن صاحبِ معالم التنزیل نے یہ افسانہ محض اپنے قیاس سے نہیں بلکہ ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس میں مذکور ہے۔

> "انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ سُنا میں نے رسول اللہؐ سے فرماتے تھے کہ جب داؤدؑ نبی نے اس عورت کی طرف دیکھا تو بنی اسرائیل پر اس نے ایک لشکر تیار کیا اور سپہ سالار کو حکم دیا کہ جب دشمن کا سامنا ہو تو فلاں آدمی کو تابوت کے آگے مقرر کر دینا۔ اور اس زمانے میں تابوت کے ساتھ نصرت طلب کی جاتی تھی۔ جو شخص تابوت کے آگے چلتا تھا نہیں لوٹتا تھا۔ حتیٰ کہ قتل کیا جاتا یا لشکر سے بھاگ جاتا۔ پس اس عورت کا خاوند قتل ہو گیا اور دو فرشتے نازل ہوئے جو اس کے سامنے اس کا قصہ بیان کرتے تھے۔ پس داؤدؑ سمجھ گیا اور سجدے میں گر پڑا اور چالیس رات تک سجدے میں پڑا رہا۔ حتیٰ کہ آنسوؤں سے سبزی اُگ کر اس کے سر سے گزر گئی...... الخ

حیرت ہے کہ ان بزرگوں کو یہ کچھ لکھتے وقت اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ یہ خرافات کس ہستی کے متعلق لکھی جا رہی ہیں اور کس ذاتِ اقدسؐ کی طرف منسوب کی جا رہی ہیں؟ یہ انسانیت سوز چیزیں ہمارے ہاں کس طرح گھس آئیں، یہ بادنیٰ تعمق ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔ جب یہودیوں نے دیکھا کہ ان کی مقدس کتاب میں اس قسم کے لغو افسانے مذکور ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی کتاب کو کسی طرح بھی مسلمانوں کے سامنے نہیں لا سکتے تھے اس لئے انہوں نے یہ کوشش کی کہ یہی چیزیں خود مسلمانوں کے ہاں رائج کر دی جائیں۔ اس کے لئے آسان طریقہ یہ تھا کہ ایک روایت وضع کر کے اُسے (پناہ بخدا) ذاتِ رسالت مآبؐ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ جب کوئی بات حضورؐ کی طرف منسوب ہو گئی تو پھر اس کے "حدیث" ہونے میں کیا شُبہ رہا۔ لہٰذا یہی روایات ہماری کتبِ تفاسیر کی اساس بن گئیں اور یوں اسلام جیسا نورانی دین اپنے مقام سے اُتر کر کتبِ یہود و نصاریٰ کی سطح پر آگیا۔ اب یہود و نصاریٰ کو کون الزام دے، جب خود مسلمانوں کے اپنے ہاں بھی ایسا ہی کچھ موجود ہو!

دیکھئے بات کتنی واضح ہے لیکن بایں ہمہ اگر آج کوئی شخص ان روایات کے صحیح ہونے سے اس بنا پر انکار کر دے کہ حضورؐ کی شانِ اقدس سے بعید ہے کہ وہ دیگر انبیاء کرام کی طرف اس قسم کی باتیں منسوب

فرماتے تو آپ کی پوری دنیائے مذہب اپنی انتہائی قوت و شدت سے اس کے خلاف محاذِ جنگ قائم کر لیتی ہے اور نہیں سوچتی کہ یہ حمایت کس بات کی ہو رہی ہے! لیکن الحمد للہ کہ قرآن کا نورانی دامن اس قسم کے سیاہ دھبوں سے پاک اور صاف ہے اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود ذاتِ باری تعالیٰ نے لیا ہے' اس لئے اس میں اس قسم کے خرافات باریابی نہیں پا سکتے۔ اس لئے ہم نہایت جرأت سے قرآن پیش کر سکتے ہیں کہ یہی اس آسمان کے نیچے خدا کی محفوظ و مصئون کتاب ہے' باطل جس کے نزدیک نہیں چھو سکا۔

حضرت داؤدؑ کا ضمنی ذکر آیات (۲/۲۵۱؛ ۵/۷۸) میں بھی آیا ہے۔

تورات کا ایک اور قصہ

شروع میں لکھا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم میں فقط اتنا ہی آیا ہے کہ حضرت داؤدؑ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے تھے لیکن تورات نے آپ کا پورا نسب نامہ بھی دیا ہے جس کی رُو سے آپ حضرت یوسفؑ کی اولاد میں سے نہیں بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے یہوداؔ کی اولاد ہیں۔ تورات میں حضرت سلیمانؑ کی والدہ (یعنی اوریا کی بیوی) کا جو قصہ مذکور ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں لیکن یہوداؔ کی نسل جس میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی شامل ہیں کس طرح آگے بڑھی تھی، یہ قصہ اس سے بھی زیادہ شرمناک ہے۔ کتابِ پیدائش میں مذکور ہے۔

> اور یہوداہ اپنے پلوٹھے بیٹے عیر کے لئے ایک عورت بیاہ لایا جس کا نام تمر تھا اور عیر یہوداہ کا پلوٹھا خداوند کی نگاہ میں شریر تھا، سو خداوند نے اسے مار ڈالا۔ تب یہوداہ نے اونان کو کہا کہ اپنے بھائی کی جورو کے پاس جا اپنی بھاوج کا حق ادا کر اور اپنے بھائی کے لئے نسل چلا، لیکن اونان نے جانا کہ یہ نسل میری نہ کہلائے گی اور یوں ہوا کہ جب وہ اپنے بھائی کی جورو کے پاس جاتا تھا تو نطفے کو زمین پر ضائع کرتا تھا، تا نہ ہو کہ اس کا بھائی اس سے نسل پائے اور اس کا یہ کام خداوند کی نظر میں بہت بُرا تھا۔ اس لئے اس نے اسے بھی ہلاک کیا۔ تب یہوداہ نے اپنی بہو تمر کو کہا کہ اپنے باپ کے گھر میں بیوہ بیٹھی رہ جب تک کہ میرا بیٹا سیلہ بڑا ہو۔ کیونکہ اس نے کہا نہ ہو کہ وہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح مر جائے۔ سو تمر اپنے

باپ کے گھر میں جا رہی۔ اور بہت دن گزرے کہ سوع کی بیٹی یہوداہ کی جورو مر گئی اور جب یہوداہ کو اس کا غم بھولا تو وہ اپنی بھیڑوں کی پشم کترنے والوں کے پاس تمنت میں اپنے دوست ادولامی حیرہ کے ساتھ گیا اور تمر سے یہ کہا گیا کہ دیکھ تیرا سسر اپنی بھیڑوں کی پشم کترنے والوں کے لئے تمنت کو جاتا ہے۔ تب اس نے اپنی بیوگی کے کپڑوں کو اتار پھینکا اور برقع اوڑھا اور اپنے کو لپیٹا اور عینیم کے مدخل میں جو تمنہ کے راستے پر ہے، جا بیٹھی، کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ سیلہ بڑا ہوا اور مجھے اس کی جورو نہیں کر دیا ہے۔ یہوداہ اسے دیکھ کر سمجھا کہ کوئی کسبی ہے کیونکہ وہ اپنا منہ چھپائے ہوئے تھی، اور وہ راہ سے اس کی طرف کو پھرا اور کہا کہ چلئے مجھے اپنے ساتھ خلوت کرنے دیجئے، کہ اس نے نہ جانا کہ یہ میری بہو ہے۔ اس نے کہا کہ تو جو میرے ساتھ خلوت کرے گا، مجھے کیا دے گا؟ وہ بولا میں گلے میں سے بکری کا ایک بچہ بھیجوں گا۔ اس نے کہا کہ تو مجھے جب تک اسے بھیجے، کچھ گرو دے گا؟ وہ بولا کہ میں کیا گرو تجھے دوں؟ وہ بولی اپنی چھاپ اور اپنا بازوبند اور اپنی لاٹھی، جو تیرے ہاتھ میں ہے۔ اس نے دیا اور اس کے ساتھ خلوت کی اور وہ اس سے حاملہ ہوئی۔ پھر وہ اٹھی اور چلی گئی اور برقع اتار رکھا اور رنڈاپے کا جوڑا پہن لیا، اور یہوداہ نے اپنے دوست ادولامی کے ہاتھ بکری کا بچہ بھیجا تاکہ اس عورت کے ہاتھ اپنا گرو پھیر لائے، پر اس کو نہ پایا۔ تب اس نے اس جگہ کے لوگوں سے پوچھا کہ وہ بیسوا جو عینیم میں راستے پر نظر آتی تھی، کہاں ہے؟ وہ بولے کہ یہاں کوئی کسبی نہ تھی۔ تب وہ یہوداہ کے پاس پھر آیا اور کہا کہ میں اسے نہیں پا سکتا ہوں اور وہاں کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ کسبی وہاں پر نہ تھی۔ یہوداہ بولا کہ خیر وہی لے نہ ہو کہ ہم بدنام ہوں، دیکھ میں نے تو بکری کا بچہ بھیجا پر تو نے اسے نہ پایا۔

اور یوں ہوا کہ قریب تین مہینے کے بعد یہوداہ سے کہا گیا کہ تیری بہو تمر نے زنا کیا اور دیکھ اسے چھنالے کا حمل بھی ہے۔ یہوداہ بولا کہ اسے باہر لاؤ کہ وہ جلائی جائے۔ جب وہ نکالی گئی اس نے اپنے سسر کو کہلا بھیجا کہ مجھے اس شخص کا حمل ہے جس کی یہ چیزیں ہیں اور کہا دریافت کیجئے یہ چھاپ اور بازوبند اور یہ عصا کس کا ہے؟ تب یہوداہ نے اقرار کیا اور کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ صادق ہے، کیونکہ میں نے اسے اپنے بیٹے سیلہ کو نہ دیا۔

لیکن وہ پھر اس سے ہمبستر نہ ہوا۔

اور اس کے جننے کے وقت میں یوں ہوا کہ اس کے پیٹ میں توام تھے اور جب وہ جننے لگی تو ایک بچے کا ہاتھ نکلا اور دائی جنائی نے پکڑ کر اس کے ہاتھ میں نارا باندھ کر کہا کہ یہ پہلے نکلا۔ اور یوں ہوا کہ اس نے اپنا ہاتھ پھر کھینچ لیا اور کیا دیکھتی ہے کہ وہیں اس کا بھائی نکل آیا اور وہ بولی تو کیا ہی پھاڑتا ہے؟ یہ پھاڑ تجھ پر آوے گی۔ سو اس کا نام فارص رکھا گیا۔ بعد اس کے اس کا بھائی جس کے ہاتھ میں نارا باندھا تھا نکل آیا اور اس کا نام زارح رکھا گیا۔ (پیدائش ۶ ـ ۳۰/۳۸)

یہی فارص یا فرص ہے جس کی اولاد میں حضرت داؤدؑ بتائے گئے ہیں۔ اور حضرت داؤدؑ ہی کیا، حضرت مریمؑ کے شوہر (یوسف) بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ چنانچہ انجیل متی کے پہلے باب میں یہ تمام سلسلۂ نسب موجود ہے۔

غور فرمایئے کہ آج جن کتابوں کو آسمانی اور الہامی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ کن خرافات کا مرقع بن کر رہ گئی ہیں۔ لیکن انسان کی مسخ شدہ فطرت (یا یوں کہیئے کہ جذباتِ عقیدت و تعصب کی داد دیجئے کہ اس کے باوجود ایک دنیا ہے کہ انہیں آسمانی تصور کئے جا رہی ہے اور حقیقت (قرآنی حقائق) کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام
(۹۵۰ ق.م)

حضرت داؤدؑ کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ ان کے جانشین ہوئے۔

وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝ (۲۷/۱۶)

اور (دیکھو) سلیمان داؤد کا وارث ہوا اور کہنے لگا "لوگو! ہمیں منطق الطیر سکھایا گیا ہے اور ہر چیز عطا کی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ تو خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔

اس آیت میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ باپ (حضرت داؤدؑ) کے بعد بیٹے (حضرت سلیمانؑ) کی جانشینی کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں اندازِ حکمرانی موجودہ زمانے سے مختلف تھا۔ اس وقت کی قبائلی سی زندگی میں، رئیس قبیلہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہی زندگی جب ذرا اور وسیع ہو جاتی تھی تو قومی زندگی بن جاتی تھی جس میں پھر سردارِ قوم کو بڑی اہمیت حاصل رہتی تھی۔ بنی اسرائیل میں بھی اس زمانے میں یہی قومی اندازِ زندگی مروّج تھا۔ باقی رہی نبوت، سو اس میں کسی قسم کے نسبی تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ خالصۃً عطیۂ خداوندی تھا جو اس قلب کو عطا ہوتا تھا جو اس کے لئے خاص طور پر چنا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل میں سلسلۂ نبوت مسلسل چلا آرہا تھا۔ یہ مشیّت خداوندی کے پروگرام کے مطابق تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ منطق الطیر کے معنی "پرندوں کی بولی" نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں،

طیر سے مراد گھوڑوں کا لشکر ہے (جو حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے زمانہ میں بیشتر قبیلہ طیر کے افراد پر مشتمل تھا) اور منطق کے معنی اس لشکر کے قواعد و ضوابط ہیں۔ لہٰذا اس سے مطلب ہے گھوڑوں کے رسالہ کے متعلق علم۔ یہ اُس زمانہ میں بہت بڑی چیز تھی۔

حضرت سلیمانؑ خدا کے برگزیدہ بندے اور اس کی بارگاہِ صمدیت کے حضور جھکنے والے تھے۔

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ؕ (۳۸/۳۰)

اور (دیکھو) ہم نے داؤد کو سلیمان (سا بیٹا) عطا کیا۔ وہ کیسا اچھا بندہ تھا۔ بلاشبہ وہ خدا کی طرف بہت ہی رجوع ہونے والا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و حکمت سے نوازا تھا۔

وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؗ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ (۲۱/۷۹) نیز (۲۷/۱۵)

اور ہم نے حکم دینے کا منصب اور (نبوت کا) علم ان میں سے ہر ایک کو عطا فرمایا تھا۔ نیز ہم نے پہاڑی قبائل کو داؤد کے لئے مسخر کر دیا تھا جو اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتے تھے اور اسی طرح قبیلہ طیر کے افراد کو بھی اور ہم ایسا ہی کرنے والے تھے۔

حضرت سلیمانؑ کی قوتِ فیصلہ کے متعلق سابقہ عنوان (حضرت داؤدؑ) میں ذکر آچکا ہے۔ آپ کی عہدِ حکومت میں بنی اسرائیل کی جاہ و حشمت اور عروج و اقبال اپنے نقطۂ کمال پر تھا۔ بڑی بڑی سرکش قومیں (شیاطین و جنات) آپ کے تابع فرمان تھیں۔ عظیم القدر شہنشاہ، خراج و تحائف پیش کرنے کے لئے آپ کی بارگاہِ جلالت و سطوت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ خشکی پر ان کے جنود و عساکر مسلط تھے۔ سمندروں میں ان کے جہاز بازو (بادبان) پھیلائے اڑے چلے جاتے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے سنگین قلعے تعمیر کرائے۔ یروشلم کا مقدس ہیکل معرضِ وجود میں آیا۔ گھوڑوں کے رسالے کی مدد سے ڈاک کا سلسلہ قائم ہوا۔ غرضیکہ شادابی و شگفتگی، مرفہ الحالی، جاہ و جلال، جبروت و سطوت پوری بہار پر تھی۔

(دیکھئے ۲۱/۸۱؛ ۳۴/۱۲؛ ۳۸/۳۶)۔

سورۂ صٓ میں ہے:

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً

حَيْثُ اَصَابَ ۙ (۳۸/۳۶)

چنانچہ ہم نے اس کے لیے (سمندر کی تند) ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم کے مطابق، جہاں وہ جانا چاہتا تھا، نرمی سے چلتی تھیں۔

جب تک دخانی جہازوں کی ایجاد نہیں ہوئی تھی کشتیوں کے چلانے میں ہوائیں سب سے بڑی قوت تھیں. جہاں تک تاریخ شاہد ہے حضرت سلیمانؑ نے پہلے پہل بادبانوں سے ہواؤں کو مسخر کیا۔ نقشے میں دیکھئے۔ فلسطین کے شمال و مغرب میں بحرِ متوسط اور جنوب کی طرف بحرِ احمر واقع ہے۔ ان دونوں سمندروں میں مخالف سمت کی ہوائیں چلتی رہتی ہیں جن سے دور دراز کے ملکوں کا سامان فلسطین تک آ پہنچتا ہے اور یوں دنیا بھر کی برکت اس "ارضِ مقدس" میں جمع ہو جاتی ہے۔ تورات میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا بحری بیڑہ بڑا زبردست تھا۔

> پھر سلیمان بادشاہ نے عصیون جبر میں جو ایلوت کے نزدیک ہے، دریائے قلزم کے کنارے پر جو ادوم کی سرزمین میں ہے جہازوں کی بحر بنائی اور حیرام نے اس بحر میں اپنے چاکر ملاح جو سمندر کے حال سے آگاہ تھے سلیمان کے چاکروں کے ساتھ کر کے بھجوائے اور وہ اوفیر کو گئے اور وہاں سے چار سو بیس قنطار سونا لے کے سلیمان بادشاہ کے پاس آئے۔
>
> (سلاطین ۹/۲۸-۲۶)

شیاطین و جنّاتِ سلیمانی

پھر بڑی بڑی سرکش قومیں اور وحشی قبائل آپ کے زیرِ تسخیر تھے جن سے مختلف نوعیتوں کا کام لیا جاتا تھا۔

وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۙ (۲۱/۸۲)

اور سرکش لوگوں میں سے ایسے جو سلیمان کی خاطر (سمندروں میں) غوطے لگاتے اور اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے کام کرتے اور ہم انہیں اپنی پاسبانی میں لیے ہوئے تھے۔

(نیز دیکھئے ۱۲-۱۳/۳۴ ؛ ۳۷-۴۰/۳۸)

جیسا کہ "ابلیس و آدم" میں "جنّات" کے عنوان میں بیان کیا جا چکا ہے، حضرت سلیمانؑ کے عہد کے جنات سے مراد وہ وحشی اور خانہ بدوش قبائل ہیں جو شہر والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ

نے ان قبائل کو اکٹھا کیا اور ان سے ہیکل کی تعمیر میں مزدوروں کا کام لیا۔ چنانچہ تورات میں ہے۔

اور یہی باعث ہے جس سے سلیمان بادشاہ نے لوگوں کی بیگار لی کہ خداوند کا گھر اور اپنا قصر اور ملّو اور یروشلم کی شہر پناہ اور حصور اور مجدّد اور جزر بھی بنا کرے۔ (سلاطین ۱، ۹/۱۵)

ان بیگاریوں کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے۔

اور سلیمان نے ارادہ کیا کہ خداوند کے نام کے لیئے ایک گھر اور اپنی سلطنت کے لیئے ایک گھر بنائے۔ اور سلیمان نے ستر ہزار بار برداروں اور پہاڑ میں اسّی ہزار پتھر توڑنے والوں کو ٹھیرایا اور تین ہزار چھ سو آدمی کہ ان سے کام لیں۔ (تواریخ ۲، ۱-۲/۲)

یہ مزدور اسرائیلی نہ تھے بلکہ ان سے غیر تھے۔

اور سلیمان نے اسرائیل کے ملک میں کے سارے پردیسیوں کو گنوایا، بعد اس کے گننے کے جو اس کے باپ داؤد نے گنوایا تھا اور وہ ایک لاکھ ترپن ہزار چھ سو ٹھیرے اور اس نے ان میں سے ستر ہزار کو بار برداری پر اور اسّی ہزار کو پہاڑ کے پتھر توڑنے پر مقرر کیا اور ان پر تین ہزار چھ سو کروڑیئے ٹھیرائے کہ لوگوں سے کام لیں۔

(تواریخ ۲ ۱۷-۲/۱۸)

دوسری جگہ ہے۔

لیکن وہ ساری گروہ جو حتّیوں اور اموریوں اور فرزّیوں اور حوّیوں اور یبوسیوں سے باقی رہی، اور اسرائیلی نہ تھی، ہاں ان کی اولاد جو بعد ان کے زمین میں باقی رہی جنہیں بنی اسرائیل نے نابود نہیں کیا، سو سلیمان نے ان سے خراج کے بدلے کام لیا جیسا کہ آج کے دن ہوتا ہے، لیکن سلیمان نے اپنے کام کیلئے بنی اسرائیل میں سے کسی کو مزدور ہونے کے واسطے مقرر نہ کیا کہ وہ جنگی مرد اور اس کے لشکر کے سردار اور اس کی گاڑیوں اور اس کے سواروں کے بندوبست کرنے والے تھے۔ (تواریخ ۲، ۷-۸/۹)

ان تفاصیل میں "جنّاتِ سلیمانی" کا مفہوم واضح ہو گیا ہو گا، یعنی وہ وحشی قبائل جو شہروں سے دور جنگلوں اور پہاڑوں میں نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔

آیاتِ مذکورۂ صدر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں صنعت و حرفت کتنی ترقی کر چکی تھی۔ نیز

یہ بھی کہ حضرت سلیمانؑ ان کاریگروں سے تماثیل بھی بنواتے تھے. تماثیل کا لفظ تصاویر اور مجسمات دونوں کے لئے بولا جا سکتا ہے. اس سے ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں مصوری (painting) یا مجسمہ سازی (sculpture) کا بھی رواج ہو چکا تھا.

بحری بیڑے کے علاوہ حضرت سلیمانؑ کا بری لشکر بھی بڑا عظیم الشان تھا جس میں کوہستانی عسکری قبائل اور مہذب آبادی کے افراد سب شامل تھے.

وَ حُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وَ الطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ۝ (۲۷/۱۷)

اور (دیکھو) سلیمان کے لئے ہر قسم کے لشکر جمع کر دیئے تھے کیا از قسم وحشی اور بدوی قبائل اور کیا از قسم متمدن اور حضری قبائل نیز گھوڑوں کے رسالے (کثرتِ تعداد کی وجہ سے اژدہام ہو جانے پر) انہیں روکا جاتا (اور ضبط کے اندر رکھا جاتا) تھا.

گھوڑوں کے متعلق سورۃ صٓ میں ہے.

اِذْ عُرِضَ عَلَیْهِ بِالْعَشِیِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ ۝ فَقَالَ اِنِّیْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝ رُدُّوْهَا عَلَیَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ۝ (۳۸/۳۳-۳۱)

جب سلیمان کے سامنے شام کے وقت اصیل اور عمدہ گھوڑے پیش کئے گئے تو سلیمان پکار اُٹھے (یاد رکھو) میں نے ان کی محبت کو اس لئے پسند کیا ہے کہ یہ خدا کے کام کریں گے. حتّٰی کہ وہ آگے بڑھتے ہوئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے. آپ نے پھر اپنے ملازموں کو حکم دیا' ان گھوڑوں کو ذرا پھر میرے سامنے لاؤ. انہوں نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (محبت سے)

ا؎ تورات (سلاطین نمبر ۱) ۲۸ — ۲۹/۱۵) میں ہے:

اور سلیمان کے لئے مصر میں خاص قسم کے گھوڑے جمع ہوتے تھے اور بادشاہ کے سوداگران جمع ہوؤں کو مقررہ دام پر لیتے تھے. اور ایک گاڑی چھ سو مثقال پر مصر سے نکلتی اور اوپر لائی جاتی تھی اور گھوڑا ڈیڑھ سو مثقال پر اور اسی طرح حتیوں کے سارے بادشاہوں اور آرامی بادشاہوں کے لئے ان ہی کے ہاتھ سے نکال لاتے تھے.

ہاتھ پھیرنے شروع کردیئے اور انہیں سہلانے لگے۔

یہ لشکر ایسا عظیم الشان تھا کہ جس خطۂ ملک سے گزرجاتا وہاں کے لوگ خوف کے مارے اِدھراُدھر چھپ جاتے۔ اس سلسلہ میں سورۂ نمل میں جو تفصیل آئی ہے اسے ہم 'مفہوم القرآن' سے نقل کرتے ہیں تاکہ بات واضح ہوجائے۔ سورۂ نمل کی آیات (۱۹-۱۸/۲۷) میں ہے۔

(ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سلیمانؑ کو معلوم ہوا کہ سبا کی مملکت' اس کے خلاف سرکشی کا ارادہ رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ' بطور حفظِ ماتقدّم' اس کی طرف لشکر لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں وادیٔ نمل پڑتی تھی۔ ملکِ سبا کی طرح' اس مملکت کی سربراہ بھی ایک عورت تھی)۔ جب اس نے اس لشکر کی آمد کی خبر سُنی تو اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں جاکر پناہ گزیں ہوجائیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ لشکرِ جرّار اتنا معلوم کئے بغیر کہ تم اس کے دشمن کی قوم سے کسی قسم کا تعلق رکھتے ہو یا نہیں' تمہیں یونہی کچل ڈالے۔ (فوجیں یہی کچھ کیا کرتی ہیں۔ ان کے راستے سے ہٹ جانا ہی قرینِ مصلحت ہوتا ہے)۔

سلیمانؑ نے یہ سُنا تو مسکرایا (کہ یہ بے چارے سچے ہیں۔ انہوں نے یہی دیکھا اور سنا ہے کہ جب شاہی لشکر کہیں سے گزرتا ہے تو وہ اندھا دھند تباہی مچاتے چلا جاتا ہے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ کسی بادشاہ کا لشکر نہیں' خدا کے ایک رسول کی سپاہ ہے جس کا مقصد بے گناہوں کو ستانا نہیں ان کی حفاظت کرنا ہے)۔ پھر اس نے اپنے خدا سے دعا مانگی کہ بارِ الہا! مجھے تو نے اس قدر عظیم مملکت عطا کی ہے۔ تو اس کے ساتھ ایسا ضبط اور اپنے آپ پر کنٹرول بھی عنایت فرما کہ میں تیری اس نعمتِ عظمیٰ کو' جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر ارزاں فرمائی ہے' اس طرح صرف کروں کہ یہ نوعِ انسان کے لئے تباہی کا موجب بننے کے بجائے' ان کے معاملات کو سنوارنے کا ذریعہ بنے اور میرا ہر قدم' تیرے قوانین سے ہم آہنگ ہو۔ اس طرح میں' تیرے قانونِ ربوبیت و رحمت کی بنا پر' تیرے ان بندوں کے زمرے میں شامل ہوجاؤں جن کی صلاحیتیں نشوونما پالیتی ہیں اور جن کے ہاتھوں انسانیت کے معاملات سنورتے ہیں۔

قومِ سبا پہلے لکھا جاچکا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی سلطنت اتنی وسیع اور طاقت ور تھی کہ اِردگرد کے بادشاہ خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے قرآنِ کریم

میں ملکۂ سبا (Sheba) کا ذکر آیا ہے۔ قومِ سبا کا مسکن جنوبی عرب (یمن کا مشرقی علاقہ) تھا اور مارب دارالسلطنت۔ یہ اس زمانہ کی مہذب اور طاقتور قوم تھی، تجارت میں بہت آگے۔ زمین زرخیز، قیمتی دھاتیں، جواہرات، ریشم اور بخورات کے مسالے بافراط ملتے تھے۔ ہندوستان کا مال تجارت یمن کے ساحل پر جا کر اُترتا، وہاں سے یہ لوگ اس سامان کو شام، فلسطین اور مصر تک لے جاتے۔ تجارت اور اس کے ساتھ حکومت، نتیجہ یہ کہ شمالی عرب اور افریقہ تک مختلف آبادیوں پر ان کا تسلط رہا۔ قریب ۱۱۰۰ ق م زمانۂ عروج سمجھئے۔ پہلی صدی ق م میں یہ قوم تباہ ہو گئی۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات اور ان کے کتبات آج تک ان کی مٹی ہوئی سطوت کی زندہ شہادت میں ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے اور قلعے تعمیر کرتے تھے اور آبپاشی کے لئے انہوں نے بڑے بڑے بند (DAMS) بنا رکھے تھے۔ چنانچہ ایک بہت بڑا بند خود دارالسلطنت مارب کے قریب تھا جسے سدِ مارب کہتے ہیں۔ (حجاز کے عرب بند کو "سد" اور عربِ یمن عرم کہتے ہیں)۔ یہ بند پہاڑوں کے اندر بڑی بڑی دیواریں کھینچ کر بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے اردگرد کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ اس سے یہ سرزمین ایک وسیع و عریض باغ بن گئی تھی۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ۥ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ۝ (۳۴/۱۵)

اور قومِ سبا کے لئے ان کے وطن کی (سرسبزی و شادابی کی) حالت میں بڑی نشانی تھی۔ دو رویہ (ہرے بھرے باغ تھے دائیں بائیں کوئی روک ٹوک نہ تھی) اپنے پروردگار کا رزق (تھا) جی بھر کے کھاؤ اور اس کا شکر کرو (کتنی بڑی نعمت تھی) عمدہ (صاف ستھرا پُرفضا) شہر اور حفاظت کرنے والا پروردگار۔

لیکن دولت و حکومت کے نشے نے ان میں بھی اسی قسم کی بدمستیاں پیدا کر دیں جن سے اُن سے پہلے قومِ عاد و ثمود، خمار آلود ہو چکی تھیں۔ نتیجہ وہی ہوا، جو اُن قوموں کا ہوا تھا۔ پہلے یہ بند ٹوٹا، جس سے شہر تباہ و برباد ہوا اور گرد و پیش کا علاقہ ایسا ویران ہوا کہ اس میں جھاؤ اور خاردار بیریوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ (۱۶-۱۷/۳۴)۔

یہ اس قوم کا انجام تھا۔ لیکن ہم جس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں اس وقت ان کے عہدِ شوکت و اقبال کا

عروج تھا۔ اللہ نے اس قوم کو بہت کچھ دے رکھا تھا۔ لیکن یہ بجائے اس کے کہ خدا کی ان نعمتوں پر شکرگزار

ہوسِ استعماریت

ہوتے انہوں نے اِدھر اُدھر دست درازیاں شروع کر دیں اور جوع الارض نے ایسی استعماریت کا جذبہ پیدا کر دیا کہ ان کی خواہش تھی کہ ہر جگہ ان ہی کی حکومت اور ہر مقام پر انہی کی تجارت ہو۔ تجارت سے حکومت اور حکومت سے فرعونیت اسی طرح سے پیدا ہوتی ہے لیکن اس کا انجام ظاہر ہے۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۴/۱۹﴾

تو وہ کہنے لگے "ہمارے پروردگار! ہماری سلطنت و حکومت کی وسعتیں ناپیداکنار (کرکے) ہمارے سفروں کو طویل بنا دے۔ لیکن (ساتھ ہی) انہوں نے اپنے آپ پر زیادتی بھی کی۔ چنانچہ ہم نے اُن (کی شوکت و حشمت) کو افسانہ بنا ڈالا اور ان کی جمعیت کو اچھی طرح تتر بتر کر ڈالا۔ بلاشبہ اس واقعے میں ہر استقامت پذیر اور شکرگزار بندے کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں!

ہوا یہ کہ جب یونانیوں اور رومیوں نے شام اور مصر پر قبضہ کیا تو ان کے لئے خشکی کے راستے سے تجارت مشکل تھی۔ اس لئے کہ یہ تمام علاقہ عربوں کا تھا اور یہ لوگ عربوں سے خائف تھے۔ خود عرب بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ملک دوسروں کی گزرگاہ بنا رہے۔ اس دشواری کے پیشِ نظر یونانیوں اور رومیوں نے ہندوستان سے تجارت کا راستہ ہی بدل دیا اور خشکی کے بجائے بحیرۂ عرب سے سیدھے بحرِ احمر کے راستے شام و مصر تک مال لے جانے لگے۔ اس سے خشکی کا راستہ اُجڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی اہلِ سبا کی تجارت ختم ہو گئی اور (فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ) اب ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں یا وہ کھنڈرات جو ان کی تباہی و بربادی کے مرثیہ خواں ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے (سورۂ سبا، آیات (۲۰-۲۱/۳۴) میں) جو کچھ کہا ہے اسے "مفہوم القرآن" کے الفاظ میں سنئے۔ فرمایا:

حقیقت یہ ہے کہ ابلیس نے عام انسانوں کے متعلق جو خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ قوانینِ خداوندی کا اتباع نہیں کریں گے بلکہ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلا کریں گے (۳۸—۴۱/۱۵) تو اس قسم کی قوموں نے اسے بتا دیا کہ وہ اپنے خیال میں سچا تھا۔ (یعنی ان لوگوں نے اپنی روش سے ابلیس کے خیال کو سچ کر دکھایا)

کیونکہ ان میں سے، سوائے مومنین کے ایک گروہ کے، سب اس کے پیچھے چلے.

حقیقت یہ ہے کہ ابلیس کو ایسی قوت حاصل نہ تھی کہ وہ انسان پر غالب آجاتا (جب وہ کائنات کی کسی شے پر غالب نہیں آسکتا، تو انسان پر، جو اشیائے کائنات کو مسخر کرسکتا ہے، کس طرح غالب آسکتا تھا؟ لیکن یہ ہمارے اس پروگرام کا نتیجہ ہے جس کی رُو سے ہم نے، انسان کو، اشیائے کائنات کی طرح، مجبور پیدا نہیں کیا، بلکہ صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے کہ وہ جی چاہے تو وحیٔ خداوندی کا اتباع کرے اور جی چاہے تو اس راستے کو چھوڑ کر، اپنے جذبات کے پیچھے لگ جائے. جب وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہوجاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ "ابلیس اُس پر غالب آگیا." اور انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کرنے سے مقصد یہ تھا کہ وہ) اپنی مرضی سے حیاتِ آخرت پر ایمان لاکر ان لوگوں سے متمیز اور ممتاز زندگی بسر کرے جو اس بارے میں شک میں رہتے ہیں. (زندگی کی سرفرازیوں اور خوشگواریوں کا راز، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان میں پوشیدہ ہے اور اس قانون پر ایمان لایا نہیں جاسکتا جب تک حیاتِ اُخروی پر ایمان نہ ہو).

تیرا نشوونما دینے والا، ہر شے پر نگاہ رکھتا ہے تاکہ ہر ایک کا عمل، اس کے قانون کے مطابق، نتیجہ مرتب کرے.

واقعۂ ملکۂ سبا یہ تھی وہ قوم جس کے عہدِ شباب میں اس کی حکمران (ملکۂ سبا) حضرت سلیمانؑ کے ہاں تحائف پیش کرنے کے لئے آئی. سورۂ نمل میں اس واقعہ کی تفصیل یہ بیان کی ہے:

> (آگے چل کر ایک مقام پر ایسا ہوا کہ) سلیمانؑ نے، گھوڑ سوار ہرکاروں کو، جو اُس وقت وہاں موجود نہیں تھے، طلب کیا. جب وہ آئے تو انہوں نے کہا کہ ان کا سردار 'ہُدہُد' کہاں ہے؟ کیا وہ یونہی کہیں اِدھر اُدھر گیا ہے یا وہ اپنی ڈیوٹی سے غائب ہے؟
>
> اگر وہ اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر ہوگیا ہے تو (فوجی قوانین کے مطابق) میں اسے سخت سزا دوں گا ___ اور اگر اس نے، اس کے لئے کوئی واضح اتھارٹی (اجازت نامہ) یا وجہ جواز پیش نہ کی تو ہوسکتا ہے کہ اسے سزائے موت دی جائے. (مفہوم ۲۰ ___ ۲۱/۲۷)

اس زمانے میں آدمیوں کے نام پرندوں اور جانوروں کے نام پر بھی رکھے جاتے تھے. چنانچہ خود تورات

میں ہے کہ ایک ادومی شہزادے کا نام ہُدہُد تھا۔ (سلاطین ا، ۱۴/۱۱)۔ ہندوؤں کے ہاں طوطارام اور چوہامل جیسے نام اب تک رکھے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے مذکورہ صدر آیت میں جس ہُدہُد کا ذکر ہے وہ رسالے کا کوئی افسر تھا۔

اس کے بعد ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس ملک پر ایک ملکہ حکمران ہے جس کے پاس سب کچھ موجود ہے۔ (یعنی وہ اپنی مملکت میں خود مکتفی ہے اور اپنی ضروریات کے لئے، کسی بیرونی قوم کی محتاج نہیں) اور اس کا اندرونی نظم و نسق اور کنٹرول بھی بڑا عظیم الشّان ہے۔

لیکن وہ ملکہ اور اس کی قوم کے لوگ، سورج کی پرستش کرتے ہیں، خدا کی نہیں کرتے۔ شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں اس قدر خوشنما بنا رکھا ہے کہ وہ اپنے مسلک کو بالکل صحیح اور درست سمجھتے ہیں۔ اس نے انہیں، صحیح روش زندگی کی طرف آنے سے ایسے روک رکھا ہے کہ وہ اس کی طرف راہ نمائی نہیں حاصل کر پاتے۔

(حیرت ہے کہ) وہ لوگ خدا کو اپنا معبود نہیں تسلیم کرتے — اس خدا کو جو کائنات کے مخفی ذخیروں سے، ہر چیز کو عند الضّرورت باہر لاتا ہے اور (اس کا علم صرف خارجی کائنات تک ہی محدود نہیں بلکہ) وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم اپنے دل میں کیا رکھتے ہو اور ظاہر کیا کرتے ہو۔

وہ خدا جس کے علاوہ کائنات میں کسی کا اختیار و اقتدار نہیں، اس عظیم کارگہ فطرت کا مرکزی کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے۔

(تعجب ہے کہ یہ لوگ، اتنی بڑی سلطنت کے مالک ہونے کے باوجود، اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے اور ایسی صاحبِ اختیار و ارادہ ہستی کو چھوڑ کر، سورج کو اپنا خدا مانتے ہیں جسے اپنے طلوع و غروب پر بھی کوئی اختیار نہیں)۔

سلیمانؑ نے یہ سب کچھ سنا اور کہا کہ بہت اچھا۔ ہم ابھی معلوم کر لیتے ہیں کہ تمہارے بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ (خبر رساں ایجنسیوں کے بیانات کی تصدیق کر لینا ضروری ہوتا ہے)

یہ ہمارا خط لو اور اسے سبا کے اربابِ حل و عقد تک پہنچا دو. پھر ان کے پاس سے ہٹ کر وہیں انتظار کرو اور دیکھو کہ ان کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے.

ملکہ نے وہ خط پاکر اپنے مشیروں کی مجلس بلائی اور ان سے کہا کہ مجھے ایک ایسا خط ملا ہے جو بڑے ہی شریفانہ انداز میں لکھا گیا ہے.

یہ خط شاہ سلیمانؑ کی طرف سے ہے اور اس کی غایت یہ بتائی گئی ہے کہ خدا کی صفتِ ربوبیّت اور رحیمیت (یعنی سامانِ نشوونما کی بہم رسانی) انسانوں میں عام ہو جائے (۱/۲).

اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخّص یہ ہے کہ تم میرے خلاف سرکشی اختیار نہ کرو بلکہ قوانینِ خداوندی کی مطیع و فرماں بردار بن کر، چلی آؤ.

خط کا مضمون سُنا دینے کے بعد، اس نے اپنے اہلِ دربار سے کہا کہ تم اس معاملہ پر غور کر کے مجھے بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے. تمہیں معلوم ہے کہ میں، تم سے مشورہ کئے بغیر کسی معاملہ کا آخری فیصلہ نہیں کیا کرتی.

انہوں نے کہا کہ اگر سلیمانؑ کے پاس بڑے بڑے جرار لشکر ہیں، تو ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں. ہم بڑی قوتوں کی مالک، سخت جنگجو قوم ہیں. اس لئے، اس بنا پر، اس سے خوف کھانے کی کوئی بات نہیں. (لیکن یہ اس معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے جس کی طرف سے ہم تمہیں اطمینان دلاتے ہیں. اس کے دوسرے پہلوؤں پر آپ غور کر لیں. اس کے بعد آخری فیصلہ کریں. اس لئے کہ) ایسے معاملات میں آخری فیصلہ آپ ہی کا ہو سکتا ہے. آپ جو فیصلہ بھی کریں گی، ہم اس کے مطابق عمل کریں گے. ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں.

(اُس نے کہا کہ اس بات کا تو مجھے بھی یقین ہے کہ تم جنگ سے گریز نہیں کرو گے. لیکن یہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ) جب بادشاہ دوسرے ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اسے تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں اور معاشرہ کا تختہ اس طرح الُٹ دیتے ہیں کہ وہاں کے صاحبِ عزّت اکابرین کو سب سے زیادہ ذلیل و خوار بنا دیتے

ہیں۔ یہ بات کسی خاص بادشاہ سے متعلق نہیں، ملوکیت میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا چلا جائے گا۔ (اس لئے ایسا باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس بادشاہ کی طرف سے ایسا نہیں ہوگا۔ لہٰذا، میں یہ سمجھتی ہوں کہ جہاں تک ہو سکے، ہمیں جنگ کی نوبت نہیں آنے دینی چاہیئے)۔

میں (سرِدست) ان کی طرف کچھ تحائف بھیجتی ہوں اور انتظار کرتی ہوں کہ اس کا ان کی طرف سے کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ (شاید وہ اس طرح، جنگ کا ارادہ ترک کر دیں)۔

(مفہوم القرآن ۲۳—۲۷/۳۵)

تورات میں ہے۔

اور جب کہ خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سبا کی ملکہ تک پہنچی تو وہ مشکل سوالوں سے آزمانے آئی اور وہ بڑے جلوے کے ساتھ اور اونٹوں کے ساتھ جن پر خوشبوئیاں لدی تھیں اور نہایت بہت سونا اور مہنگو لے جواہر ساتھ لے کے یروشلم میں آئی اور اس نے سلیمان پاس آ کے جو کچھ اس کے دل میں تھا اس سب کی بابت اس سے گفتگو کی۔ (سلاطین (۱) ۱—۲/۱۰)

لیکن دولت کا لالچ بھلا حضرت سلیمانؑ کو کس طرح اپنے فریب میں لا سکتا تھا۔ ان کے پیشِ نظر اس قوم کی اصلاح تھی نہ کہ جلبِ منفعت۔ چنانچہ

جب ملکہ کا قاصد، تحائف لے کر سلیمانؑ کے پاس آیا تو اُس نے (تحائف وغیرہ دیکھ کر کہا کہ) کیا تم لوگ مال کا لالچ دے کر مجھے اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہو؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جس قدر مال و دولت مجھے اللہ نے دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ اور بہتر ہے جو تمہارے پاس ہے۔ اس لئے تمہارا مال، میرے لئے وجۂ کشش نہیں ہو سکتا۔ جو تحائف تم لائے ہو، وہ تمہارے نزدیک بڑے قابلِ فخر ہوں گے (لیکن میرے نزدیک ان کی کچھ قیمت نہیں۔ میرے نزدیک قدر و قیمت صرف اس کی ہے کہ تم قوانین خداوندی کی اطاعت اختیار کر لو)۔

تم اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ (اور ان سے کہو کہ چونکہ تم نے ہماری شرائط کو تسلیم نہیں کیا۔ اس لئے اب ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ) ہم ایسے لشکروں کے

ساتھ تم پر چڑھائی کریں جن کا تم مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ ہم تمہیں تمہارے ملک سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور اس کے بعد تم ہمیشہ محکومی کی زندگی بسر کرو گے۔

(چنانچہ قاصد واپس چلا گیا اور سلیمانؑ نے چڑھائی کا ارادہ کر لیا۔ اور) اپنے اہلِ دربار سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ قبل اس کے کہ اہلِ سبا، باہر نکل کر جنگ کریں اور شکست کھا کر ہتھیار رکھ دیں، ان کے پایۂ تخت پر شدت کا حملہ کر کے، اسے اپنے قبضہ میں لے آیا جائے۔ (ہو سکتا ہے کہ اس طرح وہ جنگ کئے بغیر ہی راہِ راست پر آ جائیں)۔ چنانچہ اس نے ان سے پوچھا کہ وہ کون ہے جو اس مہم کو جلد از جلد سر کر سکتا ہے۔

اس پر وحشی قبائل کا ایک قوی ہیکل سردار جو جسمانی قوت کے علاوہ معاملہ فہمی میں بھی ماہر تھا، بولا کہ یہ مہم میں سر کروں گا، اور اتنی جلدی کہ قبل اس کے کہ آپ اس مقام سے کوچ کر کے آگے بڑھیں، ملکہ اور اس کا تختِ حکومت آپ کے قدموں میں ہو گا۔ (آپ اس مہم کو میرے سپرد کیجئے) میں اسے سر کرنے کی قوت بھی رکھتا ہوں اور قابلِ اعتماد بھی ہوں۔

ایک دوسرے سردار نے، جسے اس خط و کتابت کا پورا پورا علم تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، کہا کہ میں اس مہم کو اس سے بھی جلدی سر کر سکتا ہوں ـــــ ایسی جلدی کہ ملکۂ سبا، چشم زدن میں، مفتوح و مغلوب یہاں آ جائے۔

چنانچہ وہ مہم اس کے سپرد کی گئی اور اس نے اسے نہایت حُسن و خوبی سے سر کر لیا۔ جب سلیمانؑ نے مالِ غنیمت کو اپنے سامنے دیکھا تو بحضور ربّ العزّت سجدہ ریز ہوا اور کہا کہ اس قوم کے خلاف، اس قسم کی کامیابی اُنہی اسباب و ذرائع سے ممکن تھی جو ہمیں خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ وہ ایسے مواقع اس لئے بہم پہنچاتا ہے کہ لوگوں پر اس حقیقت کو آشکارا کر دے کہ میں، اُس کو دی ہوئی قوت و حشمت اور دولت و ثروت کو صحیح مصرف میں لاتا ہوں یا ان کا غلط استعمال کرتا ہوں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو قوم بھی فطرت کی بخشائشوں کو صحیح مصرف میں لاتی ہے، اِس کا فائدہ اسی کو ہوتا ہے! ور جو لوگ ان کا غلط استعمال کرتے ہیں، اس کا نقصان اُنہی کو ہوتا ہے۔ خدا کا نہ تو اُن مفادات سے کچھ سنورتا ہے اور نہ ہی ان نقصانات سے کچھ بگڑتا ہے۔

یہ سب انسان کے اپنے لئے ہے. خدا اس سے بے نیاز ہے کہ وہ انسانوں کی محنت کے ماحصل سے کچھ لے. اس کے پاس بہت کچھ ہے.

لیکن یہ فتح میدانِ جنگ میں ہوئی تھی، ان کے دارالسلطنت تک رسائی نہیں ہوئی تھی. چنانچہ اس کے لئے سلیمانؑ نے اہلِ لشکر سے کہا کہ تم (دیگر مقامات کو زیادہ گزند نہ پہنچاؤ) ایوانِ حکومت پر اس شدت کا حملہ کرو کہ اس کا حلیہ بگڑ جائے. ہو سکتا ہے کہ اربابِ حکومت اس سے راہِ راست پر آجائیں. اگر ایسا نہ ہوا (تو پھر دوسری تدابیر پر عمل کیا جائے گا).

(مفہوم القرآن ۳۶ــ ۲۷/۴۱)

یعنی حضرت سلیمانؑ نے تجویز کیا کہ قبل اس کے کہ ملکۂ سبا کے لشکر میدان میں مقابلہ کے لئے آجائیں ہمیں چاہیئے کہ جلدی سے اس کے دارالسلطنت پر زور کا حملہ کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے آئیں. چنانچہ اس کے بعد انہوں نے اپنے کمانداروں میں سے پوچھا کہ اس مہم کو کون جلد از جلد سر کر سکتا ہے. اس پر وحشی قبائل کے ایک قوی ہیکل سردار نے، جو جسمانی قوت کے علاوہ معاملہ فہمی میں بھی ماہر تھا، کہا کہ میں اس مہم کو اتنی جلدی سر کر سکتا ہوں کہ قبل اس کے کہ آپ یہاں سے آگے کوچ کریں، ملکہ اور اس کا تخت و تاج آپ کے قدموں میں ہوگا. ایک اور افسر تھا جسے اس خط و کتابت کا بھی علم تھا جو ملکۂ سبا کے ساتھ ہوئی تھی، اس نے کہا کہ میں اس مہم کو اس سے بھی زیادہ جلدی سر کر سکتا ہوں. اتنی جلدی کہ آنکھ جھپکنے کے عرصہ میں ملکہ کا تخت آپ کے سامنے ہوگا. چنانچہ وہ مہم اس کے سپرد کر دی گئی اور اس نے اسے نہایت حسن و خوبی سے سر کر لیا. اس کے بعد قرآنِ کریم میں ہے.

(چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوگئی اور ملکۂ سبا نے شکست مان لی) جب وہ سلیمانؑ کے سامنے آئی تو اس نے کہا کیوں؟ یہی تھی وہ تیری قوت و ثروت جس کے بل بوتے پر تیری قوم اس قدر سرکش ہو رہی تھی؟ اس نے کہا کہ ہاں! وہ قوت و ثروت کچھ ایسی ہی تھی. ہمیں اس کا پہلے ہی سے احساس ہو گیا تھا. اب ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں.

وہ فرماں پذیری تو اس سے بہت پہلے قبول کر لیتی، لیکن جو چیز اس کی راہ میں حائل ہو رہی تھی، وہ اس قوم کا مذہب تھا، یعنی وہ معبود جن کی وہ قوم، خدا کو چھوڑ کر، پرستش کرتی تھی (ان کا خیال تھا کہ وہ معبود ان کی ضرور مدد کریں گے اور وہ غالب رہیں گے. لیکن ان کا یہ خیال خام تھا).

(مفہوم القرآن ۴۲ــ ۲۷/۴۳)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے لشکر سے کہہ دیا تھا کہ فوجی یلغار سے اس پایہ تخت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو ضرور پہنچے گا لیکن دیکھنا! تم اس سے زیادہ اسے خراب نہ کرنا۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ممکن ہے کہ یہ لوگ اس سے راہِ راست پر آجائیں۔ چنانچہ وہ شہر فتح ہوگیا اور ملکہ، حضرت سلیمانؑ کے سامنے آئی تو آپ نے اس سے کہا کہ دیکھو! یہی تھی ناں تمہاری قوت وسطوت جس کے بل بوتے پر تیری قوم اس قدر سرکش ہورہی تھی؟ اس پر ملکہ نے کہا کہ ہاں! ہماری قوت وسطوت کچھ ایسی ہی تھی۔ ہمیں اس کا پہلے ہی احساس ہوگیا تھا۔ اب ہم آپ کے مطیع وفرماں بردار ہیں۔

اس کے بعد ان دونوں سلطنتوں کے تعلقات خوشگوار ہوگئے۔ چنانچہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ کو اپنے ہاں بطور شاہی مہمان کے ٹھیرایا اور ایک شیش محل میں اس کے قیام کا انتظام کیا۔ اس نے اس سے پہلے شیش محل کبھی نہیں دیکھے تھے۔ چنانچہ جب اس نے بلوریں فرش میں در ودیوار کا عکس دیکھا تو سمجھا کہ سامنے پانی ہے۔ وہ اس منظر سے گھبراسی گئی۔ حضرت سلیمانؑ نے اس کی گھبراہٹ کو بھانپا تو کہا کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ پانی نہیں شیشے کا فرش ہے (۲۷/۴۴)۔ اس کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ملکہ کو توحید کی دعوت دی اور وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئی۔

قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؏ (۲۷/۴۴)

ملکہ پکار اٹھی "اے پروردگار! بیشک میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور (میں سلیمان کے ساتھ خدا، پروردگارِ عالم کی مطیع وفرماں بردار ہوگئی!

یہ تھا ماحصل اس تمام واقعہ کا۔

حضرت سلیمانؑ کا جانشین

حضرت داؤدؑ کا جانشین تو حضرت سلیمانؑ جیسا اولوالعزم شاہنشاہ اور برگزیدہ رسول تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا بیٹا ایسا نہیں تھا۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو دو مقامات پر استعارۃً بیان کیا ہے۔ سورۂ صٓ میں ہے۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَ اَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ○ (۳۸/۳۴)۔

سلیمان ان خصوصیات کا حامل تھا۔ لیکن اُسے اپنے بیٹے کی طرف سے، جو اُس کا جانشین

ہونے والا تھا، بڑی کوفت تھی ۔ وہ ایک جسد تھا بے روح (۳۴/۱۴) اور ان صفات کا مالک نہیں تھا جو اس مملکت کے انتظام کے ضروری تھیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس سے دل برداشتہ ہو جاتا، وہ قوانینِ خداوندی کی طرف اور شدت سے رجوع کرتا (تا کہ وہ نظامِ مملکت کو اور مستحکم کر دے)۔

یعنی ان کے تخت کا وارث ایک بے جان دھڑ تھا۔ بایں ہمہ سلطنت کا اقبال ایسا تھا کہ اس بے جان دھڑ کا رُعب بھی ایک عرصے تک قائم رہا اور بڑی بڑی سلطنتوں کے متعلق ہوا بھی یہی کرتا ہے۔ محکوم قوم پر

ایک عمیق نکتہ

قوت وسطوت کا رعب کچھ اس طرح غالب ہوتا ہے کہ تخت و تاج کو سنبھالنے والے ستون، خواہ اندر ہی اندر دیمک سے کھوکھلے ہو چکے ہوں، لیکن جب تک ان کی شکل و صورت قائم ہے محکوم قوم کے افراد اپنی خوئے غلامی سے مجبور بدستور ان کے حضور سجدہ ریز رہتے ہیں۔ اور جب تک یہ ستون خود اپنے بوجھ سے دب کر ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں، ان کی روشِ اطاعت و فرماں پذیری میں فرق نہیں آتا۔ اس وقت البتہ انہیں ضرور احساس ہوتا ہے کہ اتنا عرصہ یونہی رعب میں اطاعت کرتے رہے۔ اگر پہلے معلوم ہو جاتا تو ان کھوکھلی لکڑیوں کو ہم خود ہی کیوں نہ الگ کر دیتے لیکن غلاموں میں یہ بصیرت کہاں کہ ٹھوس اور کھوکھلی لکڑی میں تمیز کر سکیں؟ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو سورۂ سبا کی آیت ۱۴ (۳۴/۱۴) میں یوں بیان فرمایا ہے:۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝ (۳۴/۱۴)

اس کی موت کے بعد اُس کا بیٹا، اس کا جانشین ہوا۔ لیکن وہ اپنے باپ دادا کی طرح نہ تھا۔ وہ محض ایک انسان نما حیوان تھا۔ بس آب و گل کا ایک متحرک پیکر (۳۸/۳۴) چنانچہ اس کے ہاتھوں، شوکتِ داؤدی اور سطوتِ سلیمانی، سب ختم ہو گئی (بنی اسرائیل کے دس قبائل اُس سے سرکش ہو گئے[2])۔ چنانچہ جب اُن وحشی قبائل نے، جو سلیمان کے عہد

---

[1] اس زمانے میں، حکومت، آلِ یعقوب (بنی اسرائیل) میں متوارث چلی آ رہی تھی۔ [2] تورات۔ سلاطین (۱)۔

میں اس طرح اطاعت شعار اور فرماں پذیر تھے، اس صورتِ حالات کو دیکھا تو وہ بھی سرکش ہو گئے اور انہیں افسوس ہوا کہ وہ اپنے پرانے خیال کے مطابق، اتنا عرصہ کیوں یونہی، اس جسدِ بے جان کی غلامی کرتے رہے۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس حکومت کا اب صرف نام ہی باقی ہے اور اس کے پیچھے قوت کچھ نہیں رہی، تو وہ اتنا عرصہ اس ذلت آمیز عذاب میں کیوں مبتلا رہتے؟

حضرت سلیمانؑ کا یہی بیٹا تھا جس کے متعلق تورات میں ہے۔

اور رُجعام کی سلطنت کے پانچویں برس ایسا ہوا کہ مصر کے بادشاہ سیستق نے یروشلم پر چڑھائی کی اور اس نے خداوند کا خزانہ اور بادشاہ کے گھر کا خزانہ لوٹ لیا۔ اس نے بالکل لوٹ لیا اور اس نے وہ سب ڈھالیں جو سلیمانؑ نے سونے کی بنائی تھیں لے لیں اور رُجعام بادشاہ نے ان کے بدلے پیتل کی ڈھالیں بنائیں اور پاسبانوں کے سردار کے ہاتھوں میں جو بادشاہی گھر کے آگے چوکی دیتے تھے دیں۔ (سلاطین (۱) ۲۵—۲۷/۱۴)

حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ایک شخص یربعام نامی نے حیا کاہن کے ساتھ مل کر آپ کی سلطنت کے خلاف سخت سازشیں کی تھیں۔ اس وقت تو وہ اپنی مساعی میں کامیاب نہ ہو سکا، لیکن رُجعام کے عہد سے اس نے بڑی قوت حاصل کر لی اور بنی اسرائیل کے دس اسباط کو اپنے ساتھ ملا کر رُجعام کو شکست دی۔ اس نے بیت المقدس کے ہیکل کے مقابلے میں دو بُت خانے تعمیر کرائے، جہاں سونے چاندی کے بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔

(سلاطین (۱) باب ۱۲، ۱۱)

تورات کی افسانہ طرازی

یہ تھے خدا کے جلیل القدر رسول حضرت سلیمانؑ لیکن دیگر انبیاء کرامؑ کی طرح تورات نے ان کے متعلق بھی کچھ کم افسانہ طرازی سے کام نہیں لیا۔ کتاب سلاطین نمبر ۱ میں ہے:-

پر سلیمان بادشاہ بہت سی اجنبی عورتوں کو فرعون کی بیٹی کے سوا چاہتا تھا، موآبی اور عمونی اور ادومی اور صیدانی اور حتی عورتوں کو۔ ان قوموں کی جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل کو حکم کیا کہ تم ان کے پاس اندر نہ جاؤ اور وہ تمہارے پاس اندر نہ آئیں کہ وہ یقیناً تمہارے

دلوں کو اپنے معبودوں کی طرف مائل کرائیں گی۔ سو سلیمانؑ انہی سے عاشق ہو کے لپٹا۔ اس کی سات سو جوروان بیگمات تھیں اور تین سو حرمین اور اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو پھیرا۔ کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمانؑ بوڑھا ہوا، تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا، جیسا اس کے باپ داؤد کا دل تھا۔ سو سلیمان نے صیدانیوں کی دیوی عستارات اور بنی عمون کے نفرتی ملکوم کی پیروی کی اور سلیمان نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی اپنے باپ داؤد کی طرح نہ کی۔ (سلاطین (۱) ۱۔ ۱۱/۶)

یہ، اور (سحر و کہانت وغیرہ کے متعلق) اسی قسم کے اور افسانے تھے جنہیں یہود حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے ان خرافات کی تردید فرما کر خدا کے اس برگزیدہ رسول کا دامن ان لغو اتہامات سے پاک کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

وَ اتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡکِ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ مَا کَفَرَ سُلَیۡمٰنُ وَ لٰکِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ کَفَرُوۡا یُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ ٭ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَی الۡمَلَکَیۡنِ بِبَابِلَ ہَارُوۡتَ وَ مَارُوۡتَ ؕ ...... وَ لَبِئۡسَ مَا شَرَوۡا بِہٖۤ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲/۱۰۲﴾

ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ یہ خدا کی صحیح تعلیم کو چھوڑ کر، ان افسانوں کے پیچھے لگے رہتے تھے جو ان کے سرغنوں نے مملکتِ سلیمان کے خلاف تراش رکھے تھے۔ ان میں سے ایک افسانہ یہ تھا کہ سلیمان (جیسا پیغمبر) سحر آفرینیوں اور شعبدہ بازیوں کو ماننے لگ گیا تھا۔ سلیمان نے ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ کچھ خود ان کے سرغنے کیا کرتے تھے۔ اور یہ (قصہ بھی جو ان لوگوں میں مشہور ہے) صحیح نہیں ہے کہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اس طرح کی کوئی بات نازل ہوئی تھی (جیسا کہ ان لوگوں میں مشہور ہے کہ وہ لوگوں کو جادوگری سکھلاتے تھے اور یہ کہ) وہ جو کچھ بھی کسی کو سکھلاتے تھے تو یہ کہے بغیر نہیں سکھلاتے تھے کہ دیکھو ہمارا وجود تو ایک فتنہ ہے پھر تم کیوں کفر میں مبتلا ہوتے ہو؟ اور یہ کہ اس پر بھی لوگ ان سے ایسے عمل سیکھتے جن کے ذریعے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈالنا چاہتے۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ کسی انسان

کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، اِلّا یہ کہ خدا کے حکم سے کسی کو نقصان پہنچنے والا ہو اور نقصان پہنچ جائے (یہ تمام قصّے کہانیاں ان کی اپنی تراشیدہ ہیں ان میں کوئی بات بھی صحیح نہیں)۔ یہ لوگ (کتابِ الٰہی کی تعلیم فراموش کر کے) ایسی باتیں سیکھتے ہیں جو انہیں سراسر نقصان پہنچانے والی ہیں اور کوئی فائدہ نہیں رکھتیں اور (پھر کچھ یہ بات بھی نہیں کہ انہیں احکام الٰہی کی خبر نہ ہو) انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جو کوئی (اپنا دین و ایمان بیچ کر) ایسے جھوٹ کا خریدار ہوتا ہے اس کے لئے آخرت کی برکتوں میں کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ (لیکن یہ جانتے ہوئے بھی اس سے باز نہیں آتے) پس افسوس ان کی اس خرید و فروخت پر! کیا ہی بُری متاع ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کی نجات بیچ ڈالی! کاش وہ جانتے (کہ کس طرح اپنے ہاتھوں اپنے کو برباد کر رہے ہیں!)

یہ آیۂ جلیلہ بڑے اہم تاریخی مباحث کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یربعام نے احیا کاہن سے مل کر حکومتِ سلیمانی کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں۔ یربعام کو حضرت سلیمانؑ نے شمالی حصّۂ مملکت کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن اس نے بہت سے اور لوگوں کو ساتھ ملا کر سلطنت کے خلاف بغاوت

مملکتِ سلیمانؑ کے خلاف سازشیں

شروع کر دی۔ حضرت سلیمانؑ کو اس کی اطلاع ملی، تو آپ نے اس کی سرکوبی کرنی چاہی لیکن وہ بھاگ کر مصر چلا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد واپس لوٹا اور پھر دس اسباط بنی اسرائیل کو ساتھ ملا کر حضرت سلیمانؑ کے بیٹے کے خلاف جنگ کی اور اپنی حکومت قائم کر لی، نہ صرف حکومت بلکہ بیت المقدس کے مقابلے میں بتخانے تعمیر کرائے، جہاں اعلانیہ بُت پرستی ہوتی تھی۔ بنی اسرائیل یوں بُت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہوئے۔ بت پرستی اور اس کے ساتھ وہ سب اوہام و خرافات جو مندروں میں ہوتے تھے۔ جادوگری، کہانت، توہم پرستی، غرضیکہ کفر و شرک کا کوئی گوشہ نہ تھا جو ان پر مسلط نہ ہو چکا ہو۔ یہ سب کچھ حضرت سلیمانؑ کے دشمنوں نے کیا لیکن بعد میں یہودیوں نے اس تعلیم کو خود حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر دیا جیسا کہ کتاب سلاطین[1] سے ظاہر ہے۔ حتّیٰ کہ اسی کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ تمام ریشہ دوانیاں حضرت سلیمانؑ پر (معاذ اللہ) خدا کا عذاب تھا جو آپ پر بُت پرستی کے جرم کی پاداش میں نازل ہوا تھا۔

سو از بسکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے جو اسے دوبارہ دکھائی دیا برگشتہ ہوا اس

لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اُسے حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔ اس سبب سے خداوند نے سلیمان کو کہا از بسکہ تجھ سے ایسا ایسا کچھ ہوا اور تُو نے میرے عہد کو اور میری شریعتوں کو جو میں نے تجھے فرمائیں حفظ نہ کیا، اس واسطے میں سلطنت کو تجھ سے چھین لوں گا اور تیرے خادم کو دوں گا، لیکن تیرے باپ داؤد کی خاطر سے میں تیرے جیتے جی ایسا نہ کروں گا۔ پر تیرے بیٹے کے ہاتھ سے چھین لوں گا

مگر ساری سلطنت نہ چھین لوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کے لئے، جسے میں نے چُن لیا ہے، ایک فرقہ تیرے بیٹے کو دوں گا۔

(سلاطین نمبر ۱ ۔ ۹/۱۱-۱۳)

یربعام اور اس کے ساتھی وہ شیاطین (سرکش وعنان تاب باغی) تھے جنہوں نے حضرت سلیمانؑ کے خلاف سازشیں کیں اور اس کے بعد آپ کی طرف اس قسم کی مشرکانہ تعلیم منسوب کی گئی۔

سحرِ بابل اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وہ لوگ سحر کی تعلیم دیتے تھے، وہ سحر جس کا سرچشمہ بابل تھا اور جس کے متعلق لوگوں میں یہ مشہور کیا گیا تھا کہ یہ بابل کے دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) پر منجانب اللہ نازل ہوا تھا اور وہاں سے آگے بڑھا ہے۔ یعنی انہوں نے اس کے ساتھ خدائی سند کو بھی شامل کر لیا تھا۔ تاریخی انکشافات اس پر شاہد ہیں کہ بابل سحر و کہانت اور شعبدہ گری و فسوں سازی کا گہوارہ تھا ۔ (راجرز اپنی مشہور کتاب "بابل اور اشوری مذہب" میں لکھتا ہے۔

اہلِ بابل و نینوا کے مذہب کا معتد بہ حصہ جھاڑ پھونک کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ (ص ۱۴۵)

انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون نگار بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ "اہلِ بابل کا مذہبی لٹریچر سحر و کہانت سے بھرا پڑا تھا۔" جب کلدانیوں (اہلِ بابل) کی قومیت کا شیرازہ بکھرا تو یہ تمام دنیا میں پھیل گئے اور جہاں جہاں گئے، "انہوں نے شعبدہ بازی اور افسوں سازی کی اس نظر فریب تعلیم کو عام کرنا شروع کر دیا" [دیکھئے RAGOZIN کی کتاب "کالڈیہ"]۔ یہودی، شعبدہ بازی اور سحر و کہانت کے بدل شیدائی تھے۔ اہلِ بابل کے ان بکھرے ہوئے معلموں کا سب سے زیادہ اثر انہی توہم پرستوں پر ہوا، چنانچہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا اس پر شاہد ہے کہ یہودیوں میں اہلِ بابل ہر جگہ بنگاہ تقدس دیکھے

جانے لگے اور (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی رُو سے) ان کی تعلیم یہودیوں کے ہاں عام ہوگئی تھی۔ یہ تھی یہودیوں کی حالت جس پر جیوئش انسائیکلوپیڈیا کی حسب ذیل شہادت قابلِ غور ہے[1]۔

"قدیم یہودیوں میں جادوں کی تعلیم عام تھی۔ حتیٰ کہ صدرِ مجلس یا محکمۂ قضا کی رکنیت کے لئے جادو کا علم لاینفک شرط سمجھا جاتا تھا، خواہ یہ جادو کفار سے ہی کیوں نہ سیکھا جائے۔ ان کے بڑے بڑے علماء اسی علم کے ماہر تھے اور قانون کی نگاہ میں اس کا اثر مسلّم تھا۔ لوگ اہلِ علم کی باتوں کی پرواہ کرتے یا نہ کرتے لیکن ساحرین کی عقیدت ان کے رگ و ریشے میں سما چکی تھی۔ اسی نے انہیں تباہ کردیا۔"

(جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ہشتم)

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب یہودی (بیت المقدس کی تباہی کے بعد) اسیر ہو کر بابل گئے ہیں اور وہاں کم و بیش ایک سو سال تک رہے، تو اس وقت انہوں نے اسی قسم کی تعلیم اہلِ بابل سے حاصل کی ہو۔ بہرحال، تاریخ کی متعدد شہادات اس حقیقت کی مظہر ہیں کہ یہودیوں اپنے پیغمبروں کی تعلیم سے برگشتہ ہو کر اس قسم کی خرافات میں اُلجھ چکے تھے۔ یہ کیفیت کچھ قدیم یہودیوں ہی کی نہیں تھی۔ بلکہ عہدِ نبیٔ اکرمؐ کے یہودیوں کا بھی یہی حال تھا۔ خود تو یہ بگڑے ہی تھے لیکن قیامت یہ ہے کہ انہوں نے اس تمام مجموعۂ خرافات کو اپنے انبیائے کرامؑ (بالخصوص حضرت سلیمانؑ) کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ چنانچہ تالمود میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے پاس ایک انگشتری تھی جس پر اسمِ اعظم[2] کندہ تھا

ایک اور افسانہ

جس کی تاثیر سے انسان، حیوان، چرند، پرند، جنات، بھوت، سب آپ کے مسخر تھے۔ جب آپ کی سلطنت مستحکم ہوگئی تو آپ کو اپنی قوت پر بڑا ناز ہوگیا۔ یہ بات خداوند یہوا کو ناگوار گذری، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوؤں کا بادشاہ اسموڈیس چالاکی سے آپ کی

---

[1] یہودی (بلکہ سامی اقوام) میں مروج جادو کی دل چسپ تفاصیل (G. Campbell Thompson) کی کتاب (Semitic Magic: Its origin and Development) میں ملاحظہ کیجئے۔

[2] آپ نے غور فرمایا کہ مسلمانوں میں اسمِ اعظم کا تصور کہاں سے آیا؟

انگشتری چرا کر لے گیا اور آپ کا ہم شکل بن کر تخت پر بیٹھ گیا۔ حضرت سلیمانؑ کی قوت کا راز تو اسی انگشتری میں تھا۔ جب وہ چھن گئی تو سب کچھ گیا۔ چنانچہ آپ جان بچا کر بھاگے اور فقیروں کا بھیس بدل کر بھیک مانگنے لگے۔ آخر شاہ آموں کے ملک میں پہنچ کر آپ نے شاہی باورچی خانے میں نوکری کر لی۔ قضا کار بادشاہ کی بیٹی آپ پر عاشق ہو گئی۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں کو جنگل میں نکال دیا۔ ایک دن ایک ماہی گیر مچھلی لے کر ادھر سے گزر رہا تھا۔ بھکارن شہزادی نے وہ مچھلی اس سے خرید لی اور جس وقت اس کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے ایک انگوٹھی برآمد ہوئی (حضرت سلیمانؑ نے (جنہوں نے اپنا نام قہلت رکھ چھوڑا تھا) فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے۔ اسے فوراً اٹھا لیا اور آنکھ جھپکنے کے عرصے میں یروشلم پہنچ کر اس غدار کو قتل کیا اور خود تختِ حکومت پر متمکن ہو گئے (یہودی تالمود)۔ یہ ہیں وہ خرافات جو یہودیوں کی مقدس کتابوں میں خدا کے اس برگزیدہ بندے کی طرف منسوب ہیں۔ تورات اور کتبِ یہود نے حضرت سلیمانؑ کی طرف اس قسم کے خرافات کو منسوب کیا۔ لیکن قرآنِ کریم نے آکر اعلان کیا کہ یہ سب اتہامات ہیں جن سے خدا کے اس برگزیدہ رسول کا دامن پاک ہے (وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ)۔

قرآن اور تورات

یہ اعلان آج سے قریب چودہ سو سال پہلے ہوا جب دنیا میں اس حقیقت کا شاہد کوئی نہ تھا۔ اس کے بعد تاریخی انکشافات نے تورات اور کتبِ یہود کے بیانات کی تائید کی یا قرآنِ کریم کے اعلان کی؟ اس کا جواب مسلمانوں سے نہیں بلکہ غیر مسلم محققین کی زبان سے سنئے۔ انسائیکلو پیڈیا ببلیکا (یعنی خود بائبل کے انسائیکلو پیڈیا) میں لکھا ہے۔

> اتنا تو غالباً صحیح ہے کہ (حضرت) سلیمانؑ کی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی متعدد بیویاں تھیں لیکن آپ نے ان سب کے لئے عبادت خانے نہیں بنوائے تھے، نہ ہی خدائے یہوہ کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش شامل کی تھی۔ انہیں اس سرزمین میں جو خداوند یہوہ کی وراثت تھی خدائے واحد کے انکار کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق خدائے یہوہ کا وفادار پرستار تھا۔

ڈکشنری آف بائبل میں بھی اس کی تائید ان الفاظ میں موجود ہے۔

ایسا باور کرنا مشکل ہے کہ (سلیمانؑ) بادشاہ خدائے یہوہ سے مرتد ہو کر بُت پرست ہوگیا تھا۔

یہ شہادتیں ان غیر مسلم (عیسائی) مورخین و محققین کی ہیں جو اپنے مذہب کی رُو سے تورات کو آسمانی کتاب مانتے ہیں اور قرآنِ کریم کو منجانب اللہ نہیں مانتے۔ غور فرمایئے کہ خود ان کی تحقیق کس کی تائید کر رہی ہے؟ لیکن اس کے باوجود ان کے نزدیک تورات آسمانی کتاب اور قرآنِ کریم انسانی تعلیم کا مجموعہ ہے۔ اس تعصب کا کیا علاج؟ لیکن بعید از انصاف ہوگا اگر اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا جائے کہ خود ہمارا لٹریچر بھی ان خرافات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تالمود کا قصہ جس میں حضرت سلیمانؑ کی "اسمِ اعظم" والی انگشتری کا افسانہ مذکور ہے، آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ یہ قصہ ہماری کتبِ تفاسیر میں درج ہے۔ یہاں تک کہ معالم التنزیل میں اتنا اضافہ اور بھی ہے کہ جب اس جن (یعنی جعلی سلیمان) کو حکومت کرتے کچھ عرصہ گذر گیا تو حضرت سلیمانؑ کے صحابی آصف نے آپ کی ازواجِ مطہرات سے پوچھا کہ باہر تو اس کا (یعنی جعلی سلیمان کا جس کے متعلق انہیں علم نہ تھا کہ وہ جعلی ہے) حال بہت بُرا ہے تمہارے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے؟ اس کے جواب میں آپ کی ازواج نے کہا کہ یہاں اس کا حال بدتر ہے یہ تو حیض کی حالت میں بھی اجتناب نہیں کرتا اور غسلِ جنابت بھی نہیں کرتا۔ (معاذ اللہ، معاذ اللہ) پناہ بخدا۔ یہ کچھ خدا کے ایک اولوالعزم پیغمبر کی ازواجِ مطہرات کے متعلق ذکر ہو رہا ہے)۔

بخاری شریف کی ایک روایت

اور کتبِ تفاسیر پر ہی کیا موقوف ہے خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال قال سلیمان بن داؤد لاطوفن اللیلۃ علی سبعین امرأۃ تحمل کل امرأۃ فارسا یجاھد فی سبیل اللہ فقال لہ صاحبہ انشاء اللہ فلم یقل ولم تحمل شیئا الا واحد ساقطا احدی شقیہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو قالھا لجاھد وافی سبیل اللہ۔ (بخاری شریف جلد دوم صفحہ ۱۵۶)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، حضورِ اقدس صلعم نے ارشاد فرمایا ایک بار سلیمان نے کہا کہ آج رات میں ستر عورتوں کا دورہ کروں گا اور ہر عورت حاملہ ہو کر ایک ایسا شاہسوار پیدا کرے گی جو

راہِ خدا میں جہاد کرے گا۔ سلیمان کے ساتھی (یعنی فرشتہ) نے کہا انشاء اللہ کہو. لیکن حضرت سلیمانؑ نے نہ کہا. نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی عورت حاملہ نہ ہوئی. صرف ایک عورت کے آدھا بچہ پیدا ہوا حضور اقدس صلعم نے فرمایا اگر سلیمان انشاء اللہ کہہ دیتے تو سب (سوار پیدا ہوتے اور) راہِ خدا میں جہاد کرتے۔

لیکن قرآن کریم کا عصائے کلیمی باطل کی ان تمام رسیوں کو نگلنے کے لئے کافی ہے، خواہ یہ یہود کے صومعوں میں ہوں یا وہاں سے رینگتے رینگتے حریم کعبہ میں آگھسیں. خدا اور اس کا رسولؐ ان تمام اتہامات سے بلند و بالاتر ہیں. واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

حضرت سلیمانؑ کا تذکرہ جلیلہ تو ختم ہوا. لیکن ایک واقعہ کے متعلق تھوڑی سی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے متعلق عجیب عجیب قسم کی روایات کتبِ تفسیر میں آئی ہیں. وہ واقعہ سورہ صٓ کی حسبِ ذیل آیات میں مذکور ہے (جو اس سے پہلے بھی سامنے آچکی ہیں).

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۞ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۞ فَقَالَ اِنِّيْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۞ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ۞ (۳۸/۳۳-۳۰)

اور (دیکھو) ہم نے داؤد کو سلیمان (جیسا فرزند) عطا کیا. وہ کتنا اچھا بندہ تھا. بلاشبہ وہ (خدا کی طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا. (یاد کرو) جب شام کے وقت اس کے سامنے عمدہ اور اصیل گھوڑے پیش کئے گئے تو وہ کہنے لگا کہ یاد رکھو میں نے اس مال کی محبت کو محض اپنے ربّ کی یاد کی وجہ سے پسند کیا ہے. یہاں تک کہ وہ گھوڑے آگے بڑھتے ہوئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے' (انہوں نے خدام سے کہا) ان گھوڑوں کو ذرا پھر تو میرے سامنے لاؤ. سو انہوں نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (محبت سے) ہاتھ پھیرنے شروع کر دیئے (اور انہیں سہلانے لگے).

کتبِ تفسیر میں روایت ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے بعد نمازِ ظہر اپنے گھوڑوں کا معائنہ شروع کیا. (یہ

گھوڑے ان روایات کے مطابق، دریا سے نکلے تھے اور ان کے پر بھی تھے!) جب نوسو دیکھ چکے، تو آپ کو نمازِ عصر یاد آئی. دیکھا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ آپ کی نماز فوت ہو گئی۔ اس سے آپ کو گھوڑوں پر سخت غصہ آیا۔ انہیں واپس لوٹایا اور آپ نے ان کی گردنیں اور پنڈلیاں تلوار سے کاٹ دیں کیونکہ یہ نماز کی راہ میں حائل ہوئے تھے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ مذکورہ صدر آیات میں اس قصے کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں۔ یہ سب ذہنِ انسانی کی افسانہ طرازیاں ہیں۔ قرآنِ کریم نے تو فقط اتنا بتایا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس گھوڑوں کا جید لشکر تھا۔ جب وہ ان کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے اس حقیقت کی وضاحت فرمادی کہ میں انہیں ذاتی کروفر اور شان و شوکت کے لئے نہیں چاہتا، بلکہ خدا کے "ذِکر" کی خاطر چاہتا ہوں (اور "ذِکر" کے متعلق قصہ حضرت موسیٰؑ میں بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم قیام و بقائے حکومتِ الٰہیہ ہے جس کے لئے مادی قوتوں کی ازبس ضرورت ہے، بالخصوص گھوڑوں کے لشکر کی)۔ سورۂ انفال میں جماعتِ مومنین سے بھی کہا گیا ہے کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت تیار شدہ گھوڑوں کے رسالوں سے کرو۔

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ
مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ
وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ
لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۗ وَ مَا تُنْفِقُوْا
مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ
اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (۸/۶۰)

اور (مسلمانو!) جہاں تک تمہارے بس میں ہے، قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلے کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے (کلمۂ حق کے دشمنوں) اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔ نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔ اللہ انہیں جانتا ہے اور (یاد رکھو)

اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کی تیاری میں) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے،
وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا' ایسا نہ ہوگا کہ تمہاری حق تلفی ہو!

اسی کی طرف حضرت سلیمانؑ نے اشارہ فرمایا۔ جب سب گھوڑے سامنے سے گذر گئے تو آپ نے انہیں لوٹانے کا حکم دیا، سب کو یا اُن میں سے خاص خاص کو۔ اور چونکہ یہ اللہ کی راہ میں جاں نثاری کے جانور تھے اس لئے خود اپنے ہاتھوں سے ان کی گردنوں اور پنڈلیوں کی مالش کی جس طرح حضرت عمرؓ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ بیت المال کے اونٹوں کو اپنے ہاتھ سے تیل ملا کرتے تھے (یا محبت اور پیار سے انہیں تھپتھپایا کرتے تھے)۔ یہ ہے ان آیات کا کھُلا مفہوم جس پر ذہن انسانی کی عجوبہ پسندی نے افسانہ طرازی کی ایک عجیب و غریب عمارت کھڑی کردی۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ (۲۱/۸۳)

استقامتِ ایوّبیؑ

جب اِس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

حضرت ایوب علیہ السلام

ربطِ مضمون کے اعتبار سے ہمیں دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے کوائف حیات مسلسل بیان کرتے جانا چاہیئے لیکن عصری تسلسل کے لحاظ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام حضرت ایوبؑ کا تذکرہ سامنے آجائے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ اور عیسو حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے تھے۔ عیسو اپنے گھر سے نکل کر اپنے چچا اسمٰعیلؑ کے ہاں نکل گئے اور وہیں ان کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔ ان کے متعدد اولادیں ہوئیں، جن میں سے عمالق اور عوض مشہور ہوئیں۔ عیسو کا عرف ادوم (سرخ گوں) تھا۔ اس لیے یہ خاندان ادومی کہلایا۔ بحرِ میت اور خلیج عقبہ کا درمیانی علاقہ ان کا مسکن تھا۔ تورات میں اس کا نام کوہِ سعیر آیا ہے۔ ان کا دارالحکومت رقیم (پیٹرا) تھا۔ حضرت ایوبؑ عوض کے قبیلے سے متعلق تھے۔ تورات میں سفرِ ایوبؑ ان کی طرف منسوب ہے۔ یوباب، اوب، اور ایوب ایک ہی نام ہے۔ ان کا زمانہ ۲۰۰۰ اور ۱۸۰۰ ق م کے درمیان سمجھئے[۱]۔ سفرِ ایوب میں ان کا قصہ تفصیلی طور پر مذکور ہے اور تورات کے عام انداز کے مطابق اس میں زیبِ داستان

۱؎ بعض اربابِ تحقیق کا یہ بھی خیال ہے کہ سفرِ ایوب مجموعۂ تورات میں قدیم ترین کتاب ہے جسے حضرت موسیٰؑ نے عبرانی میں منتقل کیا تھا۔ اس اعتبار سے حضرت ایوبؑ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ سے پہلے ہوگا۔ لیکن جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں، تاریخ نے ابھی ان معاملات میں یقینیات کا درجہ حاصل نہیں کیا، نہ ہمارا مقصد استقصارِ تاریخی ہے۔ اس لئے ان مباحثات میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔

کے لئے بھی بہت کچھ بڑھایا چڑھایا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بہ حیثیتِ مجموعی سفرِ ایوبؑ کا پیرایۂ بیان بڑا لاہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے آپ کی زندگی کا صرف ایک واقعہ بیان کیا ہے اور وہ بھی اختصار کے ساتھ۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

(۲۱/۸۳)

اور (ایوبؑ کا معاملہ یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا، "میں دُکھ میں پڑ گیا ہوں اور خدایا! تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں۔

واقعۂ حضرت ایوبؑ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کوئی سخت تکلیف لاحق ہو گئی تھی جس کے دفعیے کے لئے آپ بحضور ربّ العزت دعائیں مانگتے تھے، چنانچہ آپ کی دُعا کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۸۴)

پس ہم نے اس کی پکار سُن لی اور جس دکھ میں پڑ گیا تھا، وہ دُور کر دیا۔ ہم نے اس کا گھرانا (پھر سے) بسا دیا اور اس کے ساتھ ویسے ہی (عزیز و اقارب) اور بھی دے دیئے۔ یہ ہماری طرف سے اس کے لئے رحمت تھی، اور یہ نصیحت ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرنے والے ہیں!

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانۂ تکلیف و مصیبت میں آپ کے متعلقین بھی آپ سے الگ ہو گئے تھے، (اتفاقاً یا ارادۃً) اور جب یہ مصیبت کا زمانہ ختم ہوا، تو تندرستی بھی ملی اور اس کے ساتھ بچھڑے ہوئے ساتھی بھی۔ سورۂ صٓ میں ہے۔

وَ اذْكُرْ عَبْدَنَاۤ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ۝ (۳۸/۴۱)۔

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) ہمارے بندے ایوبؑ کا واقعہ یاد کر جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا کہ "(خدایا!) مجھے سانپ نے ڈس کر سخت اذیت پہنچائی ہے (تو میری امداد کر!)"

اس مقام سے اس تکلیف کی وجہ معلوم ہو گئی جس کا ذکر سورۂ انبیاء کی مذکورہ صدر آیت میں آچکا ہے، یعنی آپ کو سانپ[1] نے کاٹ لیا تھا اور اس کے زہر کی وجہ سے تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اس کے علاج کے لئے آپ کو ایسے چشمے کا نشان دیا گیا کہ جہاں کا پانی اس قسم کے امراض کے لئے (اپنی معدنی اور کیمیائی اثرات کے لحاظ سے) دوائی کا حکم رکھتا تھا۔

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ○ (۳۸/۴۲)

(ہم نے حکم دیا تھا) ذرا قدم بڑھا کر (تیز چلو[2]) یہ نہانے اور پینے کے لئے ٹھنڈا پانی موجود ہے (جو تمہاری تکلیف کے لئے دوا ہے)۔

اس کے بعد ان کے متعلقین کی بازیابی کا ذکر ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ○ (۳۸/۴۳)

اور (دیکھو) ہم نے ان کا کنبہ انہیں (پھر سے) دے دیا اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی یہ ہماری طرف سے (ایوب کے حق میں) رحمت تھی اور عقل والوں کے لئے نصیحت ہے!

"اھلہ" کے معنی کنبہ کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور جماعت کے لوگ بھی "مثلھم معھم" سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ وہ جماعت کے لوگ ہی تھے۔ یعنی پرانے ساتھی مل گئے اور ان کے مثل ان کے ساتھ اور بھی۔ اگلی آیت میں ہے۔

وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَ لَا تَحْنَثْ[3] ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ○ (۳۸/۴۴)

---

[1] شیطان بمعنی سانپ کے لئے "ابلیس و آدم" میں شیطان کا عنوان دیکھئے۔

[2] اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے پاؤں کو پانی میں اچھی طرح ہلاؤ۔

[3] حنث کے معنی دوسری جگہ یوں آتے ہیں۔

وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۚ ○ (۵۶/۴۶)

اور (دیکھو) وہ لوگ بہت ہی بڑے گناہ (شرک و کفر) پر اصرار کیا کرتے تھے۔

اور (ہم نے حکم دیا تھا کہ) اپنے ہاتھ میں (بتائی ہوئی) شاخوں کو مٹھا لو اور اس سے (مقامِ ماؤف) کو مارو۔ مگر (یاد رکھو) شرک میں نہ پڑ جانا۔ بلاشبہ ہم نے ایوب کو (بڑا ہی) صابر پایا۔ وہ کتنا اچھا بندہ تھا۔ درحقیقت وہ خدا کی طرف بڑا ہی رجوع ہونے والا تھا!

اس آیت کی تفسیر میں طرح طرح کی روایات بیان کی گئی ہیں، جن کا ماخذ تورات کے افسانے ہیں۔ قرآن نے تو صرف اتنا بتایا ہے کہ حضرت ایوبؑ سے کہہ دیا تھا کہ جاہل لوگ سانپ کے کاٹے کا علاج جھاڑ پھونک اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا سے کرتے ہیں۔ یہ شرک ہے۔ تم اس قسم کی کوئی بات نہ کرنا خواہ تمہیں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ اس کا علاج جڑی بوٹیوں سے ہوگا۔ ان بوٹیوں کو لو اور انہیں زخم پر رگڑو۔ چنانچہ حضرت ایوبؑ نے نہایت استقامت سے اس تکلیف کو برداشت کیا اور مشرکانہ جھاڑ پھونک کی طرف مائل نہ ہوئے بلکہ مستقل مزاجی سے اس کا علاج کرتے رہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ کونسی اتنی بڑی بات تھی جس کے لئے قرآن نے اس قصے کو بیان کیا؟ یہ ٹھیک ہے کہ آج یہ بات کچھ اتنی بڑی نظر نہیں آتی لیکن اُس زمانے میں جس کا ذکر ہو رہا ہے، یہ باتیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ وہ توہم پرستی کا دور تھا جس میں انسان قدم قدم پر حقیقت کو چھوڑ کر خرافات کی طرف جھک جاتا تھا۔ اُس دور میں، خدا کا جو بندہ تکلیف برداشت کر لے لیکن توہم پرستیوں کی طرف مائل نہ ہو، فی الواقع بہت بڑا انسان تھا۔ اس اعتبار سے قرآن نے حضرت ایوبؑ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا (ہم نے اسے مستقل مزاج پایا) نِعْمَ الْعَبْدُ (کتنا اچھا تابع فرمان) اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ [۳۸/۴۴] (ہر تکلیف اور مصیبت میں خدا کی طرف رجوع کرنے والا)۔ یہ تھے حضرت ایوبؑ۔

تورات اور اس کے تتبّع میں ہمارے ہاں کے اکثر مفسرین نے اس باب میں کیا کیا رنگ آمیزیاں کی ہیں' ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ (کہا جاتا ہے کہ) اس تکلیف کے دوران میں آپ کی بیوی نے شیطان کے ورغلانے سے آپ کی طبیعت شرک کی طرف مائل کرنا چاہی جس سے آپ نے غضبناک ہو کر قسم کھائی کہ اگر میں تندرست ہو گیا تو تمہیں سو لکڑیاں ماروں گا۔ بیوی تھی صادق الایمان۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو قسم پورا کرنے کے لئے (معاذ اللہ) یہ حیلہ بتایا کہ سو تنکے لے کر ان کی جھاڑو بناؤ اور

اسس سے بیوی کو یونہی چھوڑ دو، بات پوری ہو جائے گی لیکن یہ محض مفتریات و مخترعات ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآنِ کریم میں حضرت ایوبؑ کا ضمنی ذکر (۶/۸۵) اور (۴/۱۶۳) میں بھی آیا ہے۔

فنادٰی فی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۲۱/۸۷

عزمِ یونسی

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گُہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

حضرت یونس علیہ السلام

۸۰۰ ق.م

یہ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ ان کا عبرانی نام "یوناہ" تھا جو عربی میں آکر یونس ہوگیا۔ تورات میں ان کا نوشتہ "کتابِ یوناہ" بھی موجود ہے۔ ۸۰۰ ق م کے قریب ان کا زمانہ قیاس کیا جاتا ہے۔

اس سے بیشتر جن اقوام و ملل کے حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، ان کا انداز یہ تھا کہ خدا کا رسول انہیں ان کے اعمال کے نتائج و عواقب سے ڈراتا۔ لیکن وہ صحیح راستہ اختیار کرنے کی بجائے سرکشی اور تکبر اختیار کرتے اور اللہ کے اٹل قانون کے ماتحت ان کے اعمال کے نتائج عذابِ الٰہی بن کر ہلاک و برباد کر دیتے، لیکن حضرت یونسؑ کے تذکرہ میں ہمیں معاملہ اس کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔ یعنی آپ نے قوم کو آگاہ کیا اور کہہ دیا کہ خدا کا عذاب اب آنے ہی والا ہے۔ اس پر قوم نے فوراً اپنی روش کو بدل لیا اور سرکشی و معصیت کاری کے بجائے عجز و نیاز سے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ شانِ کریمی نے ان کے عرقِ انفعال کو موتی سمجھ کر چن لیا اور عذاب مبدل بہ رحمت ہو گیا۔

تورات کا بیان صحیفۂ یوناہ میں ہے کہ آپ کو بارگاہِ خداوندی سے حکم ملا کہ جا کر نینوا کے باشندوں کو ان کے اعمالِ بد کے نتائج سے ڈرائیں اور عذابِ خداوندی کی تنذیر پہنچائیں۔ نینوا اس زمانہ میں تہذیب و تمدن اور قوت و حشمت کا گہوارہ تھا۔ آپ اس عظیم الشان مہم کے تصور سے گھبرا گئے (واضح رہے کہ یہ تورات کا بیان ہے) اور یافا سے ایک جہاز میں سوار ہو کر (نینوا کے بجائے) ترسیس کی طرف چل دیئے۔ راستہ میں جہاز کو طوفان نے آ پکڑا۔ اس زمانہ میں ملاحوں کا عقیدہ تھا کہ

ایسے طوفان کے وقت کشتی میں کوئی نہ کوئی گنہگار موجود ہوتا ہے۔ جب تک اسے کشتی سے نکال نہ دیا جائے طوفان نہیں تھمتا۔ چنانچہ مسافروں نے قرعہ اندازی شروع کی کہ کسے حوالۂ دریا کیا جائے۔ حضرت یونسؑ نے سنا تو خود ہی اپنے جی میں خیال کیا کہ مجھ سے بڑھ کر اور کون گنہگار ہوگا جو (معاذ اللہ) خدا سے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے؟ آپ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ ادھر قرعہ اندازی کا فیصلہ بھی آپ ہی کے متعلق ہوا۔ ملّاحوں نے آپ کو سمندر میں ڈال دیا، جہاں آپ کو ایک مچھلی نگل گئی۔ آپ تین دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ اس کے بعد اس نے آپ کو ساحل پر اُگل دیا۔ اس حادثہ کے بعد آپ کو پھر نینوا جانے کا حکم ہوا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر اعلان کر دیا کہ چالیس دن بعد خدا کا عذاب آجائے گا۔ یہ سُن کر باشندگانِ نینوا نے سرکشی و معصیت کے بجائے خدا کے حضور تذلل اور تعبد کا اظہار شروع کر دیا اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک اللہ کے ڈر سے کانپنے لگ گئے۔ اس سے ان کا عذاب ٹل گیا۔ لیکن یہ چیز حضرت یونسؑ پر گراں گزری کہ خدا کی طرف سے ایسی (وعدہ خلافی) کیوں ہوئی؟ وہ شہر سے باہر ایک چھپر بنا کر بیٹھ گئے۔ رینڈی کے درخت کی شاخیں اِدھر اُدھر پھیل گئیں۔ لیکن ایک مرتبہ اس کی جڑوں میں کیڑا لگ گیا۔ صبح اُٹھ کر آپ کیا دیکھتے ہیں کہ درخت کے پتے سب خشک ہو چکے ہیں، آپ کو اس پر بہت رنج ہوا۔

> تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اُس رینڈی کے درخت پر رحم آیا جس کے لئے تو نے کچھ محنت نہ کی اور نہ تو نے اُسے اُگایا جو ایک ہی رات میں اُگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا۔ اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوا پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں جو اپنے دہنے بائیں ہاتھ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے اور مواشی بھی بہت ہیں شفقت نہ کروں؟ (یوناہ نبی ۱۰ — ۱۱/۴)

یہ تورات بیان تھا۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن نے قصۂ حضرت یونسؑ کو کس انداز میں بیان کیا ہے۔ سورۂ صٰفّٰت میں ہے۔

وَ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ؕ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ (۳۷: ۱۳۹-۱۴۰)

اور (دیکھو) یونس بھی (ہمارے) فرستادہ پیغمبروں میں سے تھا۔ (یاد کرو) جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف لپک کر گیا تھا۔

اس میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ آپ (معاذ اللہ) خدا کے حکم کی تعمیل سے جی چرا کر بھاگ نکلے تھے۔ قرآنِ کریم کی رُو

سے اللہ کے ایک رسول کے متعلق ایسی بات کا تصور بھی کفر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سورۃ انبیاء میں آپ کے خشمناک ہونے کا ذکر آیا ہے۔

وَ ذَاالنُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۲۱/۸۷-۸۸)

اور (اسی طرح) ذالنون (کا معاملہ یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ وہ اپنی قوم کی روش سے تنگ آکر غصہ کی حالت میں وہاں سے چل دیا (حالانکہ ہم نے ابھی اُسے ہجرت کا حکم نہیں دیا تھا۔ چونکہ اس کا وہاں سے چل دینا خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں تھا اس لئے اسے اس کا خیال تک بھی نہ تھا کہ اس سے اس کا کوئی مؤاخذہ کیا جائے گا۔ لیکن وہ اپنے غلط پروگرام کی وجہ سے مشکلات میں گھر گیا تو اس نے ہمیں پکارا اور عرض کیا کہ بارِ الٰہا! تیرے سوا کوئی حاکم نہیں۔ تیرے فیصلے ہر نقص سے پاک ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے (اپنے اوپر بڑا ہی) ظلم کیا!

تب ہم نے اس کی پکار سُن لی اور غمگینی سے اُسے نجات دی (دیکھو) ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں!

ہم یہ دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ رسول پہلے اپنی قوم کو حق کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن جب مسلسل دعوت و تبلیغ کے باوجود یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ قوم صحیح راستے کی طرف نہیں آرہی تو وہ خدا کے حکم کے مطابق اس مقام کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کے متعلق یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں اس دعوت کے لئے فضا زیادہ سازگار ہے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونسؑ نے جب دیکھا کہ قوم اپنی سرکشی اور مخالفت سے باز نہیں آتی تو وہ قوم سے ناراض ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے لئے چل نکلے۔ ابھی خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ ان کا یہ فیصلہ خدا کے کسی حکم کے خلاف نہیں تھا اس لئے انہیں اس کا خیال تک بھی نہیں آسکتا تھا کہ ان کا یہ فیصلہ خدا کی نارضامندی کا موجب ہوگا۔ لیکن جب انہیں مشکلات کا سامنا ہوا تو اس کا احساس ہوا کہ میں نے یہ فیصلہ خدا کے حکم سے پہلے ہی کر لیا اس لئے یہ منشائے ایزدی کے مطابق نہیں ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لئے اللہ سے معافی چاہی۔

واقعہ کی دوسری کڑیاں سورۃ الصّٰفّٰت کی آیات (۱۴۰ ـــ ۱۴۸/۳۷) میں بیان ہوئی ہیں۔ انہیں ہم مفہوم القرآن سے درج کرتے ہیں۔

(لیکن اس سے ذراسی اجتہادی غلطی ہوگئی۔ وہ قوم کی مخالفت سے سخت گھبرا گیا اور بیشتر اس کے کہ اسے خدا کی طرف سے ہجرت کرنے کا حکم ملتا) وہ اپنے فرائضِ منصبی کو چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہوگیا اور دریا پار کرنے کے لئے، دوسری سواریوں کے ساتھ ایک کشتی میں بیٹھ گیا۔ (۲۱/۸۷)

(یہ اس کی طرف سے ہمارے قانون کے خلاف دانستہ سرکشی نہیں تھی۔ لیکن) بہرحال تھا تو ہمارے قانون کے خلاف۔ یوں اس سے یہ لغزش سرزد ہوگئی۔

کشتی میں بوجھ زیادہ تھا۔ وہ ڈوب گئی اور یونسؑ کو ایک بہت بڑی مچھلی نے مُنہ میں دبوچ لیا۔ وہ اس مصیبت کو دیکھ کر اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا (کہ وہ جو، خدا کی اجازت کے بغیر قوم کو چھوڑ آیا ہے، یہ اس کی سزا ہے)۔

لیکن اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، انتہائی جدّوجہد کی اور مچھلی کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔

اگر وہ ایسا نہ کرتا اور بہت اچھا تیراک نہ ہوتا تو مچھلی اسے نگل لیتی اور پھر وہ قیامت تک باہر نہ آسکتا)۔

ہم نے اُسے، دریا کے کنارے، کھلے میدان میں ڈال دیا (۶۸/۴۹)۔ لیکن اس کشمکش اور دہشت کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہوگیا تھا۔

اس نے ایک بڑے بڑے پتّوں والے پودے کے سائے میں جاکر آرام کیا تو اس کی حالت سنبھلی۔

اور ہم نے اسے پھر اس کی قوم کی طرف بھیجدیا (وہ بہت بڑی قوم تھی) جس کی تعداد ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔

وہ لوگ ہمارے قانون پر ایمان لے آئے تو ہم نے اُسے، ایک مدّتِ معینہ تک، زندگی کے سازوسامان سے نوازا۔ (اس قوم نے ایمان لے آنا تھا۔ یونسؑ نے جلد بازی سے کام لیا جو ان سے مایوس ہوکر، وہاں سے چلا گیا۔ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم اس وقت ملا کرتا ہے جب اس قوم

میں حق وصداقت کی قبولیت کا امکان باقی نہ رہے۔ اس سے پہلے وہاں سے چلے جانا گویا اپنے فرضِ منصبی کو چھوڑدینا ہے۔ یہی یونسؑ کی اجتہادی غلطی تھی)۔ (مفہوم القرآن ۱۴۸۔۱۴۰/۳۷)

اہلِ نینوا کی دوبارہ سرکشی

چنانچہ اہلِ نینوا اس وقت تو خدا کے عذاب سے محفوظ ہوگئے، لیکن کچھ عرصہ بعد قریب ۶۹۰ قم میں انہوں نے پھر وہی شیوۂ سرکشی اختیار کر لیا اور بنی اسرائیل کے ایک اور نبی نے (جن کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں لیکن یہود کی روایات میں ملتا ہے) انہیں خدا کے عذاب سے متنبّہ کیا۔ وہ باز نہ آئے تو اس کے قریب ستر برس بعد اہلِ بابل نے ان پر حملہ کیا۔ ادھر سے دجلہ میں سیلاب آیا اور اس سے نینوا کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ سورۂ یونسؑ میں واقعۂ مہلت کی طرف اشارہ کرکے فرمایا گیا۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝ (۱۰/۹۸)

پھر کیوں ایسا ہوا کہ قومِ یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ (نزولِ عذاب سے پہلے) یقین کرلیتی اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتی؟ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی، تو ہم نے رسوائی کا وہ عذاب اُس پر سے ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک سروسامانِ زندگی سے بہرہ مند ہونے کی مہلت دے دی۔

آیت (۲۱/۸۷) میں آپ کا ذکر ذالنون (مچھلی والا) کے لقب سے آیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر آپ کو صاحبِ حوت (مچھلی والا) کہا گیا ہے (۶۸/۴۸)۔ ضمنی طور پر حضرت یونسؑ کا تذکرہ (۴/۱۶۳) اور (۶/۸۷) میں بھی آیا ہے۔

پنکھڑیاں

ان حضرات انبیاء کرام کے علاوہ جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، قرآن کریم میں تین اور رسولوں کا اجمالی ذکر آتا ہے جن کی تفصیل معلوم نہیں۔ اوّل حضرت ادریسؑ۔

حضرت ادریسؑ

سورۂ مریم میں ہے۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ز اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۙ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ○ (۱۹/۵۷-۵۶)

اور (اے پیغمبرؐ!) کتاب میں ادریس کا بھی ذکر کر۔ بلاشبہ وہ بھی مجسم سچائی اور نبی تھا اور ہم نے اسے بڑے ہی اونچے مقام تک پہنچا دیا تھا۔

اور سورۂ انبیاء میں ہے۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ ۚۖ (۲۱/۸۵)

اور (اسی طرح) اسمٰعیل، ادریس، ذوالکفل، سب (راہِ حق میں) صبر کرنے والے تھے۔

قیاس یہ ہے کہ ان کا زمانہ حضرت نوحؑ سے بھی پہلے کا ہے اور آپ کا نام تورات میں حنوک یا اخنوع ہے۔ اگر آپ اخنوع ہی ہیں تو پھر آپ حضرت نوحؑ کے اجداد میں چوتھی پشت پر آتے ہیں۔ کیونکہ تورات نے حضرت نوحؑ کا نسب نامہ (حضرت) نوحؑ بن لمک، بن متوسلح، بن حنوک لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو باب پیدائش ۲۱ — ۵/۲۹)۔

دوسرے حضرت الیاسؑ۔ سورۃ انعام میں ہے۔

وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ط كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ (۶/۸۵)

اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے۔

اور سورۃ صٰفّٰت میں ہے۔

وَ اِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ٥ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ۙ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ٥ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ٥ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ۙ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ٥ (۱۲۳ — ۳۷/۱۳۰)

اور بلاشبہ الیاس بھی خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں میں سے تھا۔ (یاد کرو) جب اُس نے اپنی قوم سے کہا (لوگو!) کیا تم خدا سے ڈرتے نہیں؟ کیا تم بعل[1] کو تو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو (یعنی) خدا کو جو تمہارا اور تمہارے پہلے آباء و اجداد کا پروردگار ہے (چھوڑ دیتے ہو؟) مگر انہوں نے الیاس کو جھٹلایا۔ پس بلاشبہ وہ ضرور (عذاب آخرت میں) پکڑے جائیں گے، سوائے خدا کے مخلص بندوں کے۔ اور ہم نے بعد کے آنے والوں میں اس کا ذکرِ خیر چھوڑ دیا۔ الیاس پر (خدا کی طرف سے) سلامتی ہو۔

قیاس یہ ہے کہ آپ وہی ہیں جن کا نام تورات میں ایلیا نبی آیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ادریسؑ ہی کا دوسرا نام الیاسؑ ہے لیکن اگر حضرت ادریسؑ حضرت نوحؑ کے اجداد میں سے ہیں تو آپ حضرت الیاسؑ نہیں ہوسکتے۔ اس لئے کہ جیسا کہ آیت (۸۵ — ۶/۸۶) سے واضح ہے قرآن کریم نے آپ کو حضرت نوحؑ کی ذریت میں بتایا ہے۔ آپ غالباً انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہی ہیں۔

حضرت ذوالکفلؑ

تیسرے حضرت ذوالکفلؑ۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ط كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۙ (۲۱/۸۵)

اور (اسی طرح) اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل، سب (راہِ حق میں) صبر کرنے والے تھے۔

---

[1] بعل کے لفظی معنی قوت و تسلط کے ہیں۔ یہ سامی قبائل میں سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ شام میں بالخصوص اس کی پرستش ہوتی تھی۔ تورات میں اس کا اکثر ذکر آتا ہے۔ (مثلاً دیکھئے تواریخ ۲، ۲۳/۲)

دوسری جگہ ہے۔

وَ اذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ وَ كُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِؕ (۳۸/۴۸)

اور (اے پیغمبرؐ!) کتاب میں اسمٰعیل، الیسع اور ذالکفل کا ذکر کرو اور (دیکھو) یہ سب کے سب نیک لوگوں میں سے تھے۔

قیاس یہ ہے کہ آپ حزقی ایل نبی ہیں جن کا صحیفہ تورات میں موجود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپ بھی انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔

گذشتہ سطور میں ان انبیائے کرامؑ کا ذکر کیا گیا ہے جن کی قوموں کا حال ہنوز پردۂ اخفا میں ہے۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم نے دو تین ایسی اقوام کا ذکر کیا ہے جن کی طرف مبعوث شدہ پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن جن کی ہلاکت اور بربادی، اسی قانونِ مکافاتِ عمل کے ماتحت واقع ہوئی جو اپنے نتائج میں اٹل اور گرفت میں محکم ہے۔ ان میں سے ایک اصحابِ تُبّع ہیں۔ سورۂ قٓ میں ہے۔

قومِ تُبّع

وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ○ (۵۰/۱۴)۔

اور گھنے جنگل والے اور قومِ تُبّع بھی (ان ہی سرکش لوگوں میں سے ہیں)۔ ان میں سے ہر ایک نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا، جس کے نتیجہ میں ہماری وعید کے مستحق ہو گئے!

دوسرے مقام پر (سورۂ دخان) میں قریش کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ قوت و سطوت میں بڑھے ہوئے ہیں یا اصحابِ تُبّع جن کی بربادی پر یہ خود شاہد ہیں۔

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ○ (۴۴/۳۷)

(قوت و سطوت کے اعتبار سے) وہ (قریش) بہتر ہیں یا قومِ تُبّع اور وہ قومیں جو اس سے بھی پہلے گذر چکی ہیں؛ (سب کو معلوم ہے کہ) ہم نے انہیں سب کو ہلاک کر دیا۔ بلاشبہ وہ تھے ہی بڑے مجرم لوگ! (پھر قریش کو ہلاک کر ڈالنا ہمارے لئے کونسا مشکل ہے؟)

اصحابِ تُبّع کون تھے؟ تذکرہ حضرت سلیمانؑ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ یمن کے مشرقی علاقہ میں سبا کی حکومت تھی۔ اسی قوم کی ایک شاخ مغربی علاقہ پر حکمران تھی جسے حمیر کہتے ہیں۔ جب رومیوں

نے اہلِ سبا کی تجارت کو مٹایا ہے تو حمیر کا ستارۂ اقبال چمک اٹھا اور بڑی زبردست قوت اور دولت کے مالک بن گئے۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ نے اپنا لقب تُبَّع اختیار کیا جس کے معنی حبشی زبان میں سلطان کے ہیں، یعنی غلبہ و استیلاء اور قوت و جبروت کا مالک۔ یہ خاندان بھی اہلِ سبا کی طرح شروع میں کواکب پرست تھا۔ اس کے بعد یہودیت اور عیسائیت نے اپنا دامنِ اثر پھیلانا شروع کیا۔ نجران کے شہر میں عیسائیت نے فروغ پایا۔ لیکن چونکہ اہلِ تُبَّع کو رومیوں (اور حبشیوں) سے سخت مخاصمت تھی اس لئے انہوں نے عیسائیت کے مقابلہ میں یہودیت کو ترجیح دی اور ملک میں عام طور پر یہودیت پھیل گئی رومی قیصر جسٹینین نے تُبّعِ یمن کے دربار میں اپنا قاصد بھی بھیجا تھا تاکہ ان سے مراسمِ صلح و مودّت قائم رکھے جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عیسائی پادریوں (راہبوں) کی ایک جماعت بھی "مسیح کی منادی" میں مصروفِ عمل تھی۔ تبع ذونواس زمانہ میں یمن کا حاکم تھا۔ چونکہ نجران عیسائیت کا مرکز تھا اس لئے اس نے عیسائی راہبوں کی تبلیغ سے مشتعل ہو کر نجران پر حملہ کر دیا۔ پہلے تو اہلِ شہر قلعہ گزین ہو گئے لیکن بالآخر شکست کھائی۔ ذونواس کا تعصب، بربریت تک اُتر آیا۔ اُس نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ روشن کی اور عیسائیوں کو مجبور کیا کہ وہ یہودیت قبول کریں۔ جو اس سے انکار کرتا تھا آگ کے گڑھے میں جھونک دیا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے ذونواس اور اس کی جماعت کو اصحٰب الاخدود (گڑھوں والے) کہا ہے۔

اصحاب الاخدود

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ؕ وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ (۸۵/۹-۴)

(دیکھو) خندقوں والے، یعنی بہت سے ایندھن کی آگ والے (جو انہوں نے خندقوں میں روشن کر رکھی تھی) تباہ کر دیئے گئے۔ (یاد کرو) جب وہ اُس آگ کے اُس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والے بندوں کے ساتھ (ظلم و ستم) کر رہے تھے اسے خوب اچھی طرح دیکھ رہے (اور سمجھ رہے) تھے۔ اور وہ ان مومنوں پر بجز اس کے کوئی حرف گیری نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو (بڑا ہی) زبردست اور (ہر طرح) قابلِ تعریف ہے۔ ایسا خدا جسے

آسمانوں اور زمین کی سلطنت و حکومت حاصل ہے۔ اور (یاد رکھو) اللہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے (اس لئے کوئی بھی مکافاتِ عمل سے بچ نہیں سکتا)۔

ذرا قرآنِ کریم کی کشادہ نگہی اور وسعتِ دانائی پر غور کیجئے۔ عیسائیوں پر مظالم ہو رہے ہیں اور قرآنِ کریم انہیں اس طرح اپنے آغوشِ رافت و محبت میں لے کر ان کا تذکرہ کرتا ہے جیسے بالکل اپنے ہوں اور اپنے ہونے میں شبہ بھی کیا تھا؟ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ تمام انبیاء کرام اور ان کے ماننے والی جماعتیں ایک ہی سلسلۃ الذہب کی مختلف کڑیاں تھیں۔ اس لئے قرآنِ کریم، نزولِ قرآن سے پیشتر انہیں بھی مومن قرار دیتا ہے۔ یہ تو ان قوموں کا تعصّب بیجا ہے جو قرآن اور اس کے حامل (نبیٔ اکرمؐ) کو اپنے سے غیر سمجھ رہے ہیں جو اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اگر وہ جماعتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتیں تو بدستور مومن رہتیں۔ لیکن حضورؐ کی رسالت کے انکار سے انہوں نے اپنے آپ کو نہ ماننے والوں (کفار) کے زمرہ میں شامل کر لیا اور یہ نہ سمجھے کہ خدا کی طرف سے ایک نئے رسولؐ (اور جدید کتاب) آ جانے کے بعد، پہلے رسولوں (اور کتابوں) پر ایمان اسی صورت میں صحیح قرار پا سکتا ہے جب اس نئے رسولؐ (اور کتاب) پر ایمان لایا جائے کہ یہ رسول بھی اسی خدا کا فرستادہ اور یہ کتاب بھی اسی اللہ کا نازل فرمودہ ہے جس نے اس سے پیشتر رسولوں اور کتابوں کو بھیجا تھا۔

اس کے علاوہ نجران کے ان مصیبت زدہ عیسائیوں کا ذکر اس لئے بھی اس انداز میں کیا گیا ہے کہ وہ مظلوم تھے اور قرآن، دنیا میں ہر مظلوم کا حامی ہے خواہ وہ کسی قوم اور کسی مذہب سے متعلق ہو (لیکن ظلم کسے کہتے ہیں اور مظلوم کون ہوتا ہے؟ اس کے متعلق بھی قرآن ہی کی میزان کی طرف رجوع کرنا چاہیئے)۔

واضح رہے کہ آیات (۴ — ۸۵/۹) میں خود قریش کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جو جماعتِ مومنین کے خلاف جنگ کے لئے خندقیں کھود رہے تھے۔ (ہم نے مفہوم القرآن میں یہی مفہوم لیا ہے اور موجودہ مفہوم تاریخی روایات کی رُو سے لیا گیا ہے)۔

اصحاب الرّس

اصحاب الرّس کا ذکر قرآنِ کریم میں دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک سورۃ فرقان میں:۔

وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۞ (۲۵/۳۸)

اور (دیکھو) ہم نے عاد و ثمود اور اصحاب الرّس اور ان کے درمیان میں بہت سی نسلوں (اور قوموں) کو ہلاک و برباد کر دیا ہے۔

اور دوسرے سورۃ قٓ میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ۙ (۵۰/۱۲)

(اور اے پیغمبر!) ان اقوامِ عرب سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرّس اور قوم ثمود بھی (اپنے اپنے رسولوں کو) جھٹلا چکی ہیں (پس یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم ان کے افکار پر دل گرفت نہ ہو!)۔

حضرت اسمٰعیلؑ ارضِ حجاز میں آکر متمکن ہوئے تھے۔ آپ کے بارہ بیٹے تھے جو اپنے خاندانوں کے رئیس تھے۔ ان میں سے ایک کا نام قیدماہ تھا۔ اصحاب الرّس انہی کی اولاد میں سے قیاس کئے جاتے ہیں۔

اصحابُ الحِجر

اصحاب الحجر کا ذکر قرآن کریم میں صرف ایک مقام پر آیا ہے۔

وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ ۙ (۱۵/۸۰)

اور بلاشبہ اصحابِ حجر نے بھی (خدا کے بھیجے ہوئے) رسولوں کو جھٹلایا ہے۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے بڑے بیٹے کا نام نبایط تھا۔ ان کے خاندان کو نبط (جمع انباط) کہا جاتا ہے۔ شام و عرب کے حدود پر ان کی حکومت کے آثار ملتے ہیں۔ تورات میں (حزقیل نبی کے صحیفہ میں) نبط کا ذکر آیا ہے۔ پہلے ان کا دارالسلطنت رقیم تھا لیکن جب اس پر رومیوں نے قبضہ کر لیا تو وادی القریٰ میں دوسرے شہر حجر کی طرف منتقل ہو کر آ گئے۔ اسی نسبت سے انہیں اصحٰب الحجر کہا گیا ہے۔ ایسی عظیم الشان سلطنت کے مالک رفتہ رفتہ رومیوں کی محکومیت میں آ گئے۔ اور محکومی اور غلامی کا یہی وہ عذاب ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے اشارہ کیا ہے کہ محکومی سے بڑھ کر انسانیّت کی میزان میں اور کوئی عذاب رُسوا کن اور جاں گداز نہیں ہو سکتا۔ جب اسلام کا ظہور ہوا ہے تو اس قوم کے منتشر افراد شام کے گرد و نواح میں غلہ فروشی کرتے نظر آتے تھے۔ چونکہ ان کے عروج و زوال کا گہوارہ خود عربوں کی سرزمین تھی، اس لئے قرآنِ کریم نے عبرت و موعظت کے صفحات پر ان کے مٹے ہوئے نقوش کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ چونکہ ان سے بہت پہلے قوم ثمود کا مرکز بھی حجر کا شہر رہ چکا ہے اس

لئے مؤرخین کا خیال اس طرف بھی گیا ہے کہ قرآنِ کریم کی مذکورہ صدر آیت میں اصحاب الحجر سے مراد قومِ ثمود ہی ہے لیکن قیاسِ غالب یہی ہے کہ ان سے مراد قومِ نباط ہی ہے جس کے عروج و زوال کی داستانیں آج بھی حجر کے کھنڈرات کی اینٹوں پر منقوش ملتی ہیں۔

ایک اہم ضمنی گوشہ زیرِ نظر عنوان کے مختصرات کے متعلق کسی تصریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ اس مقام پر ایک چیز سامنے آگئی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے۔ مغرب کے مستشرقین نے جب دیکھا کہ جہاں تک قرآنی تعلیم کا تعلق ہے اس پر صحیح اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں، تو انہوں نے قرآن کے خلاف اعتراض کی ایک اور راہ نکالی اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کے بیان کردہ بعض قصص و واقعات تاریخی طور پر قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ فلاں نبیؑ کا تاریخ میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ فلاں واقعہ کی تاریخی حیثیت محلِ نظر ہے وقس علیٰ ہذا۔ اس سے ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح قرآن سے متعلق دلوں میں شکوک و ارتیاب کے کانٹے بو دیئے جائیں اور اس طرح یہ خیال عام کر دیا جائے کہ نبی اکرمؐ نے (معاذ اللہ) سنی سنائی باتوں کو الہامی کہہ کر پیش کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن کے متعلق ایک ثانیہ کے لئے بھی یہ خیال دل میں پیدا ہو جائے کہ اس کے "مصنف" خود نبی اکرمؐ ہیں تو دین کی پوری عمارت نیچے آگرتی ہے۔ اس لئے کہ یہ عمارت استوار ہی اس بنیاد پر ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے، کسی انسان کی تصنیف نہیں۔ اس مذموم کوشش کی ابتدا مغرب کے بعض مستشرقین سے ہوئی اور اس کے بعد ان کی نقالی میں ہندوستان کے بعض ایسے گوشوں سے اس کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی جو اپنے آپ کو "مسلمان" کہلانے کے باوجود اسلام کے ان بدترین دشمنوں کے آلۂ کار و نفیر بننے میں فخر و سعادت محسوس کرتے ہیں اور اس قسم کے اعتراضات کی اشاعت سے عوام پر اپنی تجدد پسندی، روشن خیالی، تحقیقاتِ علمی اور دقتِ نظر کا رعب جمانا چاہتے ہیں[1]۔ قرآن علم و یقین کا پیغامبر ہے اس لئے اسے علم و یقین کے ترازو میں تلنے سے ذرا بھی تامل نہیں۔ وہ سرتاپا حق ہے۔ اس لئے اسے حق و صداقت کی کسی محفل میں آنے سے جھجک نہیں۔ وہ عین حقیقت ہے اس لئے اسے علمی تحقیقات کی کسوٹیوں پر پرکھے جانے میں ادنیٰ سا تکلف بھی نہیں۔ ہمیں اس پر ذرا بھی اعتراض نہیں کہ دنیا بھر کے محقق اس کے ایک ایک

---

[1] اشاعتِ حاضرہ کے وقت یہ باتیں داستانِ پارینہ بن چکی ہیں۔

دعوے کو تحقیق کے کانٹے میں تولیں اور تنقید کی میزانوں میں پرکھیں۔ وہ تو خود تمام نوعِ انسانی کو چیلنج دیتا ہے کہ آؤ اور میری مثل و نظیر کچھ پیش کرو!! وہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ میری دعوت، جہالت اور توہم پرستی کے اندھے عقیدوں پر مبنی نہیں بلکہ علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر ہمارے لئے اس میں گھبرانے کی کونسی بات ہے کہ قرآن کے دعاوی کو علمی معیاروں پر کیوں پرکھا جا رہا ہے؟ لیکن جس چیز پر ہمیں اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کو علم کے معیاروں پر پرکھئے، قیاسات کی ترازوؤں میں نہ تولئے۔ اسے ہر اس علمی تحقیق کے مقابل میں لایئے جو یقین کا درجہ حاصل کر چکی ہو۔ لیکن ظن و قیاس کو حق و یقین بتا کر عوام کو دھوکا نہ دیجئے۔ یہ روش، علم کے بازار میں دیانتداری نہیں کہلا سکتی۔

اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن کے بیان کردہ فلاں واقعہ کا تاریخی ثبوت نہیں ملتا، یعنی ان معترضین کے پاس قیاس کی میزان ہے جسے انہوں نے "دھرم کانٹا" تصور کر رکھا ہے اور جو چیز اس میزان میں پوری نہیں اترتی وہ اُن کے نزدیک ساقط الاعتبار اور ناقابلِ یقین ہے! لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے پاس اس دعوے کا ثبوت کیا ہے کہ تاریخ نے اپنی تحقیقات کی تکمیل بھی کر لی ہے اور ہر تحقیق کو یقین کا درجہ بھی مل چکا ہے؟ یعنی یہ ماضی میں جو کچھ ہو گزرا ہے ہماری تاریخ اس کے متعلق مکمل تحقیق کر چکی ہے اور اس کی تحقیق کے نتائج یکسر حتمی و یقینی قرار پا چکے ہیں۔ اس لئے اب نہ اس کی تحقیقات کی فہرست میں کسی اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ ہی اس کے نتائجِ مستخرجہ میں کسی تبدیلی کا امکان! ہمیں علمِ تاریخ کی اہمیت سے انکار نہیں۔ (جیسا کہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے)۔ قرآنِ کریم خود اس کی اہمیت پر زور دیتا اور اسے حاصل کرنے کی تاکید کرتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس، اپنے زمانہ تک کے تاریخی نتائج کو مکمل اور غیر متبدل قرار دینے کا ثبوت کیا ہے؟ ازمنۂ قدیمہ کے متعلق تاریخی تحقیقات کی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) اگر آج سے ایک سو سال پیشتر کے کسی مغربی مؤرخ کی تاریخ کی کتاب اٹھا کر دیکھئے اور اس کے بعد اس پر غور کیجئے کہ اس ایک سو سال میں مزید تاریخی تحقیق اور اثری انکشافات کیا کیا نتائج سامنے لائے ہیں تو آپ حیران ہوں گے کہ ان مزید تحقیقات و انکشافات نے نہ صرف سابقہ نتائج پر اضافہ ہی کیا ہے بلکہ ان کی روشنی میں ان میں بہت سا رد و بدل بھی کرنا پڑا ہے۔ مصر، شام، عراق، فلسطین وغیرہ میں ان اثری انکشافات کی ابتدا ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس مختصر سے عرصہ میں ہی اتنا کچھ زمین سے اُبھر اُبھر کر سامنے آگیا ہے جس نے تاریخی تحقیقات کا رُخ بدل دیا ہے۔ کلدانیوں کے شہر اُر کے متعلق آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں میں ایسے ایسے انکشافات سامنے آئے ہیں جن سے

حضرت ابراہیمؑ کے کوائفِ حیات پر ایک نئے تاریخی زاویہ سے روشنی پڑتی ہے حالانکہ اس سے بیشتر خود مغرب کے تاریخی محققین میں ایسے لوگ بھی تھے جو حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کو افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے تھے۔ تل دویر کی کھدائیوں میں قدیم عبرانی زبان کے ایسے خطوط ملے ہیں جن سے بنی اسرائیل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ مصر کے تہ خانوں اور قدیم یہودی صومعوں کی کھدائی سے عجیب و غریب دفائن منصّۂ شہود پر آتے ہیں۔ الفنٹائن کے حفریات میں ارامی زبان کے بہت سے قدیمی ریکارڈ ملے ہیں جو خاص تاریخی اہمیت رکھتے ہیں[1]۔ ابھی ان اثری انکشافات کی ابتدا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جب یہ سلسلہ آگے بڑھے گا تو زمین اپنے سینہ کے کیسے کیسے رازہائے سربستہ اگل کر رکھ دے گی۔ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ (۴-۵/۹۹)۔ انہی امور کے پیشِ نظر تاریخِ یہود کا مشہور عالم 'CECIL ROTH' اپنی کتاب 'A Short history of the Jewish People' میں ان نقادانِ عہدِ حاضر کی تنقید پر بحث کرتا ہوا جو بائبل کے روایتی بیانات کو تاریخی حیثیت سے قابلِ اعتماد قرار نہیں دیتے، لکھتا ہے۔

> عام عقائد کے برعکس، یہ ناقدانہ مسلک بھی تو کسی صورت میں منزہ عن الخطا نہیں۔ اس کے نتائج تو نسلاً بعد نسلٍ بلکہ ہر سال بدلتے رہتے ہیں۔ اگرچہ تخریبی تنقید بہت دوررس ہوتی ہے، لیکن ابھی تک (ازمنۂ گذشتہ کے واقعات کے متعلق) یہ بھی کوئی ایسا بیان نہیں دے سکی جسے ساری دنیا تسلیم کر لے۔ عہدِ حاضر کے مؤرخین کی اکثریت تاریخی ماخذ کے متعلق نہایت غیر مؤثر مباحث میں اُلجھی رہتی ہے۔ دوسری طرف گذشتہ صدی کے انقلابی مسلک کے خلاف نہایت واضح ردِ عمل شروع ہو چکا ہے۔ ان کے تنقیدی تجزیہ کی کمزوریاں بے نقاب کی جا رہی ہیں۔ مصریات اور متعلقہ علوم بتا رہے ہیں کہ بائبل کے بیانات کم از کم اس زمانہ کے حالات سے مطابقت رکھتے ہیں جس سے وہ واقعات متعلق ہیں۔ نیز اثری انکشافات، روایتی بیانات کے حدود و خطوط[2] کی تائید کر رہے ہیں۔ (صفحہ ۱۱)

---

[1] (DEAD SEA) کے (SCROLLS) نے جو حال ہی میں ملے ہیں، یہودیت اور عیسائیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

[2] چونکہ بائبل میں بہت سی تحریف ہو چکی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اثری انکشافات (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے)

اور ابھی اثری انکشافات کا فن بھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے' اس لئے جو کچھ زمین سے برآمد ہوتا ہے اس کا صحیح مفہوم اخذ کرنے کے لئے بھی بہت سے قیاسات سے مدد لینی پڑتی ہے. جب رفتہ رفتہ (مزید علمی تحقیقات سے) یہ قیاسات یقینیات میں تبدیل ہوں گے تو موجودہ نتائج میں بھی تبدیلیاں واقع ہوں گی. اسی بنا پر 'CECIL ROTH' دوسرے مقام پر لکھتا ہے.

> بعض نقاد یہ بھی کہتے ہیں کہ (حضرت) موسٰے کے حالات کے متعلق کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی. ایسا باور کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہم یہ مان لیں کہ یہ ٹھیکریاں (جو آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں سے برآمد ہو رہی ہیں) کسی قوم کے حافظہ یا ازمنۂ قدیمہ کے تحریری ریکارڈ سے زیادہ قابلِ اعتماد اور اہم ہیں۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ کسی زمانہ میں یہ دعویٰ کرنا کہ تاریخی تحقیقات اس قدر مکمل اور یقینی ہو چکی ہیں کہ ان پر نہ کسی اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ رد و بدل کا امکان' حقیقت کے خلاف ہے. اس لئے یہ کہنا کہ جو چیز ہمارے زمانہ کے تاریخی نتائج کے خلاف ہے یا تاریخ سے اس کی تائید میں شہادت نہیں ملتی' وہ غلط اور ناقابلِ تسلیم ہے' ایک ایسا اعتراض ہے جو علم کے بازار میں کوئی قیمت نہیں رکھتا. قرآنِ کریم کے جن تاریخی مقامات کو مغربی مستشرقین محلِ نظر قرار دیتے ہیں' وہ عام طور پر انبیائے بنی اسرائیل سے متعلق ہوتے ہیں. یہودیوں کی قدیمی تاریخ کے متعلق یورپ میں بہت کچھ چھان بین ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود ابھی حالت یہ ہے کہ ان کی تاریخ کے اکثر مقامات تاریکی کے پردہ میں چھپے ہیں' مثلاً 'CECIL ROTH' اپنی تاریخ میں اکثر مقامات پر لکھتا ہے کہ :

"اس کے بعد آیندہ سالوں کی داخلی تاریخ کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے." (صفحہ ۵۴) یا

"یہودیوں کی اس عہد کی تاریخ کے متعلق ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا." (صفحہ ۵۶) وقس علیٰ ہذا.

لہٰذا قرآنِ کریم کے متعلق صحیح مسلک یہ ہے کہ آپ سب سے پہلے اس کی تعلیم کو دیکھئے جس کی رُو سے یہ انسان کی انفرادی خودی کی تکمیل اور اس کے نظامِ اجتماعیہ کی تدوین کرتا ہے. غور و فکر کے بعد

(بقیہ فٹ نوٹ گذشتہ صفحہ سے) اس کی جزئیات کی تائید نہ کریں' محض موٹے موٹے واقعات کی طرف اشارہ کریں. لیکن قرآنِ کریم ہر طرح تحریف سے پاک ہے اس لئے اس کا حرف حرف سراپا علم و یقین ہے.

یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ یہ تعلیم کسی انسان کے غور و تدبر کا نتیجہ نہیں بلکہ منزل من اللہ ہے۔ اس ایمان کے ساتھ آگے بڑھتے۔ اب رہا وہ حصہ جس کا تعلق مختلف علوم سے ہے، سوان میں سے آپ کے زمانہ تک کی علمی تحقیق جن چیزوں کی تائید نہیں کر سکی، اس کے لئے انتظار کیجئے تا آنکہ مستقبل کی مزید تحقیق ان پیچ در پیچ گرہوں کو کھول دے۔ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (۴۱/۵۳)

اس مقام پر بعض حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ تاریخ کے متعلق یہ اندازِ نگاہ تو بڑا غیر علمی (unscientific) ہے کہ اُس بات کو صحیح اور یقینی سمجھا جائے جو قرآن کے مطابق ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عام علمی دنیا میں کسی تاریخی بیان یا انکشاف کی صحت وسقم کے پرکھنے کے معیار بھی عام علمی ہی ہو سکتے ہیں لیکن جب ہم قرآن کے متعلق یہ ایمان رکھیں کہ یہ اُس خدائے علیم وخبیر کی طرف سے نازل ہوا ہے جس کے علم سے کوئی شے پوشیدہ نہیں، تو اس کے بعد تاریخی بیانات وانکشافات کی حیثیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اس وقت قرآن ایک یقینی کسوٹی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس پر ظن وقیاس کا ہر مفروضہ پرکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ حمورابی کے قوانین کے متعلق ہماری تاریخ میں مختلف باتیں آتی ہیں۔ اگر کہیں ایسا ہو جائے کہ حمورابی کے یہ تمام قوانین کسی چٹان پر کندہ مل جائیں تو یہ چیز تاریخ کے تمام بیانات کے لئے یقینی معیار قرار پا جائیگی۔ ہمارے نزدیک قرآن حقائق ومعارف کی ایک محکم اور یقینی چٹان ہے جو تمام قیاس اور ظنی بیانات کے لئے معیارِ صداقت کا کام دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کو ایسا نہیں مانتے تو ان سے ہم یہ کہیں گے کہ آپ یہ بتائیے کہ اس وقت تک جن انکشافات نے یقینیات کا درجہ حاصل کر لیا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی ہے جو قرآن کے بیان کے خلاف جاتی ہو؟ سو جب اس وقت تک کے ہمارے تجربات قرآن کی صداقت کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں تو جو امور ابھی یقینیات کے درجے تک نہیں پہنچے ان کے متعلق ہمیں ایسا باور کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ جب وہ یقینی درجہ حاصل کریں گے تو وہ بھی قرآن کی صداقت کی شہادت بہم پہنچائیں گے۔ یہ اندازِ نگاہ عین علمی ہے۔ اس مقام پر ہم چاہتے تھے کہ ان مغربی معترضین کے سامنے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے احوال وکوائف بطور مثال پیش کر کے انہیں بتاتے کہ جن واقعات کو آپ یقینی قرار دے کر قرآنی تصریحات کو خلافِ حقیقت کہا کرتے تھے، خود آپ کے ہاں کی مزید تاریخی تحقیق نے انہیں کو نہ صرف مشکوک بلکہ وضعی قرار دے دیا ہے۔ لیکن چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ حیات کے متعلق ہماری مستقل تصنیف الگ سامنے آ رہی ہے، جہاں ہم نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے، اس لئے ہم اس مقام پر تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ جو حضرات ان تفاصیل سے

دل چسپی رکھتے ہوں؛ وہ اس کتاب (شعلۂ مستور) کو ایک نظر دیکھ لیں۔ اس مقام پر ہم صرف دو کتابوں کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں جو اس موضوع پر حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ ایک ہے MARCELLO CRAVERI کی کتاب 'THE LIFE OF JESSUS' اور دوسری ہے 'DR: H.J. SCHONFIELD کی تصنیف THE PASSOVER PLOT آپ دیکھئے کہ ان کی تحقیق نے اس دور کی تاریخ کے کتنے (مزعومہ) یقینیات کو خرافات ثابت کر دیا ہے۔ ہمارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کے جو واقعات ہنوز علمی تحقیق کے چھلنے میں چھانے جا رہے ہوں، انہیں ثابت شدہ حقائق تصور کر کے، قرآنی تنقید کا معیار قرار دینا، علمی طرزِ تحقیق نہیں۔ ہمارا دعوے ہے کہ تاریخ کے جو واقعات علمی معیار کے مطابق ثابت شدہ قرار پا چکے ہیں ان میں سے کوئی بھی اصلاً اور اساساً قرآنی بیانات کی تغلیط نہیں کرتا — اور نہ ہی ایسا کر سکے گا۔

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ (۱۸/۹۵)

ذُو القرنین

در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خدا اندیش زی!

ذوالقرنین

داستانِ بنی اسرائیل کے آخری باب تک پہنچنے سے پیشتر ایک ہستی کا تذکرہ سامنے لانا ضروری معلوم ہوتا ہے جو خدا کا رسول نہیں، لیکن چونکہ وہ ایک نیک بندہ ہے اور اس نے یہودیوں کی مظلومیت کے دَور میں ہیکلِ سلیمانی کی بازیابی اور تعمیرِ نَو میں مدد کی تھی' اس لئے قرآنِ کریم نے اس احسان کے بدلے میں اسے اپنی ابدیت کے آغوش میں جگہ دیدی ہے. یہاں پھر قرآنِ کریم کے سحابِ رحمت کی حدود فراموش وسعتوں کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ وہ محض اس بنا پر کہ اس نے مظلوموں کی حمایت کی ہے' ایک "غیر" کو کس طرح "اپنوں" کی صف میں کھینچ لاتا ہے. غیر اور اپنے کا یہ فرق ہم نے دنیاوی نقطۂ نگاہ سے لکھا ہے' ورنہ قرآن کے ہاں تو جیسا کہ ہم شروع سے دیکھتے چلے آرہے ہیں' اس باب میں معیار ہی جداگانہ ہے!

ذوالقرنین کون تھا؟

اس شخص کا لقب ہے ذوالقرنین (دو سینگوں والا).

ذوالقرنین سے کون مراد ہے؟ یہ سوال ایک زمانہ دراز سے مؤرخین اور مفسرین کی ذہنی کاوشوں کا محور اور ان کی قیاس آرائیوں اور نکات آفرینیوں کا مرکز بنا رہا ہے لیکن زمانۂ حال کے اثری مکتشفین کی سعی و کاوش سے کچھ ایسے نقوش اُبھر کر سامنے آئے ہیں جن سے بعض قیاسات یقینیات کی طرف رُخ کئے نظر آرہے ہیں اور ان کا اندازہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جو تفاصیل و خصوصیات ذوالقرنین کی طرف منسوب کی ہیں ان کا صحیح انتساب ایران کے اس شاہنشاہ کی طرف کیا جا سکتا ہے' جسے یونانی مؤرخ سائرس' یہودی خورس اور عرب کیخسرو کے نام سے پکارتے ہیں لیکن اتنی تحقیق و کاوش کے باوجود' یہ قیاس ابھی حقیقت کی صورت اختیار نہیں کر سکا. ہو سکتا ہے کہ مزید اثری مکتشافات ان مدفون حقیقتوں سے مٹی کے اور تودے اٹھائیں اور وہ صورتیں جو قرنہا قرن سے

خاک میں پنہاں چلی آرہی ہیں اور جنہیں کہیں کہیں شاعر کی چشمِ تصور "لالہ و گل" کی صورت میں متشکل دیکھ لیتی ہے[1]۔ بےنقاب ہو کر سامنے آجائیں۔ بہرحال اس وقت تک قیاسات کا رُخ اسی سمت جا رہا ہے کہ ذوالقرنین سے مراد ایران کا کیخسرو ہی ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کے لئے قیامتِ صغریٰ تھا۔ بخت نصر کی وحشت و بربریت نے نہ صرف یروشلم کو تباہ و برباد اور اس کے مقدس ہیکل کو منہدم کیا بلکہ وہ یہودیوں کے بقیۃ السیف کو بابل کی طرف ہانک کر لے گیا جس طرح قصاب بکریوں کو مذبح کی طرف لے جاتا ہے۔ تورات میں مختلف انبیاء کے ان صحیفوں کو دیکھئے جن میں یہودیوں کی اس زہرہ گداز مصیبت کی داستان بیان کی گئی ہے

دانیال نبی کا خواب

دل کا خون آنکھ میں کھنچ آتا ہے۔ لیکن عین اس انتہائی مایوسی اور اندوہناک تاریکی کے زمانہ میں ان میں سے بعض انبیاء[2] کو اُمید کی کرن بھی دکھادی جاتی ہے اور انہیں بتادیا جاتا ہے کہ یہ مصیبت ابدی نہیں۔ اس کا خاتمہ ہوگا اور یہودی پھر اپنے مرکز کی طرف لوٹیں گے۔ دانیال نبی کی کتاب میں ایک خواب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

> بیلشضر بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال میں مجھے ہاں مجھ دانی ایل کو ایک رویا نظر آئی بعد اس کے جو شروع میں مجھے نظر آئی تھی اور میں نے عالمِ رویا میں دیکھا اور جس وقت میں نے دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ میں سوسن کے قصر میں تھا جو صوبہ عیلام میں ہے۔ پھر میں نے رویا کے عالم میں دیکھا کہ میں اولائی کی ندی کے کنارے ہوں۔ تب میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کے نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ تھے اور وہ دو سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا۔ اور بڑا دوسرے کے پیچھے اٹھا۔ میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ پچھم اتر دکھن کی طرف سینگ مارتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہوسکا۔ نہ کوئی اس کے ہاتھ سے چھڑا سکا۔ پر وہ جو چاہتا تھا سو کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہوگیا اور میں اس سوچ میں تھا کہ

---

[1]
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں — غالبؔ

[2] یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ یہودیوں کے لٹریچر میں "نبی" ہیکل کے ایک معزز منصب دار کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن اگر کسی نبی کو منجانب اللہ غیب کا علم عطا کیا گیا ہو تو وہ قرآنی اصطلاح میں نبی ہوگا۔

ایک بکرا پچھم کی طرف سے آ کے تمام روئے زمین پر ایسا پھرا کہ زمین کو بھی نہ چھوا اور اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ ایک عجیب طرح کا سینگ تھا اور وہ اس دو سینگ والے مینڈھے کے پاس، جسے میں نے ندی کے سامنے کھڑا دیکھا آیا اور اپنے زور کے قہر سے اس پر دوڑ گیا۔ اور میں نے اسے دیکھا کہ وہ مینڈھے کے قریب پہنچا اور اس کا غضب اس پر بھڑکا اور مینڈھے کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا سامنا کرے۔ سو اس نے اسے زمین پر پٹک دیا اور اسے لتاڑا۔ اور کوئی نہ تھا کہ مینڈھے کو اس کے ہاتھ سے چھڑا سکے۔ اور وہ بکرا نہایت بزرگ ہوا اور جب وہ پُر زور ہوا تب اس کا بڑا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار نادر سینگ آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے۔ (دانی ایل نبی کی کتاب ۱–۸/۸)

اس کے بعد اس خواب کی تعبیر ان الفاظ میں بیان ہوئی۔

اور ایسا ہوا کہ جب میں، دانی ایل نے یہ رویا دیکھا تھا اور اس کی تعبیر کی تلاش کرتا تھا تو دیکھو میرے سامنے کوئی کھڑا تھا جس کی صورت آدمی کی سی تھی۔ اور میں نے ایک آدمی کی آواز سنی کہ اولائی کے درمیان پکار کے کہا کہ اے جبرئیل اس شخص کو اس رویا کے معنی سمجھا۔ چنانچہ وہ اُدھر جہاں میں کھڑا تھا نزدیک آیا اور جب پہنچا میں ڈر گیا اور اوندھے مُنہ گر پڑا۔ اس نے مجھے کہا:۔

اے آدم زاد! سمجھ لے کیونکہ رویا آخری زمانے میں انجام ہوگا۔ اور جب وہ مجھ سے کہہ رہا تھا، میں اوندھے مُنہ بھاری نیند میں زمین پر پڑا تھا۔ تب اس نے مجھے چھوا اور سیدھا کیا اور کہا دیکھ! میں تجھے سمجھاؤں گا کہ قہر کے آخر میں کیا ہوگا کیونکہ یہ امر آخری مقررہ وقت پر تمامی ہوگی۔ وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں، سو مادی اور فارس کے بادشاہ ہیں اور وہ بال والا بکرا یونان کا بادشاہ ہے اور وہ بڑا سینگ جو اس کی آنکھوں کے درمیان ہے سو اس کا پہلا بادشاہ ہے۔ اور چونکہ اس کے ٹوٹ جانے کے بعد اس کی جگہ میں چار اور نکلے سو یہ چار سلطنتیں ہیں جو اس کی قوم میں قائم ہوں گی۔ لیکن اُن کا اقتدار اس کا سا نہ ہوگا۔ (دانی ایل نبی کی کتاب ۱۵–۸/۲۲)

اس خواب میں آگے چل کر یہ بشارت دی گئی ہے کہ بابل کے قید و محن کی زندگی سے یہودیوں کی نجات فارس کے بادشاہ کے ہاتھوں ہونے والی ہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران کی مملکت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی، جنوبی حصہ میں فارس اور شمالی حصہ

سائرس میں میڈیا (مادیا) کی سلطنت. ۵۶۰ ق م کے قریب وہاں سائرس نامی ایک بادشاہ ہوا. اس نے فارس اور میڈیا کی دونوں مملکتوں کو ایک کر کے ایران کی وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

تخت نشینی کے بعد اُسے لیڈیا (ایشیائے کوچک کے شمالی اور مغربی حصہ) کے فرمانروا کے خلاف جنگ کرنی پڑی جس نے اس کے ملک پر حملہ کر دیا تھا. جنگ میں سائرس کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی. لیکن اس نے بجائے قتل و غارت گری اور سلب و نہب کے تمام ملک میں امن و سلامتی کا سکہ رواں کر دیا. اس کے بعد اسے مشرق کی جانب مکران اور بلخ کے وحشی قبائل کی سرکوبی کرنی پڑی. اسی زمانہ میں بابل کے باشندوں نے اس کے حضور درخواست گزرانی کہ وہ انہیں وہاں کے مستبد حکمران (شازاد) کے جور و ظلم سے نجات دلائے. اس زمانہ میں بابل کے سے مستحکم قلعہ کا فتح کرنا کچھ آسان کام نہ تھا. لیکن سائرس ان مظلوموں کی فریاد رسی کے لئے اٹھا اور فتح و نصرت نے اس کے پاؤں چوم لیے. سائرس نے بابل پہنچ کر دانیال نبی کی بڑی تعظیم و تکریم کی. یہودیوں کو اجازت دیدی کہ وہ پھر یروشلم کو آباد کریں اور اپنی امداد سے ہیکل کی تعمیر جدید بھی شروع کرا دی. عزرا کی کتاب میں ہے:۔

> اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے مُنہ سے نکلا تھا پورا ہوا. خداوند نے شاہِ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا. شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لئے ایک مسکن بناؤں. پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان جو کوئی ہو اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو یہوداہ میں ہے، جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے (کہ وہی خدا ہے) جو یروشلم میں ہے. اور ہر ایک جو باقی رہا ہو ان سب مقاموں سے جہاں کہیں وہ پردیسی ہوا ہو سو اس مقام کے لوگ سونے چاندی سے اور مال مواشی سے اس کی مدد کریں اور اس کے سوا وہ خدا کے گھر کے لئے جو یروشلم میں ہے، اپنے جی کی خواہش سے ہدیئے گذرانیں. (عزرا کی کتاب ۱—۱/۴)

عزرا کاہن کی کتاب کے علاوہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں بھی خورس کا نام آتا ہے. حالانکہ ان کا زمانہ فتح بابل سے قریب ڈیڑھ سو برس پیشتر کا ہے. اس میں لکھتا ہے.

> جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پورے کرے گا. اور

یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی.

(یسعیاہ ۴۴/۲۸ ; ۲.۱/۴۵)

اگر ان روایات کی صحت کو بہ نظرِ اشتباہ بھی دیکھا جائے تو بھی یہ حقیقت واضح ہے کہ خود یہودیوں کے دل میں خورس کی کس قدر عزت و تعظیم تھی۔ یہ تھا وہ احسان جس کے صلہ میں خورس کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ قرآن میں اس کا تذکرہ ایسے انداز میں درج کیا گیا۔ ویسے بھی اس کی معدلت گستری اور غربا پروری، خداترسی اور نیک کرداری ایسی تھی کہ اُسے عزت کا مقام عطا کیا جاتا۔

لیڈیا اور بابل کے بعد، خورس کے جیوش و عساکر کا قدم ایران سے مشرق کی جانب بعض خانہ بدوش وحشی قبائل کی سرکوبی کے سلسلہ میں اٹھا. اس کے بعد جھیل کاسپین (بحیرۂ خزر) کے کنارے (یا کاکیشیا کے دامن میں) بسنے والی ایک قوم نے "یاجوج و ماجوج" کے حملوں اور ان کی تاخت و تاراج کی شکایت خورس تک پہنچائی. اُس نے اِس سیلابِ بلا کو روکنے کے لئے پہاڑ کے اس درّہ میں ایک دیوار بنا دی جس کی راہ سے یہ وحشی قبائل ان اقوام پر حملہ آور ہوا کرتے تھے.

سائرس کا انتقال ۵۲۰ ق م میں ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا کیقباد تخت نشین ہوا. کہا یہ جاتا ہے کہ سائرس دینِ زردشتی کا متبع بلکہ بہت بڑا مبلغ تھا. اس کی نیک سیرتی اور خوش اطواری کے تذکروں سے تاریخ کا دامن بھرا پڑا ہے. اور تو اور، خود یونانی مورّخ، جن کی نہ صرف مملکت (لیڈیا) بلکہ تہذیب و تمدن اس کے ہاتھوں تباہ و ویران ہوئے تھے، اس کی خوبیوں کے معترف ہیں. گذشتہ صدی عیسوی کے وسط میں اصطخر کے مقام پر سائرس کا ایک سنگی مجسمہ برآمد ہوا ہے جس کے دو بازو عقاب کی طرح ہیں اور سر پر مینڈھے کے سے دو سینگ ہیں جن کے متعلق گمانِ غالب ہے کہ فارس اور مادیا کی سلطنتوں کے یکجا ہونے کی طرف اشارہ ہے. اس پس منظر کے بعد اب قرآنِ کریم کی تصریحات کی طرف آئیے.

ذوالقرنین

قرآنِ کریم میں ذوالقرنین کا ذکر سورۂ کہف میں آتا ہے جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے.

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ (۱۸/۸۳)

(اے پیغمبر!) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں. تم کہہ دو. میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلام

الٰہی میں، پڑھ کر سنا دیتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ استفسار یہودیوں کی طرف سے ہوا ہوگا کیونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، یہی وہ غیر اسرائیلی ہے جس کی عظمت و عقیدت یہودیوں کے دل میں جاگزیں تھی۔ اب قرآن کریم کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے!

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا ۙ (۱۸/۸۴)

ہم نے اسے زمین میں حکمرانی دی تھی۔ نیز اس کے لئے ہر طرح کا سازو سامان مہیا کر دیا تھا۔

اب اس کے بعد پہلی مہم کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ فرمایا۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ (۱۸/۸۵)

تو (دیکھو) اس نے (پہلے) ایک (مہم کے لئے) سازو سامان کیا اور مہم کی طرف نکل کھڑا ہوا۔

مغربی مہم یہ مہم جانبِ مغرب (یعنی لیڈیا کی طرف) تھی۔ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ لیڈیا کا علاقہ ایشیائے کوچک کے شمال مغرب میں واقع تھا جہاں سے آگے بڑھنے پر سمندر آجاتا ہے۔ وہ ساحلِ سمندر تک جا پہنچا۔ اب اس کے آگے خشکی کا راستہ نہیں تھا اس لئے وہ وہیں رُک گیا۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِىْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝ (۱۸/۸۶)

یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا۔ وہاں اُسے سورج ایسا دکھائی دیا، جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہو اور اس کے قریب ایک گروہ کو بھی آباد پایا (جس نے حق کی مخالفت کی تھی)۔ ہم نے کہا "اے ذوالقرنین! (اب یہ لوگ تیرے اختیار میں ہیں) تو چاہے انہیں عذاب میں ڈالے چاہے سلوک کرکے اپنا بنالے۔"

غالباً بحیرۂ اَسود کا کنارہ تھا جہاں کھڑے ہو کر اس نے دیکھا کہ سورج (گویا) سمندر کے اندر ڈوب رہا ہے ساحلِ سمندر پر کھڑے ہونے سے ایسا ہی منظر دکھائی دیا کرتا ہے۔ اس نے وہاں کی آبادی کو بھی زیرِ تسخیر کرلیا۔ اب اگر اس کی فتوحات چنگیز و ہلاکو کی سی ظلم و ستم کی خوفناک آندھیاں ہوتیں تو وہ اس علاقہ کو آگ اور خون کا جہنم بنا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ عدل و احسان سے کام لیا اور حکم دیا کہ

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ

عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى
وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝ (۸۷ــ ۸۸/ ۱۸)

ذوالقرنین نے کہا "ہم ناانصافی کرنے والے نہیں۔ (جو پہلے ہوچکا سو چکا۔ اب) جو سرکشی کرے گا، اسے ضرور سزا دیں گے، پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلے بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لئے آسانی و راحت ہو۔"

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ (آیت ۱۸/۸۶) سے بعض لوگوں کا خیال اس طرف گیا ہے کہ ذوالقرنین صاحبِ وحی تھے (اور اس لئے خدا کے رسول) لیکن قرآن نے اس کی تصریح نہیں کی اور محض قلنا سے رسالت پر استشہاد بہت دُور کی تاویل ہے۔ اس اندازِ بیان سے مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فاتح کو یہ اختیار دے رکھا ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو بہ تقاضائے عدل، مغلوب دشمن کو سزا دے اور چاہے، بہ طریقِ احسان، ان سے حسنِ سلوک روا رکھے۔ ان میں سے وہ جو راستہ بھی اختیار کرنا چاہے، خدا کی طرف سے اس پر گرفت نہیں ہوتی۔ البتہ احسان کا طریق اختیار کرنے سے، اس کا خیر کا پلڑا جھک جاتا ہے۔ قلنا سے انسان کے اسی اختیار و ارادہ کی استعداد کی طرف اشارہ ہے۔

مشرقی مہم اس کے بعد اس کی مشرقی مہم کا ذکر ہے۔ بکٹریا یعنی بلخ کے علاقہ میں جو ایران سے مشرق کی جانب واقع ہے، وحشی قبائل نے اودھم مچا رکھا تھا۔ یہ مہم ان کی اصلاح کی خاطر اختیار کی گئی۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ
عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ (۸۹ــ ۹۰/ ۱۸)

اُس کے بعد پھر اس نے تیاری کی اور (پورب کی طرف) نکلا۔ یہاں تک کہ مشرقِ اقصیٰ تک پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ایک قوم کو دیکھا جو چٹیل میدان میں رہتی تھی اور دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان انہوں نے نہیں کر رکھا تھا۔

یعنی وہ قوم جو کھلے میدانوں میں رہتی تھی اور اس نے شہری زندگی (تمازتِ آفتاب سے چھپ کر مکانات میں رہنے کی زندگی) اختیار نہیں کی تھی۔

اور شمالی مہم اب اس کے بعد اس کی شمالی مہم کا ذکر آتا ہے جب اُس نے کاکیشیا کے پہاڑوں کی طرف رُخ کیا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ (۱۸/۹۳)

یہاں تک کہ وہ ایک وادی میں پہنچا جس کے دونوں طرف اونچے اونچے پہاڑ دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔ وہاں اس نے دیکھا، پہاڑوں کے اُس طرف ایک قوم آباد ہے جس سے بات کہی جائے تو بالکل نہیں سمجھتی۔

یہ علاقہ یوں سمجھئے کہ آرمینیا اور آذربائیجان کے پہاڑوں میں گھرا ہوا خطہ تھا جہاں کی آبادی اہلِ ایران کی زبان سے بالکل ناواقف تھی۔ اس قوم نے اس سیلابِ بے پناہ کے خلاف فریاد کی جو ہر سال پہاڑ کے درہ میں سے اُمنڈ آتا تھا اور انسانی جان و مال کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا تھا۔ ان حملہ آور وحشی قبائل کا نام یاجوج و ماجوج تھا (تفصیل ان کی باب زیرِ نظر کے اخیر میں آئے گی)۔ یہی وہ وحشی قبائل تھے جن کی طوفان انگیزیوں سے بچنے کے لئے اہلِ چین نے وہ دیوار تعمیر کی جس کا شمار آج دنیا کے نوادرات میں ہوتا ہے۔ اس علاقہ کی آبادی نے بھی یہی تجویز کیا کہ پہاڑ کے اس درہ کو پاٹ دیا جائے جس سے یہ طوفان امنڈ آتا ہے۔

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ (۱۸/۹۴)

اس قوم نے کہا "اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آکر لوٹ مار کرتے ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لئے کچھ خراج مقرر کر دیں"۔

دیکھئے! اس قوم نے یہ کہا کہ اگر آپ ہمارے لئے اتنا کر دیں تو ہم آپ کے باجگذار بن جائیں گے اور خراج ادا کرتے رہیں گے۔ چونکہ یہ قوم مظلوم تھی ذوالقرنین نے ان کی حمایت اور امداد کے معاوضہ میں اُن سے کچھ وصول کرنا نہیں چاہا اور کہا۔

قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۙ ۝ (۱۸/۹۵)

ذوالقرنین نے کہا "میرے پروردگار نے جو کچھ مجھے دے رکھا ہے، وہی میرے لئے بہتر ہے۔ (تمہارے خراج کا محتاج نہیں) مگر تم اپنی قوت سے (اس کام میں) میری مدد کرو۔ میں تمہارے اور یاجوج اور ماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کردوں گا۔

اب یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآنِ کریم نے اس "بادشاہ" کا ذکر اس خصوصیت سے کیوں کیا ہے! اس کے بعد

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ؕ (۱۸/۹۶)

(اس کے بعد اُس نے حکم دیا) "لوہے کی سلیں میرے لئے مہیا کردو۔" پھر جب (تمام سامان مہیا ہوگیا اور) دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کردی، تو حکم دیا۔ (بھٹیاں سلگاؤ اور) اسے دھونکو۔ پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بالکل آگ (کی طرح لال) ہوگئی، تو کہا "گلا ہوا تانبہ لاؤ اُس پر انڈیل دیں۔"

چنانچہ دیوار تیار ہوگئی، اور ایسی دیوار کہ

سدِّ ذوالقرنین

فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ (۱۸/۹۷)

چنانچہ (اس طرح) ایک ایسی سد بن گئی کہ (یاجوج اور ماجوج) نہ تو اس پر چڑھ سکتے تھے، نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے!

جب یہ عظیم الشان کام مکمل ہوگیا تو ذوالقرنین اپنے خدا کے حضور زمین بوس ہوا اور سجدۂ شکرانہ بجا لایا کہ اس کے فضل و کرم سے ایسا اہم کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ؕ ۝ (۱۸/۹۸)

ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا "یہ (جو کچھ ہوا) میرے پروردگار کی مہربانی سے ہوا ہے۔ جب میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات ظہور میں آئے گی، تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کردے گا (مگر اس سے پہلے کوئی اُسے ڈھا نہیں سکتا) اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے، ٹلنے والی نہیں!"

اس کے بعد ہے۔

وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۙ وَّ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۙ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَ كَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۚ

(۱۸/۱۰۱۔۔۔۹۹)

اور جس دن وہ بات ظہور میں آئے گی تو اس دن ہم ایسا کریں گے کہ (سمندر کی لہروں کی طرح ان قوموں میں سے) ایک (قوم) دوسری (قوم) کے درمیان بہنے لگے گی اور نرسنگھا پھونکا جائے گا اور ساری قوموں کی بھیڑ اکٹھی ہو جائے گی!

اس دن ہم منکروں کے سامنے دوزخ اس طرح نمودار کردیں گے جیسے ایک چیز بالکل سامنے دکھائی دے۔ وہ منکر جن کی نگاہوں پر ہمارے ذکر کی طرف سے پردہ پڑ گیا تھا اور (کانوں میں ایسی گرانی کہ) کوئی بات نہیں سُن سکتے تھے۔

ذوالقرنین نے آیت (۱۸/۹۸) میں کہا تھا کہ یہ دیوار ایسی مضبوط بن گئی ہے کہ اسے کوئی گرا نہیں سکے گا۔ لیکن اگر خدا کے قانونِ فطرت کی طرف سے کوئی ایسی بات سرزد ہو، (مثلاً زلزلہ آجائے یا سیلاب) تو اسے یہ دیوار روک نہیں سکے گی۔ اس کے بعد قرآن کا اضافہ ہے کہ ذوالقرنین نے ٹھیک کہا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب اس قسم کے بین الاقوامی موانعات کچھ حقیقت نہیں رکھیں گے۔ اس وقت قومیں سمندر کی تلاطم انگیز موجوں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں گی اور اس قسم کی دیواریں ان کی یورش کے راستے میں حائل نہیں ہو سکینگی۔ اس وقت جنگ کے بگل بجیں گے اور تمام قومیں جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کے مقابلہ کے لئے جمع ہو جائیں گی۔ اس وقت جہنم کی تباہیاں ان لوگوں کے سامنے بے نقاب ہو کر آجائیں گی۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کا یہ بیان کس طرح حرفاً حرفاً پورا ہو کر رہا ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کی رکاوٹوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔

ذوالقرنین کی سرگذشت قرآنِ کریم میں اتنی ہی مذکور ہے۔ اس بحث میں اُلجھے بغیر کہ اس سے بالتحقیق کونسی شخصیت مراد ہے، اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے ایک جہاندار و جہاں آرا کے لئے کن خصوصیات کو

مستحسن قرار دیا ہے. سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ تمکن فی الارض اور اسباب و ذرائع کا مہیا ہونا اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے، وہی تمکن فی الارض جسے تذکرہ حضرت یوسفؑ میں ہم دیکھ چکے ہیں.

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۚ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ○ (۱۲/۵۶)

اور (دیکھو) اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کے قدم جما دیئے کہ جس جگہ سے چاہے، حسب مرضی کام لے جو چاہتا ہے اسے (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیضیاب کر دیتے ہیں اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے.

وہی ساز و سامان جس کے تذکرے حضرت داؤد و سلیمان علیہما السّلام کے کوائفِ حیات میں وجہ شادابیِ قلب و نظر بن چکے ہیں تمکن فی الارض اور قوت و شوکت کے سامان انعاماتِ خداوندی ہیں جن سے محرومی کسی قوم کی انتہائی بدبختی اور خدا کا رسواکُن عذاب ہے. اسی تمکن فی الارض کو اللہ تعالیٰ نے جماعتِ مومنین کے لئے سب سے بڑا انعام قرار دیا ہے.

اَلَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ○ (۲۲/۴۱)

یہ (مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحبِ اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے، سامانِ نشو و نما بہیا کرنے میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے برائیاں روکیں گے اور تمام امور کے فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے.

پھر جیسا کہ اس آیہ جلیلہ میں بتایا گیا ہے، اس تمکن فی الارض سے مقصود تغلب و استبداد نہیں بلکہ قوانین الٰہیہ کی تنفیذ و ترویج ہے جو یکسر عدل و انصاف پر مبنی ہے. یہی وہ عدل و انصاف ہے جسے ذوالقرنین نے اس وقت اختیار کیا جب اللہ نے اسے لیڈیا کی سرزمین پر تسلط عطا فرمایا. پھر آگے بڑھئے. اس تمکن فی الارض کا سب سے اہم مقصد دنیا سے فساد مٹانا ہے. یاد رکھئے قوانینِ الٰہیہ کا مقصد اصلاح ہے، یعنی انسانی صلاحیتوں کی ایسی پرورش اور نشو و ارتقاء (زکوٰۃ) جس سے یہ اپنے معراج تک جا پہنچیں. برعکس اس کے طاغوتی نظام کا نتیجہ (بلکہ یوں سمجھئے کہ خود یہ نظام) فساد ہوتا ہے جس کی تعریف (definition) اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اصلاح کی بالکل ضد ہوتا ہے. آیت (۱۸/۹۴) میں اس قوم نے یاجوج و ماجوج کے متعلق یہی کہا تھا

کہ وہ مُفسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ہیں۔ چونکہ فساد فی الارض کا استیصال، ہر اس قوم کا فریضہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمکن عطا فرمایا ہو، اس لئے وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں کسی صلہ اور معاوضہ کی خواہاں اور متمنی نہیں ہو سکتی۔ وہ اسے فرض سمجھ کر سرانجام دیتی ہے اور جس کام کو اپنا فرض سمجھ کر ادا کیا جائے اس کے لئے صلہ اور معاوضہ کی تمنا کیسی؟ اس کا بدلہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تمکن فی الارض کو مستحکم سے مستحکم تر کرتا جاتا ہے۔ آیت (۱۸/۹۵) پر غور کیجئے قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ کی حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی۔

پھر یہ بھی کہ جب اس جماعت کے ہاتھوں کوئی مہم انجام پائے گی تو وہ اسے اپنے کسب و ہنر پر محمول نہیں کرے گی بلکہ اسے اللہ کا فضل اور رحمت قرار دے گی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ فتح و کامرانی ان کے دماغوں میں تکبر و غرور کے طاغوتی خناس کے بجائے عجز و نیاز کے ملکوتی جوہر پیدا کرے گی۔

سائرس اور مذہبِ زرتشت

اگر ذوالقرنین سے مراد سائرس ہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے زمانے میں زرتشتی مذہب کی تعلیم کس قدر بلند اور پاکیزہ تھی۔ عصرِ حاضرہ کی تحقیق کے مطابق جناب زرتشت کا عہد سائرس کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس زمانہ میں یہ مذہب اپنے حقیقی خط و خال میں تھا۔ دارا (یعنی سائرس کے دوسرے جانشین) کے فرامین جو اس کے کتبات میں کندہ ملے ہیں، اس زمانہ کی زرتشتی تعلیم کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی رُو سے یہ مذہب عبودیتِ خداوندی اور نیک عملی کی صراطِ مستقیم کا داعی تھا لیکن آہستہ آہستہ، دیگر مذاہب کی طرح، اس مذہب پر بھی خارجی اثرات نے اپنا تسلط جما لیا اور رفتہ رفتہ سائرس اور دارا کے زمانہ کا مذہب، ایک اور مذہب کی صورت اختیار کر گیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ سکندرِ اعظم کے حملہ نے نہ صرف ایرانی سلطنت کو ہی تباہ و برباد کیا بلکہ زردشت کا مقدس صحیفہ (اوستا) بھی اصطخر کے حملہ کے وقت جل کر تباہ ہو گیا۔ اس کے ایک عرصہ بعد تک پیروانِ مذہبِ زردشت اِدھر اُدھر پریشانی میں پھرتے رہے تاآنکہ ساسانی عہدِ حکومت کے وقت، اردشیر نے اوستا کا نسخہ از سرِ نو مرتب کیا (جس طرح حملہ بخت نصر کے بعد یہودیوں نے تورات کو از سرِ نو مرتب کیا تھا)۔ اس جدید نسخہ کو اصل نسخہ سے جو نسبت ہو سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس کے بعد زردشتی مذہب درحقیقت، قدیم مجوسی مذہب ہی کی دوسری صورت بن کر رہ گیا۔ (تفصیل اس کی دوسرے مقام پر ملے گی)۔

یاجوج وماجوج

یاجوج وماجوج کون تھے؟ اس کے لئے سورۃ کہف کی مذکورہ صدر آیت کو پھر ایک مرتبہ سامنے لائیے۔

قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓی اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهُمْ سَدًّا ؁ (۱۸/۹۴)

اس قوم نے کہا "اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آکر لوٹ مار کرتے ہیں۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لئے کچھ خراج مقرر کردیں؟"

اور اس کے ساتھ سورۃ انبیاء کی ان آیات کو ملا کر پڑھئے جن میں یاجوج اور ماجوج کا ذکر دوسری مرتبہ آتا ہے۔

وَ حَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ؁ حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ؁ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ؁ (۲۱/۹۵-۹۷)

اور (دیکھو) جس آبادی کے لئے ہم نے ہلاکت ٹھہرادی، تو اس کے لئے (کامیابی وسعادت) ممکن نہیں۔ وہ کبھی (اپنی) سابقہ سربلندی کی طرف لوٹ نہیں سکتی۔

تاآنکہ وہ وقت آجائے گا کہ یاجوج اور ماجوج کی راہ کھل جائے گی۔ (زمین کی) تمام بلندیوں سے وہ دوڑتے ہوئے اُتر آئیں گے اور (خدا کے ٹھہرائے ہوئے) سچے وعدہ کی گھڑی قریب آجائے گی، تو اُس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ لوگوں کی آنکھیں (شدتِ دہشت وحیرت سے) کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، اُن لوگوں کی آنکھیں جنہوں نے (سچائی سے) انکار کیا تھا (وہ پکار اُٹھیں گے) افسوس ہم پر، ہم اس (ہولناک گھڑی سے غفلت میں رہے بلکہ ہم ظلم وشرارت میں سرشار تھے![1]

قرآنِ کریم میں یاجوج وماجوج کا ذکر انہی دو مقامات میں آیا ہے۔

گذشتہ اوراق میں جن اقوام وملل کی سرگذشت بیان ہوئی ہے، وہ تمام سامی النسل تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی

---

[1] اس آیت کی تشریح ذرا آگے چل کر آئے گی۔

کہ شروع شروع میں ایک قبیلہ صحرا الوردی اور دشت پیمائی کی زندگی بسر کرتا، پھر وہ آہستہ آہستہ اقامت گزینی اختیار کرلیتا اور کچھ عرصہ بعد تمدن و حضارت کی زندگی تک پہنچ جاتا۔ اس طرح مختلف آبادیوں کی طرح پڑتی اور حکومتوں کے نقشے مرتب ہوتے۔ لیکن اس کے برعکس، وسط ایشیا میں ایک اور نسل تھی جس کا اندازِ زندگی ان سے بالکل مختلف تھا۔ سطح مرتفع پامیر کے گرد و پیش کا علاقہ جسے اب منگولیا کہا جاتا ہے اس نسل کا اوّلین مسکن تھا۔ اس قوم نے کبھی تمدن و حضارت کی زندگی اختیار نہیں کی، ہمیشہ خانہ بدوش اور صحرا الوردی رہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب ان کی تعداد بڑھتی تو اپنے وطن کی بلندیوں سے ایک سیلاب بے پناہ کی طرح اُمنڈ کر کسی ایک سمت کا رُخ کرلیتے اور جس طرف یہ کف بدہاں طوفان پھرتا اُمنڈتا جا نکلتا، آبادیاں ویرانوں میں اور بستیاں قبرستانوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ قتل و غارتگری، سلب و نہب لوٹ مار ان کا شیوہ تھا۔ یہ وحشی قبائل اپنی طبیعت کی سختی اور مزاج کی درشتی کے لئے مشہور تھے۔ گرد و پیش کی اقوام و ممالک ان کی وحشت و درندگی سے ہمیشہ خائف رہتے اور ان کی یورش اور یلغار سے بچنے کے لئے مختلف تدابیر سوچتے رہتے۔ انہی کے حملوں کی روک تھام کے لئے اہلِ چین کو سینکڑوں میل لمبی دیوار بنانا پڑی۔ اسی طوفان کا رُخ بدلنے کے لئے سائرس نے سد تعمیر کی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ انہی قبائلیوں کی ایک شاخ تاتاریوں کے نام سے مشہور تھی۔ دوسری شاخ کا نام سحتین تھا۔ ایک اور شاخ یورپ میں میگر کے نام سے مشہور ہوئی۔ تاریخی انکشافات بتاتے ہیں کہ انہی منگولین قبائل کا ابتدائی نام موگ تھا۔ (اسی سے منگولین بنا) یونانیوں نے اسی موگ کو میگاگ کہا اور عبرانی میں یہی ماجوج بن گیا۔ انہی کا ایک قبیلہ یواچی کہلاتا ہے جس نے آخرالامر یاجوج کی صورت اختیار کرلی۔ یہ ہیں یاجوج و ماجوج GOG AND MAGOG ان کا ذکر سب سے پہلے تورات میں حزقیل نبی کی کتاب میں ملتا ہے جہاں لکھا ہے:-

> خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد! تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے، اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دوں گا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں ماروں گا اور تجھے اور سارے لشکر اور گھوڑوں اور سواروں کو جو سب کے سب فاخرہ پوشاکِ جنگی پہنے ایک بڑا انبوہ جو پھریں اور سپریں لئے ہوئے ہیں اور سب کے سب تلوار پکڑنے والے ہیں کھینچ نکالوں گا اور ان کے ساتھ فارس اور کوش اور فوط جو سب کے سب سپریں لئے ہوئے اور خود پہنے ہوئے ہیں۔ (حزقی ایل ۱ — ۳۸/۵)

حزقیل نبی بخت نصر کے حملہ میں قید ہو کر بابل پہنچے تھے۔ یہ پیش گوئی وہیں کی اسیری کے ایام میں کی گئی تھی اور اس کے

بعد آپ سائرس کے زمانہ تک زندہ تھے۔ اس لئے یہ واضح ہے کہ اس میں انہی وحشی قبائل کا ذکر ہے جو کاکیشیا کی راہ سے حملہ آور ہوا کرتے تھے اور جن کی روکتھام کے لئے سد تعمیر کی گئی تھی۔ اس پیش گوئی میں روش (روس) مسک (ماسکو) واضح ہیں۔ توبال، بحرِ اسود کے شمالی علاقہ کو کہتے ہیں (مسک اور توبال، شمالی کاکیشیا کے دو دریاؤں کا بھی نام ہے۔ غالباً یہ نام ان کے گرد و پیش کے قبائل کی وجہ سے رکھے گئے ہوں گے یا ان قبائل نے ان دریاؤں کی نسبت سے دنیا میں اپنا تعارف کرایا ہوگا) بہرحال، یہ ظاہر ہے کہ یہ وحشی قبائل انہی علاقوں سے متعلق تھے۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس کی شہادت ہے کہ یہی قبائل کاکیشیا (قفقاز) کے درّہ سے حملہ آور ہوتے تھے۔ سائرس نے اس درّہ کو بند کرا دیا۔ زمانہ حال کے انکشافات سے ظاہر ہے کہ سائرس نے دراصل دو دیواریں بنوائی تھیں۔ ایک بحرِ خزر سے مغرب کی طرف، قریب تیس میل لمبی جہاں وہ کوہِ کاکیشیا کے مشرقی کنارے تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں قدیم زمانہ سے ایک شہر دربند آباد ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو وہ درّہ آتا ہے جو 'Darial Pass' کے نام سے مشہور ہے۔ اس درّہ میں بھی ایک آہنی دیوار موجود ہے۔ یہی وہ دیوار ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے۔

اب سورۂ انبیاء کی اس آیت کو لیجئے جس میں یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے۔ فرمایا۔

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ○ (۲۱/۹۶)

جب وہ وقت آجائیگا کہ یاجوج اور ماجوج کی راہ کھل جائے گی (زمین کی) تمام بلندیوں سے دوڑتے ہوئے اُتر آئیں گے۔

آخری یورش

ایک مفہوم کے اعتبار سے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ کسی آنے والے حادثہ کی پیش گوئی ہے، وہ حادثہ جو اپنی وحشت اور خوف سامانی کے اعتبار سے لرزہ انگیز ہوگا کہ ساری دنیا دہشت سے تھرتھرا اُٹھے گی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، وحشی منگولیوں کے یہ سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھتے رہتے تھے۔ ظہورِ اسلام سے قبل ان کی یورش چوتھی صدی عیسوی میں باعثِ تخریب و فساد بن چکی تھی جب وہ یورپ کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ اس کے بعد یہ طوفان رُک گیا اور تیرھویں صدی عیسوی تک رُکا رہا۔ اس دوران میں ان کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی اور نظر آتا تھا کہ اس مرتبہ اس طوفان نے جس سمت کا رُخ کیا قیامت برپا کر دے گا۔ (قریب ۱۲۰۰ء تا ۱۶۰۰ء) میں چنگیز خانی دبدبہ اور غلغلہ کا شہرہ بلند ہونا شروع ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی خاں اس کا جانشین ہوا۔ اوکتائی کے بعد منکو، منکو کے بعد قبلائی خاں اور قبلائی خاں کا بھائی ہلاکوں خاں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہ صدیوں کا رُکا ہوا سیلاب اُمنڈ کر آگے بڑھا (حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ

وَمَاجُوْجُ) اور اپنی سطحِ مرتفع سے اُچھلتا ہوا بغداد تک آپہنچا (مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (۲۱/۹۶)) اور اسلامی شوکت وسطوت کو اس طرح اپنے ساتھ بہا کر لے گیا کہ اس کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں۔ یہ وہ قیامتِ صغریٰ تھی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھی تھی۔ لیکن یہ بھی اللہ کے اس قانونِ مکافاتِ عمل کے ماتحت ظہور پذیر ہوئی تھی جس میں کسی سے رعایت نہیں برتی جاتی۔ یوں تو مسلمانوں کی مرکزیت ایک عرصہ سے کمزور ہوتی چلی آرہی تھی لیکن فتنۂ تاتار کے بعد ان کا شیرازہ کچھ اس طرح بکھرا کہ آج تک پھر مجتمع نہ ہو سکا اور وہ قوم جسے اقوام و مللِ سابقہ کے احوال و کوائف سے قدم قدم پر آگاہ کر دیا گیا تھا کہ یاد رکھو کہ قوانینِ الٰہیہ کے خلاف انسانی قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ ہلاکت و تباہی کا شعلہ انگیز جہنم ہے، ان شعلوں کی لپٹ سے نہ بچ سکی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

لیکن ان امور کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہاں فقط اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ہلاکو خاں کو خود بغداد کے مسلمانوں ہی کی ایک جماعت نے حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ وَفِيْهَا اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔

لیکن اگر سورۂ انبیاء کی دونوں آیتوں کو سامنے رکھا جائے تو ایک اور مفہوم بھی سامنے آتا ہے۔ اس کی پہلی آیت میں ہے وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○ (۲۱/۹۵)۔ یعنی جو قومیں خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق زوال پذیر ہو جاتی ہیں، ان کی نشاۃِ ثانیہ (دوبارہ زندگی) کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد ہے حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ ...... تاآنکہ یہ صورت نہ پیدا ہو جائے کہ...... اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نے یہاں کسی ایسے اصول کو بیان کیا ہے جس کے مطابق گری ہوئی قوموں کے دوبارہ اُبھرنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ یہاں اگر ہم یاجوج و ماجوج سے مراد کوئی خاص قبائل نہ لیں بلکہ ان الفاظ کے بنیادی معانی پر غور کریں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ ان کے بنیادی معنی ہیں شعلوں کی طرح اُبھر کر اِدھر اُدھر پھیل جانا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عصرِ حاضر کے مغربی اقوام کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ہے جس کی رُو سے وہ اپنے اپنے ملکوں سے نکل کر دنیا کی پست اقوام کے ہاں جا پہنچیں اور وہاں اپنی 'Colonies' بنا کر اپنا جذبۂ استعماریت اور سلطنت سازی (Imperialism) کی تسکین کا سامان فراہم کرنے لگیں۔ لیکن اس کا نتیجہ اُلٹا نکلا۔ اس تزاحم و تصادم سے خود ان پست اقوام کی رگوں میں منجمد خون میں پھر سے حرارت پیدا ہوگئی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ ان اقوامِ غالب کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس طرح ان تباہ شدہ اقوام کو دوبارہ زندگی مل گئی۔ آپ دیکھئے کہ گذشتہ پچاس سال میں اس طریق سے دنیا کی کس قدر پست اقوام اُبھر کر اوپر آگئی ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا، مشرقِ وسطےٰ کی اقوام اور اب افریقہ کے علاقے، سب کی نشاۃِ ثانیہ اسی طریق سے ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ انبیاء کی مذکورہ بالا آیات

میں پست اور محکوم اقوام کی باز آفرینی کے لئے اس طریق کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کے متعلق جو گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے وہ نفسِ واقعہ کے اعتبار سے تاریخی قیاسات پر مبنی ہے۔ اس باب میں مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس، جیوئش انسائیکلوپیڈیا اور یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ۔ نیز ترجمان القرآن (از ابوالکلام آزاد مرحوم) کو دیکھنا چاہیئے۔

بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ ابھی باقی ہے جو معارف القرآن کے اگلے حصہ میں ملے گا جس کا نام "شعلۂ مستور" ہے۔ اس میں، ان حضرات کے تذکارِ جلیلہ کے بعد تمام سابقہ انبیاء کرامؑ اور ان کی اقوام پر فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں مبسوط تبصرہ بھی کیا جائے گا، جو اپنی جگہ ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

پرویز

کتبہ عبدالجبار